قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

National Council for Promotion of Urdu Language قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
Ministry of Human Resource Development, Department of Higher Education, Government of India

دسمبر 2014، قیمت -/15₹

ماهنامه

# اردو دنیا

دهلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی وثقافتی فروغ

# عالمی اردو کانفرنس کے مختلف مناظر

ماہنامہ
# اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:16، شمارہ:12، دسمبر2014

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

**ناشر اور طابع**

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

**مطبع:**

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

**مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل**

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

**صدر دفتر**

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

**ویب سائٹ**

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

**شعبۂ فروخت**

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

# مشمولات

**اداریہ**
ہماری بات 4

**خطوط**
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

**انٹرویو**
ذکیہ مشہدی احمد صغیر 8

**کور اسٹوری**
اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی وثقافتی فروغ
زبانیں ملک میں اتحاد وسلامتی
قائم رکھ سکتی ہیں :اسمرتی ایرانی 12
عالمی اردو کانفرنس: اغراض ومقاصد خواجہ محمد اکرام الدین 13
عالمی اردو کانفرنس کی روداد عبدالحی 14
کلیدی خطبہ شمیم حنفی 23

**زبان و تعلیم**
قومی اردو کونسل اور 'بچوں کی دنیا' صغیر افراہیم 25

اردو شاعری میں روزمرہ کرشن بھاوک 27

**ادبی مباحث**
غلام عباس کی اولین طبع زاد تخلیق معین الدین عقیل 31
غیر مسلم شعرا کی حمدیہ شاعری سعدیہ حسن بلوچ 33
اردو تنقید کی ایک نئی رہگزر: حسن عسکری صفدر 37
قائم چاندپوری کا عہد اوران کی شاعر ذاکر فیضی 40

**شخصیات**
آر کے نارائن: عظیم ہندوستانی فکشن نگار ایم رحمت اللہ 43
المعتمد ابن عباد: سیول کا شاعر بادشاہ روز ایم اصبر 46

**خراج عقیدت**
عزیز اندوری مناظر عاشق ہرگانوی 49

**ہماری مطبوعات**
احوال میر تقی میر نثار احمد فاروقی 51

**دوسری زبانوں میں**
عربوں کی کلاسیکی شاعری عبداللہ امتیاز احمد 55

**ہم نے جنھیں بھلا دیا**
ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی صابر علی سیوانی 58

**صحافت**
اکولہ کے قدیم اخبارات ورسائل سید طلحہ نقشبندی القادری 64

**سائنس اور ادب**
اردو غزل اور سائنسی حقائق ای آر محمد عادل 66

**کتابوں کی دنیا**
تبصرہ وتعارف 69

**عالمی اردو نامہ**
اردو نامہ ادارہ 78

**خبرنامہ**
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 80

# ہماری بات

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا ہے، اردو نہ صرف برصغیر میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک بڑی لسانی قوت اور ترسیلی وسیلے کے طور پر ابھر کر سامنے آرہی ہے۔ برصغیر، بلکہ پورے جنوبی ایشیا میں اردو کو یہ رتبہ پہلے ہی سے حاصل ہے کہ اس خطے کے زیادہ تر لوگ ایک دوسرے سے جس ملی جلی ہندوستانی زبان میں گفتگو کرتے ہیں وہ دراصل اردو ہے۔ لیکن حالیہ برسوں میں جس طرح افغانستان میں مقامی بولیوں کے بعد سب سے زیادہ اردو کا ہی عام بول چال میں استعمال ہونے لگا ہے، وسطی ایشیائی ملکوں میں جس طرح اردو کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے، عرب ممالک اور خلیجی خطے کے ملکوں میں جس تیزی سے، برصغیر کے تارکین وطن کی بدولت حلقۂ اردو وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، انگلینڈ میں اردو پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد میں اضافے کے جو حوصلہ افزا اعداد و شمار سامنے آئے ہیں، اسکینڈے نیویائی ملکوں اور کناڈا، امریکہ، جاپان، چین اور آسٹریلیا میں مقیم جنوب ایشیائی خطے کے باشندے جس شوق و ذوق سے اردو کی محفلیں سجا رہے ہیں اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے اردو کے چراغ جلانے کی کوشش میں لگے ہیں، ان سب کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اردو اب کسی ایک خطے کی زبان نہیں رہ گئی ہے۔ گزشتہ ماہ قومی اردو کونسل نے جو عالمی اردو کانفرنس منعقد کی اُس کے ایک درجن ملکوں سے آئے شرکا کی فراہم کردہ اطلاعات نے بھی اس تاثر کو تقویت پہنچائی ہے کہ اردو کی دھوم خطۂ ہندوستان تک محدود نہیں رہ گئی ہے۔ اس کا جادو سارے جہاں کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

یہ بات بھی کسی حد تک ٹھیک ہے کہ اردو کی عالمی کانفرنسوں کے شرکا اردو کی عالمی صحت کے بارے میں ایک امید افزا اور حوصلہ بخش ماحول تیار کرنے کی کوشش کے تحت باتوں کو ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کیا کرتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ان باتوں کی کوئی بنیاد ہی نہ ہو۔ اس لیے کسی اور کو ہو نہ ہو، قومی اردو کونسل کو اس کا پورا یقین ہے کہ کاروان اردو تیزی سے نہ سہی، دھیمی رفتار سے سہی، آگے ضرور بڑھ رہا ہے۔ کانفرنس کے غیر ملکی مندوبین نے اپنے اپنے علاقوں میں اردو کی طاقت بڑھنے کی جو رپورٹیں پیش کی ہیں وہ اگر آدھی بھی سچ مانی جائیں تب بھی اردو فائدے میں ہے۔ دنیا کے گلوبلائزیشن، ابلاغی ذریعوں کے حیران کن فروغ اور اقتصادی ترقی کے لیے ایک دوسرے پر بڑھتے ہوئے انحصار نے اردو کے لیے بھی ترقی کے بہت سے دروازے کھولے ہیں جنھیں پہچاننے، سمجھنے اور استعمال میں لانے کی اشد ضرورت ہے۔

عالمی اردو کانفرنس کے تعلق سے ایک خاص بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزیر محترمہ اسمرتی ایرانی نے نہ صرف اس کے خصوصی اجلاس سے خطاب فرمایا بلکہ قومی اردو کونسل کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے یہ تاکید بھی کی کہ وہ 21 فروری 2015 کو منائے جانے والے 'یوم مادری زبان' کی تقریبات میں حصہ لے اور حکومت کو مشورہ دے کہ اسے اردو کے فروغ کے لیے اور کیا کرنا چاہیے۔

ایک اور خیال جو اس کانفرنس کے دوران ذہن میں آیا وہ بھی قارئین کے ساتھ بانٹنا چاہوں گا۔ خیال یہ ہے کہ جس طرح اردو کی عالمی کانفرنسیں ہوتی ہیں اسی طرح کیوں نہ سارک (ساؤتھ ایشین ریجنل کوآپریشن) کی سطح پر بھی ایک اردو کانفرنس کا انعقاد کیا جائے تاکہ سارک ملکوں ہندوستان، پاکستان، افغانستان، نیپال، بنگلہ دیش، بھوٹان، مالدیپ اور سری لنکا میں اردو کے تعلق سے ہونے والے کاموں کی نہ صرف جانکاری بڑھے بلکہ ان میں ربط بھی قائم ہو اور اردو کے سارک ادیبوں کا ایک نیا کارواں وجود میں آسکے۔ ہندوستان کی جانب سے قومی اردو کونسل اس سلسلے میں اہم کردار نبھا سکتی ہے۔ آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے اور تجاویز ہیں اس سے کونسل کو مطلع فرمائیے۔

اس وقت اردو کی دنیا اپنے اولین ادبی نقاد خواجہ الطاف حسین حالی کی سو ویں برسی منا رہی ہے۔ ارادہ تھا کہ 'اردو دنیا' کے زیر نظر شمارے میں 'حالی صدی' پر کور اسٹوری شائع کی جائے۔ لیکن عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد کی مصروفیت اور اس کی کور اسٹوری شامل اشاعت ہونے کی بنا پر حالی کی عظیم شخصیت کو سمیٹنے کے لائق صفحات کی گنجائش نہ نکلنے کے سبب سے یہ ارادہ آئندہ شمارے پر ملتوی کر دیا گیا ہے جو نئے سال 'اردو دنیا' کا پہلا شمارہ ہوگا۔ نئے سال کی پیشگی مبارک باد!

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

# آپ کی بات


## عبیدالرحمن

42، اولڈ، برہمپترا ہوسٹل، جے این یو، نئی دہلی


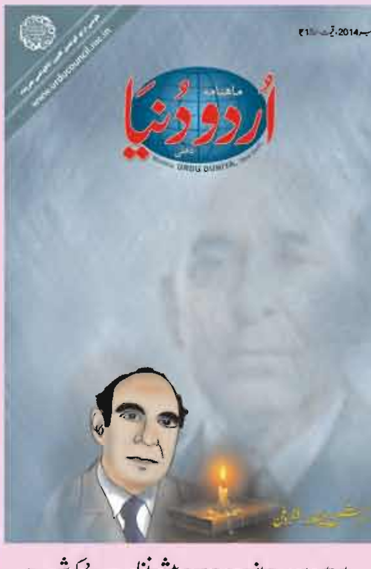


ماہنامہ اردو دنیا نومبر 2014 پیش نظر ہے۔ 'کرشن چندر: فکروفن' کے حوالے سے اس شمارے کی دستاویزی حیثیت ہوگئی ہے۔ کرشن چندر کے فکروفن کے تعلق سے جو بھی تحریریں شامل اشاعت ہیں، قابل توجہ ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی اور محی الدین زور کشمیری نے کرشن چندر کا مقام پیدائش الگ الگ تحریر کیا ہے۔ اوّل الذکر نے کشمیر اور آخرالذکر نے بھرت پور راجستھان، جبکہ صغیر اشرف نے جموں کشمیر کے پونچھ ضلع کو مقام پیدائش مانا ہے۔ میرے علم کے مطابق کرشن چندر کا مقام پیدائش بھرت پور راجستھان ہے، اگرچہ ان کا عہد طفولیت کشمیر کی سرسبز و شاداب وادیوں میں گزرا ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی نے 'کرشن چندر عورت اور تانیثیت' کو خاطر نشان رکھ کر فکرانگیز مضمون لکھا ہے۔ کرشن چندر کی تخلیق کے حوالے سے، کرشن چندر کی خاتون شناسی اور عورت کے تئیں ان کے زاویہ فکر کو اجاگر کیا ہے۔ موصوفہ نے کرشن چندر کے تانیثی افکار کو نئے زاویے سے دیکھنے کی سعی کی ہے، جو قابل ستائش ہے۔ شمارے میں شامل تمام مضامین معلوماتی ہیں۔


## ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، ریٹائرڈ استاد سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ


'اردو دنیا' کا اکتوبر 2014 کا شمارہ اپنی امتیازی خصوصیتوں یعنی حسن طباعت و طباعت کے ساتھ مفید بڑے ہی گراں قدر محققانہ اور حد درجہ معلوماتی مضامین کے ساتھ موصول ہوا۔ علی الخصوص نابغہ عصر یگانہ دہر علامہ شبلی پر مندرجہ ذیل مضامین: مولانا شبلی کے سیاسی تدبر کی بازیافت، مولانا شبلی کی سوانح نگاری، شبلی کی اردو شاعری اور ملی دردمندی، سفرنامہ شبلی کی تاریخی و تہذیبی اہمیت اور دارالمصنّفین کا ماضی وحال۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ صدیقی کا مضمون دارالمصنّفین کی گولڈن جوبلی اور ایک یادگار مشاعرہ، مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری، پروفیسر نذیر احمد کی ادبی خدمات اور شخصیات کے تحت مجاہد آزادی خان عبدالغفار خان انبالوی اور مذہبی جستجو (مہاتما گاندھی) بہت زیادہ پسند آئے۔ ان مضامین کی اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر اطہر فاروقی سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے خواجہ اکرام الدین سے اپنے انداز میں یہ فرمایا کہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا حصہ بن کر رہ گئی اور بالعموم اردو شعبے کا سربراہ انجمن کا ہی سربراہ بن جاتا تھا حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سوائے پروفیسر آل احمد سرور کے اردو کا کوئی بھی سربراہ انجمن کا سکریٹری نہیں ہوا۔ اردو کے جلیل القدر ادیب خاص عبدالغفار انجمن کے علی گڑھ منتقل ہونے پر اس کے سکریٹری سے اس کا اس انٹرویو میں کوئی ذکر نہیں۔ ایک سوال یہ ہے کہ انجمن دہلی میں اردو میڈیم اسکول کیوں نہیں کھولتی۔


## ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، مورتاڑ، ضلع نظام آباد


اکتوبر 2014 کا اردو دنیا باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے میں بھی جدت وندرت یہ ملتی ہے کہ اردو کے ایسے ادیب نقاد و شاعر جو گوشہ گمنامی میں تھے ان کی تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی خدمات قارئین پر آشکار ہوجائیں۔ یوں تو سرسید کے رفقائے کار میں سب کو شہرت ومقبولیت ملی لیکن شبلی نعمانی کے کارنامے مقبول نہیں ہوئے تھے۔ ایم اے کے طلبا کو شعرالعجم، موازنہ انیس ودبیر تک ہی معلومات دی جاتی ہیں لیکن ان کے دیگر کارنامے ناقابل فراموش ہیں ان کے اسفار اور ملک کا تعلیمی نظام، تہذیب، ثقافت، جغرافیہ، تمدن ان پر ان کی گہری نظر ہے۔ دوسری اہم بات شبلی نعمانی اور دارالمصنّفین کے اس شمارے سے یہ ظاہر ہوئی کہ شبلی نعمانی نے سفر کی صعوبتیں سہتے ہوئے اپنے علمی، تحقیقی سفر کو جاری رکھا اور مستند ماخذات کی تلاش، معتبر حوالوں کی تلاش وغیرہ جتنی محنت علم وادب کی تحقیق کے لیے شبلی نے کی ہے شاید ہی سرسید کے رفقا میں سے کسی نے کی ہے۔ اردو دنیا کا یہ شمارہ شبلی شناسی کے لیے اہم دستاویز ہے۔ دیگر مشمولات بھی فکرانگیز اور بصیرت افروز ہیں۔ اردو دنیا زبان وادب کے لیے بحرالعلوم کی حیثیت رکھتا ہے اس میں مواد روایتی نہیں بلکہ جدت وندرت پر مبنی ہوتا ہے ہر مضمون عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔


## ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی

'فرحت منزل' کالی پلٹن، نزد دیوان جی کا کنواں، ٹونک (راجستھان)


ماہنامہ 'اردو دنیا' شمارہ اکتوبر 2014 میں اردو زبان وتعلیم کے فروغ کے حوالے سے جناب اطہر فاروقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) کا انٹرویو از خواجہ محمد اکرام الدین لائحہ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قابل مبارکباد ہیں خواجہ صاحب کہ جنھوں نے اردو زبان کی تدریس کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے انٹرویو کے لیے ایک ایسے فعال شخص کو منتخب کیا جو برسوں سے اردو زبان و تعلیم کے لیے کوشاں ہے۔ اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے صوبائی اردو اکادمیاں بھی اپنا کردار ادا کریں۔ وہ بھی اپنے دائرے میں رہتے ہوئے تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیں۔ محمد ظفرالدین نے اردو میڈیم سے تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم کے مواقع سے روشناس کرایا ہے۔ روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے مراکز کا ذکر کیا ہے جو معلوماتی

ہے۔ اگر ان مراکز کے مکمل پتے اور فون نمبر بھی دے دیے جاتے تو زیادہ مفید رہتا۔

**محمد متین**

مدرسہ ریاض المدارس سرونج، ایم پی

ماہنامہ 'اردو دنیا' اکتوبر 2014 کا شمارہ حسب معمول تحقیقی وتنقیدی مضامین سے مزین موصول ہوا، علامہ شبلی نعمانی اور دارالمصنفین کے تعلق سے بڑی اچھی، معلوماتی اور شگفتہ تحریریں پڑھنے کو ملیں لیکن اس گوشے کو علامہ شبلی نعمانی کی علمی وادبی خدمات کے پیش نظر مکمل نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ علامہ شبلی جیسی عبقری شخصیت پر چند مضامین شائع کر کے ان کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ آپ نے خود اپنے اداریے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ 'شبلی کی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے ایک دفتر درکار ہے' لیکن اس کے باوجود آپ کی یہ کوشش لائق صد تحسین ہے، کیونکہ 'شبلی صدی' کے تعلق سے اس مختصر سے گوشہ میں بھی آپ نے ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے لیکن ادبی لحاظ سے ان کی کتاب شعر العجم اور موازنہ انیس ودبیر پر الگ سے مضامین ہوتے تو اور بھی بہتر ہوتا۔

شمس بدایونی صاحب نے 'مولانا شبلی کے سیاسی تدبر کی بازیافت' کے عنوان سے بہت اچھا اور معلوماتی مضمون دلکش اسلوب میں لکھا ہے۔ ویسے تو شمس بدایونی صاحب ایک معتبر محقق ہیں، مجھ جیسے ادب کے طالب علم کی کیا بساط کہ ان کی تحقیق کے تعلق سے کچھ کہنے کی جسارت کرے لیکن بہرحال اس مضمون میں انھوں نے لکھا ہے کہ: ''مولانا شبلی بھی سرسید کی طرح یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو جو مراعات حکومت وقت سے حاصل ہیں، وہ متاثر ومجروح ہوں۔ اس میں علی گڑھ کالج اور ندوۃ العلما کی مالی امداد واعانت بھی شامل تھی۔'' مجھے نہیں معلوم کہ ندوۃ العلما کے ذمے داران نے کبھی بھی انگریز حکومت سے مالی تعاون لیا ہو اور اگر مالی تعاون لیا ہے تو یہ میری معلومات میں اضافہ ہے، جس کے لیے میں ڈاکٹر شمس بدایونی صاحب کا شکر گزار ہوں۔ لیکن اگر وہ اپنی اس تحقیق کا حوالہ بھی دینے کی زحمت فرمالیتے کہ ندوۃ العلما کی انگریز حکومت نے مالی امداد کب کی تھی اور کتنی مدت تک کی تھی؟ تو مزید ان کا احسان ہوتا۔

کوراسٹوری کے تعلق سے جوہر جاوید گیاوی، سعود الحسن ندوی، شاہ نواز فیاض، خالد ندیم، کلیم صفات الٰہی، محمد عبدالحفیظ صدیقی کی تحریریں بھی قابل ستائش ہیں۔

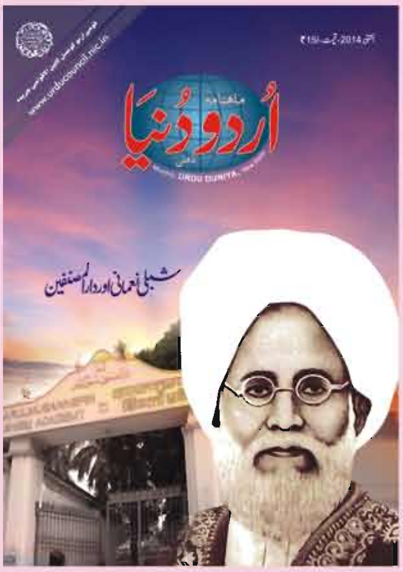


**ھلال احمد ھدایت اللہ**

کونکٹی، ڈومریا گنج، سدھارتھ نگر

ماہنامہ 'اردو دنیا' اکتوبر بڑے آب وتاب کے ساتھ موصول ہوا، اداریے کو پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا کیونکہ کسی بھی میگزین کی اصل روح یہی ہے۔ اس کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر اور ماہنامہ 'اردو دنیا' کے ایڈیٹر جناب خواجہ محمد اکرام الدین کا انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب اطہر فاروقی سے لیا گیا انٹرویو کافی اچھا لگا۔ اردو کے سلسلے میں انھوں نے جو باتیں بیان کی ہیں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ موصوف کا اردو کے سلسلے میں دیا گیا مشورہ کافی اہم ہے جس کے لیے اردو داں طبقہ کو غور وفکر کرنا چاہیے۔ اردو دنیا کے دیگر مشمولات بھی کافی اچھے لگے۔

**ایم راگھوراؤ**

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا (مدھیہ پردیش)

ستمبر 2014 کا شمارہ ملا۔ ادب کی بنیاد اخلاقی قدروں پر ہونی چاہیے۔ ایمان داری، فرائض کی ادائیگی، سماجی برائیوں اور استحصال کے خلاف ادیبوں کو لکھنا چاہیے۔ اخبار میں خطوط لکھنے کے مقاصد صرف یہ ہیں کہ حقائق سامنے آئیں اور خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ٹیگور اور اقبال ایک ہی عہد کے دو بڑے شاعر ہیں جن کے اثرات عالمی سطح پر پوری دنیا میں نمایاں ہیں۔ ان کا مقصد علوم وفنون کو فروغ دینا تھا۔ جس کے ذریعے انسان کی فلاح ممکن ہوسکے۔ اردو افسانے کے اوّلین نقوش انیسویں صدی کے اواخر میں ملتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں راشد الخیری، سجاد حیدر اور پریم چند جیسے افسانہ نگاروں کے یہاں فن کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔

**متین اچل پوری**

بیابانی، اچلپور ضلع امراؤتی (مہاراشٹر)

قومی اُردو کونسل کے تحت آپ نے بچوں کے لیے جو رسالہ جاری کیا تو نکاسی کے اعتبار سے دہلی میں اُس رسالے کے بلند وبالا ڈھیر کی صورت میں قطب مینار سے متصل گویا ایک ایسا ادبی مینار کھڑا کردیا ہے جس کی روشنی سے ہندوستان بھر کے بچے فیضیاب ہورہے ہیں۔ سہ ماہی مجلّہ فکر وتحقیق علم وآگہی کی وسعتوں میں اضافے کے اسباب پیدا کرتا ہے۔ ساتھ ہی گذشتہ ایک سال میں آپ نے اُردو دنیا کے متعدد گرانقدر گوشے شائع کیے ہیں۔ ستمبر 2014 کے ٹیگور اور اقبال کے خصوصی گوشے نے تو من موہ لیا ہے۔ 'ہماری بات' کے تحت آپ نے مغرب کے دائمی مرض کے لیے نسخے کی نشاندہی بڑے معنی خیز اور دل آویز انداز میں کی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس قسم کی فلاسفی رہی ہے اُسی انداز کی حکمرانی بھی رہی ہے اور حکمرانی کے براہ راست مثبت اور منفی اثرات عام انسانی زندگی پر پڑے ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں کی تخریب کاری کے عالمی ملبے سے آج کوئی ٹیگور کوئی اقبال اٹھ کھڑا ہو تو انسانیت تخریب کاری، دھواں، خاک وخون، تنہائی اور اداسی کی بھول بھلیوں سے نکل کر پھر زندگی کی روشن شاہ راہ پر لوٹ کر آسکتی ہے۔ اس کے لیے موجودہ تباہ حال زندگی کو اپنے لیے سودمند فلسفے کی تلاش کرنی ہوگی۔ تاریخ گواہ ہے کہ دو طرح کی فلاسفی سے عالم انسانیت دوچار ہوئی ہے۔

اولاً علم نافع: Benificial knowledge اور خیر الناس من ینفع الناس۔ بہتر انسان وہ ہے جو انسانوں کو (بلاتفریق) نفع پہنچانے والا ہو۔ ثانیاً وہ فلاسفی جو، جس کی لاٹھی اس کی بھینس سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ یہ اقتدار کے غلبے کی، طاقت کے بول بالے کی فلاسفی ہے۔ جرمنی میں ہٹلر کی حکمرانی کو اسی فلاسفی نے غذا فراہم کی ماضی قریب میں اس فلاسفی کے زیر اثر مغرب کی حکمرانی نے ویت نام پر اپنا شکنجہ کسا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر اُسی نے قیامت ڈھائی اور اُسی کے جبر واستبداد نے ماضی قریب میں عراق کی ایک ایک گلی اور ایک ایک شاہ راہ کو صف ماتم میں بدل کر رکھ دیا۔ آج عالم انسانیت کو کسی امن کے پیامبر کی ضرورت ہے۔ آج بے چین انسانیت سسک سسک کر دُعا مانگ رہی ہے کہ کوئی ٹیگور اُٹھے کوئی اقبال آئے۔

فاشزم میں حکمرانی کی عمارت ریت کے ڈھیروں پر کھڑی کی جاتی ہے اور انسانیت نواز حکمرانی کی عمارت خیر الناس ینفع الناس کے انتہائی مضبوط اور بھروسے مند ستونوں کی بنیادوں پر... یہی وجہ ہے کہ دو عالم گیر جنگوں کی ناقابل برداشت تباہی کو دیکھ کر وطن عزیز کی آزادی سے قبل ہندوستان کے سماجی مفکر، سیاسی مدبر انسانیت کے علمبردار بہو بھاشی مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ آج دنیا کو اپنے مسائل حل کرنے کے لیے عمر فاروقؓ جیسے حکمراں کی ضرورت ہے۔ اقبال کی فکر نے اور اس کے فلسفے نے اُسی زندہ جاوید فلاسفی سے غذا پائی ہے۔ ٹیگور کی روح بھی اُسی دائمی امن اور ابدی سکون کی متلاشی ہے۔

برصغیر ہند کی ان دو عظیم شخصیتوں کے فکر و فلسفے کو عام کرنے اور ان کی فکر کے چراغوں سے عملی زندگی کے مختلف گہواروں کو روشن کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ صرف ان مہاپروشوں کے لیے سچی شردھانجلی ہوگی بلکہ عالم انسانیت کی سچی خدمت بھی اسی میں مضمر ہے۔

## شکیل سہسرامی

یوایس بی ایل سی، پٹنہ

ستمبر 2014 زیر مطالعہ ہے۔ اردو دنیا کا شکریہ کہ اس نے ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب کی تبرکاتی زیارت ہم قارئین کو عطا کی۔ ٹیگور اور اقبال کے بارے میں مدیر نے جو اداریہ تحریر کیا ہے اسے دونوں کی شخصیت سے متعلق بھرپور تمہید کہا جاسکتا ہے۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی اردو دنیا نے جو مواد مشمولات یکجا کیے ہیں وہ بے حد تعریف کے قابل ہیں۔

## رضوان خاں

جنرل سکریٹری ’بزم اردو، سیتاپور‘ (یوپی)

’اردو دنیا‘ بابت ستمبر 2014 زیر مطالعہ ہے۔ شمارے میں علامہ اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور سے متعلق مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اقبال نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی اردو کے نمائندے ہیں۔ ان کے کلام کی آفاقیت انھیں عالمی شاعر بناتی ہے۔ اُن کے کلام میں مذہب، فلسفہ، حب الوطنی اور ادب عالیہ سب کچھ بدرجہ اتم موجود ہے۔ انھیں شاعر اسلام بھی کہا جاتا ہے ’’سارے جہاں سے اچھا۔‘‘ ان کی حب الوطنی کی زندہ مثال ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئیں ان کی نظمیں بہت ہی عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ اس ماہ کے ’اردو دنیا‘ کے تمام مستقل کالم بھی ماضی کی طرح ہی اہم اور معلوماتی ہیں۔ ضلع سیتاپور کی قدیم اور ممتاز ادبی تنظیم ’بزمِ اردو، سیتاپور‘ کے جملہ اراکین ہر ماہ بڑے ذوق وشوق سے ’اردو دنیا‘ کا مطالعہ کرتے ہیں اور بزم اردو کی مجالس میں اس رسالے کے مشمولات پر تبصرہ بھی کرتے ہیں۔

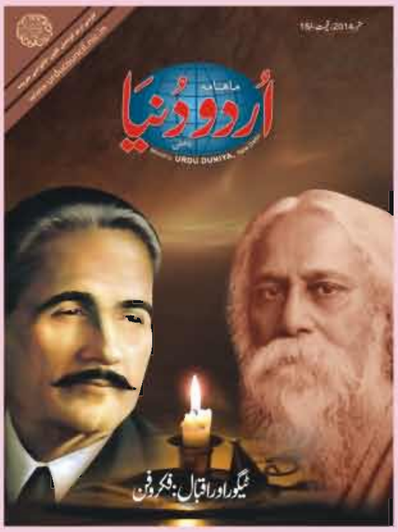


## عبدالواجد خاں

سابق انسپکٹر آف اردو اسکولس، راجیونگر، میسور

’اردو دنیا‘ ستمبر 2014 میں ٹیگور اور اقبال: فکری اور شخصی موازنہ از جناب محمد ارشاد علی صاحب حیدر آباد کا مضمون، بہت ہی لاجواب ہے، مثلاً یہ چند جملے ان قدر آور شخصیات کا بہت ہی بہترین موازنہ کرتے ہیں۔ ’’ٹیگور اور اقبال کی رومانی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت جو چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ذاتی زندگی میں اتنے غم برداشت کرنے کے باوجود دونوں عملی زندگی میں کتنے سرگرم نظر آتے ہیں، اور شاید یہی وہ خوبی ہے، جس میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔‘‘

## معین الدین شمسی

اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ، (جھارکھنڈ)

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ اگست 2014 کے شمارے میں ’اردو دنیا کی خبریں‘ کے تحت ’’دہلی میں اردو کی زبوں حالی پر اردو طبقے میں بے چینی‘‘ دیکھنے کے بعد محسوس ہوا کہ اردو کی صورتِ حال بے حد خراب ہوگئی ہے۔ تعجب ہے کہ بطور Language اردو اساتذہ کی تو بحالی ہو رہی ہے مگر Urdu Subject ٹیچر کی بحالی بیس سال سے نہیں کی گئی ہے۔ 1994-95 کے بعد اردو teacher کی بحالی ہندوستان کی اکثر ریاستوں میں نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال اردو والوں کو متحد ہو کر اردو کی آواز حکومت تک پہنچانی چاہیے۔ اگست 2014 کے سرورق پر بھارت کا نقشہ مع تصویر مجاہد آزادی و دیگر لیڈران کافی خوبصورت ہے۔ نقشہ کے نیچے شری لنکا کی جگہ ’68واں جشن آزادی‘ نے سرورق کو از حد خوبصورت بنا دیا ہے۔ ’ہماری بات‘ اداریہ ٹھوس، جامع اور قابل قبول ہوتا ہے۔ ’آپ کی بات‘ ماضی قریب کے رسالوں کا خلاصہ ہوتا ہے۔

’کوراسٹوری‘ کے تحت انیس الحسن صدیقی سے لے کر ابرار احمد اجراوی تک سارے مضامین بہت خوب ہیں۔ درخشاں تاجور کا ’تحریک آزادی اور اردو‘ محمد نور الحق کا ’اردو زبان کی تاریخی اہمیت‘ پسند آیا۔ شمیم ارشاد اعظمی کی ’صحت‘ ماشاء اللہ منفعت بخش ہے۔ ’ہم نے جنھیں بھلا دیا‘ ذکی انور کا ’چاند نزدیک ہے‘ کوا کا کردار خوب ہے۔ شمارے میں A to Z مشمولات قابل تحسین اور معلومات سے پر ہیں۔

اردو دنیا ستمبر 2014 بھی موصول ہوگیا۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے بجا فرمایا ہے کہ ماضی کو سمجھے اور جانے بغیر حال اور مستقبل کو صحیح معنوں میں بہتر بنانا کسی طور سے ممکن نہیں ہے۔ اس شمارے میں صفحہ نمبر 12 سے 56 تک گوشہ ’ٹیگور اور اقبال‘ کا ہر مضمون بغور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ معصوم عزیز کاظمی کا ’پہلی جنگ آزادی‘ کے تحت ’20 ستمبر 1857‘ حالات واقعات و اثرات، راحت افزا کا ’سجاد ظہیر خطوط کے آئینے میں‘ تاریخ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت کارآمد اور از حد مفید ہے۔ ’خبرنامہ‘ اور ’عالمی اردو نامہ‘ کے تحت ملک کے مختلف اردو اخبارات میں اردو کے تعلق سے شائع ہونے والی خبروں کا ڈائجسٹ ہر ماہ شائع فرما کر پورے ملک کی سرگرمیوں سے روشناس کرانا خدمت اردو نہیں تو اور کیا ہے؟ نصرت ظہیر کا ’مشرق کے دو آفتاب‘ میں ہر زاویے سے اقبال اور ٹیگور کو سمجھنے، سمجھانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اردو کی روٹی کھانے والوں سے میری التجا ہے کہ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے اردو رسائل خرید کر پڑھنا اخلاقی فرض سمجھیں۔

## ڈاکٹر عبیداللہ چودھری

گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور

’اردو دنیا‘ اگست 2014 کے شمارے میں محمد بشیر مالیرکوٹلوی کا مضمون افسانے میں ’کردار نگاری کی اہمیت‘ بہت پسند آیا۔ دو بار پڑھا میں ایک ادنیٰ اردو فکشن کا نقاد ہوں۔ افسانے کے موضوع پر تحقیقی مقالہ رقم کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کیے بیس سال ہوگئے ہیں۔ تاہم اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اپنی کم علمی کا شدت سے احساس ہوا۔ ہندوستان میں اعلیٰ سے اعلیٰ باصلاحیت فنکار موجود ہیں۔ جو اپنے تخلیقی فن کی شمع سے اردو زبان و ادب کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ ■

احمد صغیر

# زبان کی آبیاری ہوگی تو ادب بھی پھولے پھلے گا

## ذکیہ مشہدی

**احمد صغیر:** اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیے؟

**ذکیہ مشہدی:** میرے دادیہالی اجداد کا تعلق مغربی یوپی کے قصبہ شیرکوٹ، ضلع بجنور سے ہے لیکن کئی کنبے اپنی اپنی وجوہات کی بنا پر لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ نانیہال کا تعلق امروہہ ضلع مراد آباد سے ہے۔ میری پیدائش میری نانیہال امروہہ میں ہوئی۔ زندگی کے ستر سال مکمل کر لیے ہیں۔ میرے والد لکھنؤ کے پروردہ اور مشہور و معروف تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے سند یافتہ حکیم تھے۔ کچھ دن لکھنؤ میں پریکٹس بھی کی لیکن پھر (شاید) اس خیال کے تحت کے چھوٹی جگہ پر پریکٹس زیادہ آسانی سے کامیاب ہوگی، لکھنؤ کے قریب ضلع سلطانپور اودھ میں بود و باش اختیار کر لی۔

میرے والد نہایت روشن خیال، کثیر المطالعہ، با اصول اور خوش مزاج انسان تھے۔ شکار کے دھنی، بہترین نشانے باز اور حیرت انگیز حد تک سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ ساتھ ہی تعلیم نسواں کے حامی۔ ویسے میرے دادیہال کے دوسرے کنبوں میں بھی تعلیم نسواں بہت پہلے رائج ہو چکی تھی۔ میری دو بہنیں اور ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ بہنوں کے بعد دو بھائی ہیں۔ سب مطالعہ کے شوقین۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنی اپنی زندگی میں بخوبی Settle ہیں۔ اُردو سے سب کو شغف ہے اور یہ والد کی دین ہے۔

**اص:** اپنے تعلیمی سفر کی تفصیل بیان کیجیے؟

**ذکیہ مشہدی:** میرے بچپن کا ابتدائی حصہ لکھنؤ میں گزرا لیکن پھر والد صاحب سلطانپور منتقل ہو گئے تھے۔ اس لیے وہاں کے اسکولوں میں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ سلطانپور چھوٹا شہر ہے لیکن وہاں بہت ہی اچھا گورنمنٹ گرلز انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ شاید اس وقت اقدار مختلف تھیں۔ میرے خیال میں آج سے بہت بہتر۔ بس کمی یہ تھی کہ اسکول میں اردو نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے کالج مذکور سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات فرسٹ ڈویزن سے پاس کیے۔ اس وقت ان امتحانات میں فرسٹ ڈویزن لانا نہایت دشوار سمجھا جاتا تھا۔ اردو والد نے سب بچوں کو خود گھر پر پڑھائی۔ اسکول کی تعلیم کے علاوہ میں نے پرائیوٹ طور پر جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب اور ادیب ماہر کے امتحانات پاس کیے۔ دونوں میں (قومی سطح پر) چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ یہ امتحان علی الترتیب نویں اور دسویں جماعت کی اسکولی تعلیم کے دوران پاس کیے گئے تھے۔ میں ان کا ذکر اس لیے خاص طور پر کر رہی ہوں کہ شاید اس سے کچھ لوگوں کو پرائیوٹ طور پر اُردو خود پڑھنے یا اپنے بچوں کو پڑھانے کی ترغیب حاصل ہو سکے۔ کوئی امتحان نہ بھی پاس کیا جائے لیکن صرف نصف گھنٹہ مادری زبان کو دے دیا جائے (ہفتہ میں پانچ دن کافی ہوں گے) تو اس کی بقا کی گارنٹی لی جا سکے گی۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد میں بی اے کرنے کے لیے لکھنؤ واپس آ گئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے نفسیات میں ایم اے کیا اور یونیورسٹی کے ہی اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے ڈیموگرافک ریسرچ سینٹر (Demographic Research Centre) میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنے لگی۔ ایک سال بعد مجھے لکھنؤ میں ہی لاریٹو کونونٹ کالج میں نفسیات کے لکچرر کے عہدے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہاں میں نے زندگی کے چھ بڑے مسرور و مطمئن سال گزارے۔ اسی دوران

میری شادی شفیع الزماں مشہدی سے ہوگئی جو بہار سول سروس کے رکن تھے اور اس وقت دہلی میں پوسٹیڈ تھے۔ کچھ عرصہ ملازمت اور دہلی لکھنؤ کے درمیان آمدورفت جاری رکھی لیکن پھر گاڑی یوں چلتی نہ دیکھ کر ملازمت چھوڑ دی۔ میری افسانہ نگاری میں ملازمت چھوڑ کر گھریلو زندگی کو ترجیح دینے کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر میں ملازمت کرتی رہتی تو اس سے ملنے والی طمانیت شاید افسانہ نگاری کی طرف اتنا مائل نہ کرتی۔ وقت بالکل نہ مل پاتا۔ اس لیے کہ عورت کچھ کر لے بنیادی طور پر ہاؤس وائف ہی رہتی ہے۔

**اص:** آپ اپنی ادبی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

**ذکیہ مشہدی:** میری ادبی زندگی بڑی بے ترتیب رہی ہے۔ باضابطہ لکھنا خاصی دیر سے شروع کیا۔ گرچہ لکھنے کے جراثیم سرشت میں موجود تھے۔ سلطانپور میں کالج میگزین کے لیے زندگی کا پہلا افسانہ لکھا۔ یہ ہندی میں تھا۔ یوپی میں سرکاری اسکولوں میں اُردو نہیں تھی۔ خیر تو میری ہندی ٹیچر مس کملا دھون نے مجھے غور سے دیکھا اور بولیں ''یہ کہانی اگر واقعی تم نے لکھی ہے تو بہت آگے جاؤ گی، لکھتی رہنا۔'' لیکن ہمت افزائی کے باوجود مجھے توفیق نہیں ہوئی کہ ان کی رائے پر عمل کر کے لکھنا جاری رکھوں۔ 1961 سے 1975 کے طویل درمیانی وقفے میں بس ایک دو افسانے اور ایک مزاحیہ ڈرامہ 'ماڈرن انارکلی' لکھا جو لاریٹو کے شعبۂ ہندی میں بڑی کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا لیکن 1975 کے آس پاس میں نے افسانہ نگاری شروع کی تو پھر لکھتی رہی۔ اس سے قبل نفسیات کی دو انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر چکی تھی۔ یہ ترجمے بیورو فار پروموشن آف اردو، دہلی کے لیے لکھے گئے تھے۔ 1975 سے 2014 تک ایک طویل عرصہ ہے۔ اس مدت کو دیکھا جائے تو زیادہ کچھ نہیں کر سکی ہوں۔ پانچ مجموعے آئے کہانیوں کے اور کوئی ایک درجن کتابیں ساہتیہ اکادمی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے لیے اردو/ انگریزی/ ہندی میں ترجمہ کر چکی ہوں۔ میں نے نوخواندہ بالغوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں۔ جن کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں بس تین چار اردو میں ہیں۔ باقی ہندی میں۔ انھیں تعلیم بالغاں کے رسورس سینٹر، پٹنہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی اور ڈائرکٹوریٹ آف اڈلٹ ایجوکیشن، دہلی کے لیے لکھا گیا ہے۔

**اص:** آپ کی زبان بے حد شستہ ہے۔ جس کی وجہ سے آپ مشہور ہوئیں۔ یہ زبان آپ نے کہاں سے سیکھی؟

**ذکیہ مشہدی:** اُردو میری مادری زبان ہے۔ مادری زبان سب سے پہلے گھر اور گرد و پیش کے ماحول سے سیکھی جاتی ہے (بشرطیکہ آپ اسی علاقے میں رہ رہے ہوں جو آپ کی مادری زبان کا علاقہ ہے) میرا تعلق لکھنؤ سے ہے اور جس وقت میں گرد و پیش کے اثرات قبول کر رہی تھی، لکھنؤ نہایت شستہ اردو بولا کرتا تھا۔ اردو اپنی بہترین صورت میں ہندوؤں کے یہاں بھی رائج تھی۔ زبان کا مذہب سے کوئی تعلق اس وقت تک لکھنؤ میں نہیں تھا۔ اہل سیاست کا جو جی چاہا کرتے رہے۔ میرے والد کے ایک کائستھ دوست پیارے لال شری واستو تھے۔ میں بہت چھوٹی تھی ایک دن کہنے لگے دیکھوں بیٹا تمھارے والد محترم نے تمھیں کتنی اُردو سکھائی ہے۔ ذرا سلیٹ پر 'تحت الثریٰ' لکھ کر دکھاؤ تو میں نے صحیح لکھا تو ایک روپیہ نکال کر انعام میں دیا۔ والد کے ایک اور دوست کنور شوراج بہادر، سلطانپور میں ایس ڈی ایم تھے۔ وہاں سے تبادلہ ہو جانے کے بعد اکثر والد کو خط لکھتے تھے۔ ان کے دو خط میرے پاس محفوظ ہیں۔ القاب میں لکھتے تھے۔ کرم فرمائے من قبلہ جناب حکیم صاحب، اس ماحول میں زبان خود بخود مزاج کا حصہ بنتی جاتی ہے۔ اب وہ اردو ہو یا کسی اور لسانی علاقے کی کوئی اور زبان۔

**اص:** خواتین اُردو افسانے کی طرف نہیں آرہی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

**ذکیہ مشہدی:** ارے بھائی اردو زبان و ادب کی طرف رجحان بالعموم کم ہوا ہے۔ اس لیے لکھنے والے بھی کم ہوئے ہیں۔ خواتین ہیں تو سہی۔ عذرا نقوی، غزال ضیغم، ترنم ریاض، نگار عظیم، نجمہ محمود، شائستہ فاخری۔ اب جو بالکل نئی نسل ہے وہ اردو سے بیگانہ ہے پھر بھی بالکل مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان میں تو خواتین بڑے جھنڈے گاڑ رہی ہیں۔

**اص:** بہار میں اُردو خواتین افسانہ نگاروں کا فقدان ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

**ذکیہ مشہدی:** بہار میں خواتین فکشن نگاروں کی شدید کمی کی طرف میرا دھیان بھی گیا ہے لیکن مجھے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں مل پایا۔ میں جو محسوس کرتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بہار میں خواتین کی تعلیم دیر سے آئی۔ اس کے علاوہ بہار شاید آج بھی خاصا قدامت پرست ہے۔ خواتین کا لکھنا کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ رشیدۃ النسا بیگم عرف رشیدن بی بی اور جمیلہ خدا بخش (جن کے آٹھ دیوان موجود ہیں) پھر ان کے بعد شکیلہ اختر کو شاید خوش قسمتی سے ایسے شوہر اور دوسرے اہل خانہ ملے جنہوں نے لکھنے پر اعتراض نہیں کیا۔ اب جو نئی نسل آئی، اس نے تعلیم تو ضرور حاصل کی لیکن پروفیشنل کورسیس کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ اس لیے ادب کی طرف توجہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں فکشن نگاروں کی تعداد میں نمایاں کمی (یا فقدان) یہاں کے مردوں کے رویے (Attitude) اور کچھ عمومی حالات کی وجہ سے ہے۔

**اص:** آپ ناول کی طرف کیوں راغب نہیں ہوئیں؟

**ذکیہ مشہدی:** میرے مزاج کی افتاد کچھ ایسی ہے کہ ناول کے لیے جس یکسوئی اور صبر کی ضرورت ہے وہ میرے پاس نہیں ہے پھر کچھ حالات ایسے رہے کہ لکھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکی۔ افسانہ جلدی مکمل ہو جاتا ہے۔ ناتمام رہ جاتا ہے تو دوبارہ اس کا سرا پکڑنے میں دقت نہیں ہوتی۔ کئی افسانے تو نامکمل رہ جانے کے مہینوں بعد اٹھائے اور مکمل کر لیے۔ ناول کے ساتھ ایسا کرنا مشکل ہے۔ حال ہی میں میرا ممکنہ ناولٹ 'پارسا بی بی کا بگھار' اسی کا شکار ہوا (یہ ایک طویل مختصر افسانہ کی صورت میں کراچی کے مقتدر جریدے 'آج' میں شائع ہوا ہے)۔ ادھر میں نے ایک ناول کو ہاتھ لگایا ہے۔ شاید پورا کر سکوں۔ فی الحال تو اُمید ہی اُمید ہے۔

## سوانحی کوائف

**نام:** ذکیہ سلطانہ مشہدی

**قلمی نام:** ذکیہ مشہدی

**سنہ پیدائش:** 1944 (امروہہ) یو۔ پی۔

**تعلیم:** ایم اے (نفسیات) لکھنؤ یونیورسٹی

**تصنیفات:**

(1) پرائے چہرے (افسانوی مجموعہ)

(2) تاریک راہوں کے مسافر (افسانوی مجموعہ)

(3) صدائے بازگشت (افسانوی مجموعہ)

(4) نقش ناتمام (افسانوی مجموعہ)

(5) یہ جہانِ رنگ و بو (افسانوی مجموعہ)

**تراجم:**

تقریباً ایک درجن علمی اور ادبی کتابوں کا ہندی و انگریزی سے اردو، اور اردو سے ہندی و انگریزی میں ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ بیورو فار پروموشن آف اردو دہلی / خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے لیے کیا۔

**تعلیم بالغاں:**

تقریباً دو درجن چھوٹی چھوٹی کتابیں کہانیوں کے پیرائے میں نوخوادنہ بالغوں کے لیے آسان ہندی و اردو میں۔

**انعامات و اعزازات:**

- صوبائی و مرکزی حکومتوں سے ایوارڈ۔
- بہار سرکار سے مجموعی ادبی خدمات کے لیے ایوارڈ۔

**اص:** آپ کو جو شہرت ملی ہے اس سے مطمئن ہیں؟

**ذکیہ مشہدی:** دولت کی طرح شہرت کی بھی ہوس ہوا کرتی ہے۔ اگر ہوس پیدا ہوگئی تو کبھی اطمینان نہیں ہوتا۔ میرے اندر یہ صفت نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ شہرت حاصل کرنے کے لیے میں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ ادبی محفلوں میں شاذ و نادر ہی جاتی ہوں۔ میں خاموشی سے گوشہ نشیں رہ کر جب فرصت کے لمحات میسر ہوتے ہیں کوئی افسانہ لکھ لیتی ہوں۔ قارئین سے کبھی کبھی پسندیدگی کی اطلاع مل جاتی ہے۔ میں اس میں خوش ہوں۔ ابھی ساہتیہ اکادمی دہلی کے لیے ایک بنگلہ ناول کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ (ترجمے کے لیے انگریزی ترجمے کو استعمال کیا تھا، مجھے بنگلہ نہیں آتی)۔ تقریباً آٹھ دس مہینے کام کیا۔ اس سے مجھے کچھ شہرت نہیں ملنے والی۔ جو ذہنی طمانیت ملی وہ میرا انعام ہے۔ میں اس میں خوش ہوں پھر اردو پڑھنے والے ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ کہاں کی شہرت اور کیسی شہرت۔

**اص:** کہا جا رہا ہے ابھی فکشن کا دور ہے۔ اس رائے سے آپ کہاں تک اتفاق کرتی ہیں؟

**ذکیہ مشہدی:** میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ فکشن، شاعری، سوانح، سفرنامے لگ بھگ سبھی اصناف شانہ بہ شانہ چلتی رہتی ہیں۔ ادھر کئی خودنوشت سوانح بھی نظر سے گزریں۔ مثلاً عابد سہیل، وارث کرمانی، رتن سنگھ۔ تینوں بہت دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ویسے عام قاری افسانے زیادہ پسند کرتا ہے۔ شاعری پڑھنے کی چیز کم اور سننے کی چیز زیادہ ہے۔ شاید آپ ایسا اس لیے کہہ رہے ہوں کہ ان پرانے شاعروں کے بعد جو چوٹی پر تشریف فرما تھے نئے لوگوں میں اتنا بڑا نام ابھر کر سامنے نہیں آیا تو یہ بتایئے کہ فکشن میں جو قدآور ہستیاں تھیں۔ ان کی جگہ کہاں پُر ہوتی نظر آرہی ہے؟ جو لوگ ہمارے سامنے ہیں انھیں میں سے کچھ بہت آگے جائیں گے اور یقیناً وہ مرتبہ حاصل کریں گے کہ ہم ان پر فخر کر سکیں۔ شاعری ہو یا افسانہ نگاری اور ہم اردو کی جب بھی بات کریں۔ ہمیں اپنے ہمسایہ ملک کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اس لیے کہ اردو پورے برصغیر کی زبان رہی ہے۔ دیوار کھڑی کر کے علاقہ تقسیم ہو جانے سے زبان و ادب کے فروغ کو ہم الگ نہیں کر سکتے۔

**اص:** کیا یہ سچ ہے کہ فکشن بہار میں ہی لکھا جا رہا ہے؟

**ذکیہ مشہدی:** اس وقت اردو بہار میں یو۔ پی۔ اور دہلی کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہے۔ یہاں اردو کے رسالوں کی کھپت بہت زیادہ ہے۔ گھروں میں بھی اردو کی کتابیں نظر آتی ہیں۔ اُردو میڈیم اسکول موجود ہیں۔ اس لیے لکھنے والے بھی تعداد میں زیادہ ہیں۔ ادبی رسائل میں کوئی رسالہ شاید ہی ہوگا جس میں بہار کے افسانہ نگار دکھائی نہ پڑیں لیکن یہ کہنا ذرا زیادتی ہوگی کہ فکشن صرف بہار میں لکھا جا رہا ہے۔ خواتین کے حوالے سے تو آپ نے فقدان کا استعمال کیا تو بہار سے باہر خواتین لکھ رہی ہیں اور اچھا لکھ رہی ہیں۔ انھیں آپ بالکل ہی نظر انداز کر دیں گے؟ کلکتہ کے صدیق عالم اور دہلی کے خالد جاوید کی بڑی پذیرائی ہو رہی ہے۔ سید محمد اشرف گرچہ ادھر خاموش ہیں لیکن پوری اُمید ہے کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد یقیناً ان کی بھرپور واپسی ہوگی۔

> ادبی رسائل میں کوئی رسالہ شاید ہی ہوگا جس میں بہار کے افسانہ نگار دکھائی نہ پڑیں لیکن یہ کہنا ذرا زیادتی ہوگی کہ فکشن صرف بہار میں لکھا جا رہا ہے۔ خواتین کے حوالے سے تو آپ نے فقدان کا استعمال کیا تو بہار سے باہر خواتین لکھ رہی ہیں اور اچھا لکھ رہی ہیں۔ انہیں آپ بالکل ہی نظر انداز کر دیں گے؟ کلکتہ کے صدیق عالم اور دہلی کے خالد جاوید کی بڑی پذیرائی ہو رہی ہے۔ سید محمد اشرف گرچہ ادھر خاموش ہیں لیکن پوری اُمید ہے کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد یقیناً ان کی بھرپور واپسی ہوگی۔

**اص:** کیا موجودہ اُردو تنقید سے آپ مطمئن ہیں؟

**ذکیہ مشہدی:** اُردو تنقید میں بڑے معتبر نام موجود ہیں گرچہ کچھ نہایت جید ہستیوں نے حال ہی میں ہمارا ساتھ چھوڑا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ ایک نئی نسل ابھر کر سامنے آرہی ہے جس سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ جیسے حقانی القاسمی، شافع قدوائی، ندیم احمد، مرزا شفیق حسین، بس ایک شکایت رہ جاتی ہے کہ بعض اوقات ہمارے بڑے نام بھی تعلقات اور دوستی کو تنقید میں راہ دیتے ہیں۔

بعض جینوین فنکار معروضی تنقید سے محروم رہ جاتے ہیں۔ انھیں وہ درجہ نہیں مل پاتا جس کے وہ مستحق ہیں۔ خواتین اکثر صنفی عصبیت کا شکار بنتی ہیں۔ چند سال پہلے خدا بخش اورینٹل لائبریری نے ایک سمینار میں مجھے شکیلہ اختر پر پیپر پڑھنے کا موقع دیا تھا۔ میں نے ان کی سبھی تصنیفات لائبریری سے نکلوالیں۔ شاید دو ناول تھے اور دو تین افسانوں کے مجموعے۔ میں نے سب کو بڑی توجہ سے پڑھا۔ ان میں تقریباً پندرہ تخلیقات ایسی تھیں جو اوسط درجے کے اعلیٰ افسانوں میں شمار ہو سکتی ہیں۔ خواہ شاہکار نہ قرار دی جائیں۔ (یہ میرا ذاتی خیال ہے) اگر ایک مکمل مجموعہ ان افسانوں کے انتخاب کا تیار کر لیا جائے تو اردو ادب میں اضافہ ہوگا۔ افسانوں کی بھیڑ بھاڑ میں ان کی عمدہ تخلیقات گم ہوگئی ہیں اور نقادوں کو قطعی فرصت نہیں کہ اس طرف توجہ دیں۔ اس سمینار میں جناب گوپی چند نارنگ موجود تھے، وہاب اشرفی تھے، اعجاز علی ارشد صاحب موجود تھے۔ میں نے ان سب سے بحیثیت قاری درخواست کی تھی کہ ان ہیروں کی دھول جھاڑیں۔ بہ حیثیت مجموعی اردو ادب میں اچھے ناقدان فن موجود ہیں اور مستقبل سے بھی مایوس نہیں ہوں۔

**اص:** اُردو افسانے کا مستقبل کیسا ہے؟

**ذکیہ مشہدی:** میرے خیال میں تو خوش آئند ہے۔ ابھی بہت اچھے لکھنے والے بہت کم نظر آرہے ہیں لیکن میرا یقین ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب اردو آبادی اپنے تشخص کی بقا کے لیے اپنی زبان، اپنے ادب کی طرف دوبارہ متوجہ ہوگی۔ زبان کی آبیاری ہوگی تو ادب بھی پھولے پھلے گا۔ مرکز ہو سکتا ہے تبدیل ہو جائیں۔ کرناٹک، مہاراشٹرا اور آندھرا کے کچھ علاقوں میں اردو سر اٹھاتی نظر آرہی ہے۔

**اص:** ادب میں تحریکوں اور رجحانات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور آپ خود کو کس تحریک یا رجحان سے منسلک کرتی ہیں؟

**ذکیہ مشہدی:** جس وقت ترقی پسند تحریک کا بول بالا

> شاعری پڑھنے کی چیز کم اور سننے کی چیز زیادہ ہے۔ شاید آپ ایسا اس لیے کہہ رہے ہوں کہ ان پرانے شاعروں کے بعد جو چوٹی پر تشریف فرما تھے نئے لوگوں میں اتنا بڑا نام ابھر کر سامنے نہیں آیا تو یہ بتائیے کہ فکشن میں جو قدآور ہستیاں تھیں۔ ان کی جگہ کہاں پُر ہوتی نظر آرہی ہے؟ جو لوگ ہمارے سامنے ہیں انہیں میں سے کچھ بہت آگے جائیں گے اور یقیناً وہ مرتبہ حاصل کریں گے کہ ہم ان پر فخر کر سکیں۔ شاعری ہو یا افسانہ نگاری اور ہم اردو کی جب بھی بات کریں۔ ہمیں اپنے ہمسایہ ملک کو نہیں بھولنا چاہیے۔

تھا اس وقت میں محض قاری تھی اور بے حد مسرور و مطمئن قاری کہ ہماری زبان میں اتنے بلند پایہ افسانہ نگار موجود ہیں۔ ایسے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔اب نام گنوانا تو تضیع اوقات ہے۔اس تحریک کے ساتھ ہوا یہ کہ لوگوں نے اسے اوڑھنا بچھونا بنا کر ایک خاص طبقے اور خاص ازم کے دائرے میں خود کو محدود کر لیا۔ ویسے بھی کوئی چیز ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔معاشرہ تبدیل ہوتا ہے، لوگوں کے خیالات وعقائد تبدیل ہوتے ہیں۔یوں ترقی پسند تحریک بھی ختم ہوئی لیکن اس کے بعد آنے والی جدیدیت مجھے کبھی نہیں بھائی بلکہ میں کانوں کو ہاتھ لگا کر اس سے دور بھاگتی رہی۔ میں کیا بیشتر قاری بھاگ نکلے۔ادیبوں نے جو لکھا اسے خود ہی پڑھایا۔ کوئی بیس سال پہلے میں نے دو ناول پڑھے تھے۔'ہزار چوراسی کی ماں' (مہا شویتا دیوی) اور 'کتھا ایک پرانتر کی' (ملیالم مصنف ایس۔ کے۔ پوٹے کاٹ)۔ دونوں نے جھنجھوڑا ہی نہیں اس قدر متاثر کیا کہ پوٹے کاٹ کا ناول میں خرید لائی اور اسے کبھی کبھی اٹھا کر کہیں سے بھی پڑھ لیتی ہوں۔ دور جدیدیت کے اردو افسانہ نگاروں میں سے کسی کی بھی تخلیقات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ خود کو بار بار پڑھوائیں۔اروندھتی رائے کا 'گاڈ آف اسمال تھنگز' (God Of Small Things) بھی ان ناولوں میں ہے جو میرے سرہانے بک شیلف میں رکھے ہوئے ہیں اور خود کو پڑھواتے رہتے ہیں۔ان میں سے کسی نے بھی ہاتھ گھما کر ناک پکڑی ہے۔ پہیلیاں بجھائی ہیں۔ پوٹے کاٹ کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان ان کا بہت بڑا وصف ہے۔ترجمے میں زبان تو چلی گئی پھر بھی اس کی روح اس قدر طاقتور ہے کہ قاری کو باندھ لیتی ہے اور پھر اسلوب بھی۔

جدیدیت تو جلد ہی مسترد کر دی گئی۔کم از کم اردو والوں کے یہاں۔ ہندی نے تو شاید اسے زیادہ اہمیت دی ہی نہیں تھی۔اب رہی مابعد جدیدیت۔میں نہیں جانتی یہ کیا ہے۔ جو کچھ جدیدیت کے بعد آئے گا اسے مابعد جدیدیت تو کہیں گے ہی۔اردو فکشن پھر کہانی پن اور ماجرا کی طرف لوٹا۔ میں ہمیشہ سے اسی طرح کہانی کہتی چلی آ رہی ہوں۔ جیسے میری دادی زبانی سنایا کرتی تھیں۔ زمان و مکان، زبان و بیان، کردار و مکالموں کے فرق کے ساتھ —— کہ یہ تو ہمیشہ تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ اب آپ کو میری سنائی (لکھی) ہوئی کہانیاں پسند آئیں تو سنیے (یعنی پڑھیے) نہ پسند آئیں تو مسترد کر دیجیے۔

میں کسی ازم سے باضابطہ طور پر تو وابستہ نہیں ہوں لیکن سماجی نابرابری، معاشی خلیج، ذات و فرقہ پرستی پر مبنی اصلیت مجھے سخت تکلیف پہنچاتی ہیں۔کبھی کبھی میرے اور گرد و پیش کے واقعات سے بڑا اضمحلال (ڈپریشن) طاری ہوتا ہے۔ کبھی غصے کی وہ کیفیت ہوتی ہے جسے بے بس غصہ کہہ سکتے ہیں۔آج کیا ادیب سماج کو بدلنے کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ شاید نہیں۔تاوقتیکہ مہا شویتا دیوی اور اروندھتی رائے کی طرح میدان عمل میں کود پڑے۔ بہر حال لکھنا تو جاری رہے یہ امید بھی رہے کہ شاید کچھ اذہان، کہیں کبھی متاثر ہو سکیں۔ کچھ نہیں تو ایک صحتمند جمالیاتی حس تو جاگے۔

**اص:** آج کل اردو فکشن میں دلت موضوع پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔کیا آپ نے بھی اس موضوع پر افسانے لکھے ہیں؟

**ذکیہ مشہدی:** اردو فکشن میں دلتوں پر ابتدا میں پریم چند نے لکھا ہے۔اردو چونکہ اشرافیہ اور شہری علاقوں میں رہنے والے اشراف سے زیادہ وابستہ رہی اس لیے پریم چند کے بعد اس پر بہت کم توجہ دی گئی۔آج ہندی اور خصوصاً مراٹھی ادب میں دلتوں کو موضوع بنایا جا رہا ہے اور کئی دلت فکشن نگار جن

**یوں ترقی پسند تحریک بھی ختم ہوئی لیکن اس کے بعد آنے والی جدیدیت مجھے کبھی نہیں بھائی بلکہ میں کانوں کو ہاتھ لگا کر اس سے دور بھاگتی رہی۔ میں کیا بیشتر قاری بھاگ نکلے۔ ادیبوں نے جو لکھا اسے خود ہی پڑھایا۔ کوئی بیس سال پہلے میں نے دو ناول پڑھے تھے۔'ہزار چوراسی کی ماں' (مہا شویتا دیوی) اور 'کتھا ایک پرانتر کی' (ملیالم مصنف ایس۔ کے۔ پوٹے کاٹ)۔ دونوں نے جھنجھوڑا ہی نہیں اس قدر متاثر کیا کہ پوٹے کاٹ کا ناول میں خرید لائی اور اسے کبھی کبھی اٹھا کر کہیں سے بھی پڑھ لیتی ہوں۔ دور جدیدیت کے اردو افسانہ نگاروں میں سے کسی کی بھی تخلیقات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ خود کو بار بار پڑھوائیں۔**

میں کچھ خواتین بھی ہیں۔کافی فعال ہو گئے ہیں۔اردو ادیب ان سے اثرات قبول کر رہے ہیں۔ ایک بڑے مسئلے کو ہم حاشیے پر تو نہیں ڈال سکتے۔ میں نے اس کی 'رو' سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ خود اپنی خواہش کے تحت دو افسانے لکھے تھے۔ ایک ہے 'گڑ روٹی' اور دوسرا جو نسبتاً حال میں لکھا ہے 'مچھندر کی واپسی' جسے قارئین نے بہت سراہا۔اسے 'آج' (کراچی) نے ڈائجسٹ بھی کیا ہے۔میری ایک دوست مسز وینا اپادھیائے دلت عورتوں کے ساتھ بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ نہ جانے کتنے خاندانوں میں انھوں نے دستکاری اور تعلیم پہنچائی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ان کے دفتر جا کر خود ان خواتین سے ملوں اور براہ راست معلومات حاصل کروں۔اب یہاں یہ نہ سوچ لیجیے گا کہ مجھے خاتون ہونے کے ناطے خواتین کو ہی موضوع بنانا ہے۔موضوع پورے کنبے اور ان کے مسائل ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ناولٹ لکھ ڈالوں (خوش فہمیاں پالنا ذہنی صحت کے لیے اچھا رہتا ہے)

**اص:** آپ کے بعد جو خواتین افسانہ نگار سامنے آئیں ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

**ذکیہ مشہدی:** میرے بعد کئی ایسی افسانہ نگار خواتین سامنے آئی ہیں جو اردو فکشن کو باثروت بنا رہی ہیں۔انھوں نے ناول بھی لکھے ہیں۔خاص طور پر ترنم ریاض کا نام لینا چاہوں گی۔انھوں نے خواتین کو اس الزام سے بری کیا ہے جو اکثر ان پر یہ کہہ کر لگایا جاتا ہے کہ وہ محض گھر آنگن کی کہانیاں لکھتی ہیں۔نگار عظیم ہیں، عذرا نقوی صاحبہ ہیں، غزال ضیغم، شائستہ فاخری، صادقہ نواب سحر، ثروت خان، تبسم فاطمہ ہیں۔ صادقہ نواب سحر نے اردو میں مہاراشٹرا کی علاقائی زبان، ماحول، مقامی مسائل کے رنگوں کی آمیزش کی ہے۔یہ چیز اردو کے لیے نئی اور خوش آئند ہے۔ یہ ساری خواتین اس حصار سے باہر نکل آئی ہیں۔جو خواتین کو صرف ان کے ذاتی مسائل تک محدود رکھتا ہے۔ میں سب نام نہیں لے پا رہی ہوں۔ کچھ جواب ویسے ہی خاصے طویل ہو گئے ہیں۔ بہر حال یہ خواتین اردو افسانے/فکشن کے اچھے مستقبل کی ضامن ہیں۔

**اص:** آپ کی آنے والی کتابیں کون کون سی ہیں؟

**ذکیہ مشہدی:** اردو میں کتابوں کی اشاعت اتنی مشکل ہے یہ آپ بحیثیت فکشن نگار خوب جانتے ہوں گے۔ میرا ایک مجموعہ 'یہ جہان رنگ و بو' بس کوئی سال بھر پہلے آیا ہے۔ اس لیے اگلی کتاب کے لیے وقت چاہیے۔ایک ناول پر کام کر رہی ہوں۔ساہتیہ اکادمی دہلی کے لیے ایک چار سو صفحات پر مشتمل ناول کا ترجمہ حال میں ختم کیا ہے۔ یہ تو وہی لوگ شائع کریں گے۔ میرا ارادہ ہے افسانوں کی ایک انتھالوجی شائع کرنے کا۔یہ شاید چھ ماہ کے اندر سامنے آ سکے۔ بشرط صحت و زندگی۔ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ میں نے جوابات کے دوران کچھ افسانہ نگاروں اور نقادوں وغیرہ کے نام لیے ہیں۔اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ اور نام نہیں ہیں۔ میرے ذہن میں فوری طور پر جو نام آئے ان کا ذکر کر دیا۔ علاوہ ازیں یہ جس ترتیب میں آئے اس میں ارادے کا دخل نہیں ہے نہ ترجیح کا۔

■

**Dr. Ahmad Sagheer.**,.Haneef Manzil, Koily Pokhar, Police Line, Gewal Bigha, Gaya - 823001

# زبانیں ملک میں اتحاد وسلامتی قائم رکھ سکتی ہیں: اسمرتی ایرانی

ڈائس پر موجود پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب، پروفیسر اختر الواسع، سید محمد اشرف صاحب، جے این یو کے وائس چانسلر پروفیسر ایس کے سپوری صاحب، جوائنٹ سکریٹری ایس ایس سندھو صاحب اور اس تقریب کی خوبصورت ناظم محترمہ شگفتہ یاسمین صاحبہ اور ہال میں موجود تمام حاضرین کرام! میں اس عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں اور نیک خواہشات کا اظہار کرتی ہوں۔ مجھ سے قبل سید محمد اشرف صاحب اور پروفیسر اختر الواسع صاحب نے تقریر کی ہے اور میرا ماں سے منتری بننے کا فاصلہ آپ نے طے کروادیا لیکن سید محمد اشرف صاحب نے مجھے مالی کی ذمے داری بھی دے دی ہے میں نے پروفیسر اختر الواسع صاحب سے دریافت کیا کہ اب میں کیا انتخاب کروں۔ ماں یا مالی۔ پھر میں نے سوچتے ہوئے ان سے یہ کہا کہ پروفیسر صاحب ماں اور مالی میں فرق یہ ہے کہ مالی پودوں کو تب سینچتا ہے جب اس کے پاس کھاد ہوتی ہے اور پانی ہوتا ہے لیکن ماں بچے کو تب بھی سینچتی ہے جب چھاتی میں بھلے ہی دودھ نہ ہو لیکن اپنے لہو سے سینچتی ہے۔ اس تقریب میں یہ بات کہی گئی کہ مادری زبان کا احترام کیا جانا چاہیے اس لیے میں اپنی مادری زبان میں آپ سب سے مخاطب ہونا چاہتی ہوں۔ سب سے پہلے میں این سی پی یو ایل کے ایک ایک نمائندے اور ایک ایک عہدیدار کا اپنی جانب سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ زبان کے فروغ کے ساتھ اس زبان کو اقتصادی طور پر کیسے مضبوط کرسکتے ہیں یہ این سی پی یو ایل کی کارکردگی سے ظاہر ہے جس کے لیے میں حکومت ہند کی طرف سے اور اپنی جانب سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں یہاں آپ سب کے سامنے یہ بات کہتی ہوں کہ آئندہ دس دنوں میں کونسل کی تشکیل نو کردی جائے گی۔ پروفیسر اختر الواسع نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ بنیادی تعلیم مادری زبان میں ہی دی جانی چاہیے۔ میں بحیثیت ماں نہیں بلکہ بحیثیت وزیر یہ کہنا چاہوں گی کہ یہ CABE کے دائرہ اختیار میں ہے جو ہمارے ملک میں تعلیم سے متعلق اہم باڈی ہے اور تعلیم سے متعلق تمام اہم فیصلے اسی باڈی کے ذریعے لیے جاتے ہیں لیکن میں آپ کا یہ پیغام اس باڈی تک پہنچانے کی یقین دہانی کراتی ہوں۔ سب کی مادری زبان کا احترام کیسے ہو اس بات کی فکر وزارت فروغ انسانی وسائل کے تمام عہدے داران اور میں خود بھی کرتی رہی ہوں۔ ہم آئندہ سال 21 فروری کو یوم مادری زبان کے طور پر منائیں گے اور میں تمام طالب علموں سے گزارش کروں گی کہ آپ اپنی مادری زبان کی قیمت کو سمجھیں، مادری زبان کو نہ صرف بولیں بلکہ پڑھیں اور لکھیں تاکہ سبھی لوگ اپنی روایتوں سے جڑ سکیں اور اپنے دادا، نانا، نانی، دادی کے پرانے خطوط پڑھ سکیں۔ میں کونسل کے عہدے داران سے درخواست کرنا چاہوں گی کہ یہ مادری زبان کے موقعے پر خصوصی طور سے کونسل بھی تیاری کرے اور اپنے مشوروں سے ہمیں آگاہ کرے، میری پوری کوشش رہے گی کہ مادری زبان کے فروغ سے متعلق آپ کے مشوروں پر ہم غور وخوض کریں گے اور اپنے پروگراموں میں انھیں شامل کریں گے۔ میں بیرون ممالک سے آئے تمام اردو مندوبین کا ہندوستان کی جانب سے حکومت ہند کی جانب سے خیر مقدم کرتی ہوں، استقبال کرتی ہوں اور اس عالمی اردو کانفرنس میں آپ کی شرکت کے لیے ہم مشکور و ممنون ہیں۔ این بی ٹی کے تعلق سے کچھ باتیں یہاں کہی گئی ہیں۔ میں آپ سب کو بتادوں کہ کل ہی شام میں ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ این بی ٹی کے ذریعے کتاب میلوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور چھوٹے سے چھوٹے شہروں میں بھی کتاب میلے کا انعقاد کیا جائے۔ میں عالمی اردو کانفرنس کے اس اجلاس میں یہی کہوں گی کہ زبانوں کے ذریعے ہی ہم ملک کے اتحاد و سلامتی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ کوئی بھی زبان چاہے اردو ہو، ہندی ہو، تمل ہو، ملیالم ہو یہ سب زبانیں ہمارے مادر وطن سے جڑی ہیں۔ ہماری شناخت سے جڑی ہیں۔ میری کوشش ہوگی کہ زبانیں ہم سب کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھیں۔ سید محمد اشرف صاحب نے ابھی ایک واقعے کا ذکر کیا کہ خلا میں پہنچنے والے سے جب یہ پوچھا گیا کہ ہندوستان کیسا نظر آتا ہے تو اس نے اردو زبان میں کہا تھا ”سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا“ میں جاتے جاتے بس یہی کہوں گی۔

ہندی ہیں، ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

آڈیو سے اردو تحریر میں منتقلی: **عبدالحی**

# دوسری عالمی اردو کانفرنس "اغراض و مقاصد" پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

خواتین وحضرات اورڈائس پرتشریف فرما معزز مہمان کرام!

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہم دوسری عالمی کانفرنس میں یہاں موجود ہیں۔ ہم قومی اردو کونسل کی جانب سے، اردو کی جانب سے، اردو دنیا کی جانب سے دل کی گہرائیوں سے آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ حضرات! اردو محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب ہے جس کی ایک طویل روایت ہے ایک عظیم برصغیر کی مشترکہ تہذیبی وراثت کی امین بھی ہے، سچائی یہ ہے کہ دنیا میں بہت ساری زبانیں ہیں۔ ہر زبان کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ ہر شخص اپنی زبان اور اپنی تہذیب کا دلدادہ ہوتا ہے لیکن کچھ زبانوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اپنا گرویدہ بنالیتی ہیں ان زبانوں کی فہرست میں اردو یقیناً سرفہرست ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دنیا میں جن زبانوں نے آفاقی طور پر اپنے اثرات مرتب کیے ان میں چند زبانوں کا نام آتا ہے۔ ایک جو کاروباری زبان ہے، معیشت اور اقتصادیات کی بنیاد پر پوری دنیا کا سفر کیا ہے۔ وہ زبان انگریزی اور فرنچ ہے لیکن میں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس زبان نے تہذیبی بنیادوں پر پوری دنیا کا سفر کیا ہے وہ صرف اور صرف اردو زبان ہے اردو زبان آج کی ہی نہیں بلکہ صدیوں کی وراثت کی امین ہے۔

قومی اردو کونسل جو حکومت ہند کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ دنیا بھر میں یہ اردو کے فروغ کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو فروغ اردو کے لیے مختلف جہتوں پر کام کر رہا ہے۔ ہم حکومت ہند کے شکرگزار ہیں کہ حکومت ہند نے ہمیں خودمختاری دی ہے اور حکومت ہند، ہمارے تمام منصوبوں کو من وعن قبول کرتی ہے۔ موجودہ حکومت نے بھی ہماری تمام سفارشات کو قبول کیا ہے۔ ہم شکرگزار ہیں اپنی وزیر موصوفہ محترمہ اسمرتی ایرانی صاحبہ کے۔ انھوں نے اس کانفرنس کو منعقد کرنے کی منظوری دی اور خود اس میں شرکت کی رضامندی ظاہر کی۔ حضرات یہ کوشش ایک دن کی نہیں ہے تقریباً تین مہینے سے مختلف سطح پر کوششیں جاری تھیں۔ میں نے اس کانفرنس کے لیے جب اپنی خواہش کا اظہار کیا تو نہ صرف کونسل کے اراکین اور عہدے داران نے بلکہ پوری اردو دنیا نے اس کا استقبال کیا جس کے لیے ہم تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہم نے جن لوگوں کو بھی دعوت دی اور کانفرنس میں شرکت کی درخواست کی ان سب نے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اسے ایک خوش آئند پہل سے تعبیر کیا۔

حکومت نے ہمیں اردو زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت کی ذمے داری سونپی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے اس دور میں جب تک ہم ذرائع ابلاغ نہیں استعمال کریں گے تب تک ہماری باتیں نہ عوام تک پہنچیں گی نہ خواص تک پہنچیں گی۔ اور نہ خود ہم اپنے آپ میں بیداری محسوس کریں گے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کوشش کی کہ اس طرح کے پروگرام کا انعقاد کیا جائے۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ ہم نے گزشتہ برس کانفرنس کے انعقاد کے لیے حکومت ہند کو درخواست بھیجی جس کی حکومت نے منظوری دی اور خدا کا شکر ہے کہ ہم آج اب دوسری عالمی کانفرنس میں موجود ہیں۔

مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بھی ایک تاریخی لمحہ ہے اردو کی تاریخ میں۔ ہم نے اس کانفرنس میں پڑھے جانے والے تمام مقالات کو کتابی شکل میں کانفرنس سے قبل ہی شائع کردیا ہے۔ اس میں کونسل کے عہدے داروں نے جس جانفشانی اور دلجمعی سے کام کیا ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ہم نے اس کانفرنس میں اردو سے جڑی تین نسلوں کے لوگوں کو بلایا ہے۔ نہ صرف اساتذہ بلکہ صحافی قلمکار اور نئی نسل کے مندوبین بھی اس کانفرنس میں شامل ہیں۔ اس کانفرنس میں اردو کے ایسے چاہنے والے بھی شریک ہیں جو امریکہ، کناڈا، جرمنی، جاپان میں اردو کی دور دراز بستیوں میں اردو زبان وادب کی ایسی خدمت کر رہے ہیں جو ہم لوگ یہاں نہیں کر پا رہے ہیں۔ ہم ان کے شکرگزار ہیں اور ان کا استقبال کرتے ہیں۔

جب ہم اردو کی بات کرتے ہیں تو ہندوستانیت کی بات کرتے ہیں۔ جب ہم عظیم وراثت کا ذکر کرتے ہیں تو پورے برصغیر کی عظیم وراثت کی بات کرتے ہیں۔ اس کانفرنس میں اس عظیم ہندوستانی وراثت کو اکیسویں صدی کے تناظر میں دیکھنا ہے۔ کون سے چیلنجز ہمارے سامنے درپیش ہیں۔ ان کا مقابلہ کس طرح سے کیا جاسکتا ہے۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ بھی ہے کہ اشتراک کی کون سی صورت نکل کے سامنے آسکتی ہے کہ ہم دنیا بھر میں بسی اردو کی نئی بستیوں سے رابطہ کرکے ان کے ساتھ مل جل کر اردو کو آگے بڑھا سکیں اور اردو کے فروغ کے امکانات کی تلاش کرسکیں۔ حضرات میں حکومت ہند کی طرف سے آپ کو یہ خوش خبری سنانا چاہتا ہوں کہ گزشتہ برس جو عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں پیش کردہ سفارشات کو ہم نے حکومت ہند کو بھیجا تھا ان میں چار پانچ نکات پر کام بھی شروع کردیا گیا اور موجودہ حکومت نے بالخصوص محترمہ اسمرتی ایرانی صاحبہ نے بھی یقین دلایا ہے کہ اس کانفرنس میں بھی جو تجاویز آئیں گی۔ حکومت ہند بخوشی قبول کرنے کی اور اس پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

ہم پر بھی یہ فرض بنتا ہے کہ اردو والے ہونے کے ناطے جہاں بھی ہیں اردو کی شمع کو روشن کریں اور اس شمع کو روشن کرنے میں اگر ہماری خدمات درکار ہیں تو ہم لبیک کرتے ہوئے آپ کی طرف بڑھیں گے۔ ہم ایک بار پھر ہندوستان، دور دراز ممالک سے آئے اردو کے دانشوروں کا استقبال کرتے ہیں اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آیئے ہم عزم کریں کہ مل بیٹھ کر اردو کو آگے بڑھائیں گے اور اردو کو آگے بڑھانے کا مقصد ہے ہندوستانی تہذیب کو اور ہندوستانی زبان کو آگے بڑھانا۔ ■

آڈیو سے اردو تحریر میں منتقلی: عبدالحی

عبدالحی

## قومی اردو کونسل کی

# دوسری عالمی اردو کانفرنس

## اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ

30 اکتوبر 2014 قومی اردو کونسل کی تاریخ کا ایک ایسا یادگار اور روشن دن تھا جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ قومی اردو کونسل نے 30 اکتوبر تا 1 نومبر 2014 کو اپنی دوسری عالمی کانفرنس منعقد کی جس میں ملک و بیرون ملک سے تشریف لائے درجنوں اردو کے مندوبین شامل ہوئے اور سیکڑوں کی تعداد میں محب اردو نے اس سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس میں شریک ہوکر اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیا۔ اردو کے اس یادگار جشن کو اس لیے بھی یاد رکھا جائے گا کہ اس میں اردو زبان سے متعلق مختلف مسائل پر خاصی علمی گفتگو ہوئی۔ اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ کے موضوع پر منعقدہ اس کانفرنس میں دنیا کے مختلف ممالک میں آباد اردو بستیوں میں اردو کی صورت حال، اردو کو سماجی و ثقافتی سطح پر در پیش مسائل اردو کی لسانی ثقافت وغیرہ اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا۔ پیش ہے اس عالمی کانفرنس کی روداد:

سیمینار میں پیش کردہ مقالات پر مبنی کتاب 'اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی وثقافتی فروغ' کے اجرا کا منظر

اردو زبان نہ صرف ہندوستانی تہذیب وثقافت کی نمائندہ زبان رہی ہے بلکہ ملک کی تمام تحریکات ورجحانات میں بھی اس زبان کا اہم کردار رہا ہے۔ اکیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے اردو زبان نے خود کو نہ صرف یہ کہ زبان کی سطح پر مضبوط کیا ہے بلکہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ایک زندہ اور جدید زبان کی صورت بھی لے لی ہے۔ قومی اردو کونسل فروغ اردو کے لیے حکومت ہند کے اہم ادارے کے طور پر کام کرتی رہی ہے۔ قومی اردو کونسل اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کی اہم اسکیمیں چلاتی ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں اس کے اردو اور عربی کے مراکز موجود ہیں۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی امداد فراہم کرتی ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر اردو زبان کو عصری علوم وذرائع سے آراستہ کرنے کے لیے گرافک ڈیزائننگ اور کمپیوٹر کورسس بھی کرائے جاتے ہیں جس کے مراکز ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ گزشتہ برس سے کونسل نے ایک اور تاریخ ساز قدم اٹھاتے ہوئے DREAM پروجیکٹ کی شروعات کی جس میں پیپر ماشی وغیرہ صنعتوں سے متعلق کورس کرائے جارہے ہیں۔ کونسل سیمینار، ورکشاپ اور سمپوزیم کا بھی اہتمام کرتی ہے اور ان کے لیے مختلف سطح پر مالی معاونت بھی فراہم کرتی ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو زبان ایک ایسی شاہراہ پر کھڑی ہے جہاں وہ جدید علم اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہوچکی ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو کو کافی چیلنجز کا بھی سامنا ہے۔ زبان وادب کی سطح پر ہورہی تبدیلیوں اور تغیرات کے اثرات اور زبان اردو کے فروغ وامکان کے لیے ایک نیا لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے کونسل نے عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔ گزشتہ برس کونسل کی عالمی کانفرنس بے حد کامیاب رہی تھی اور کانفرنس میں پیش کردہ تجاویز و سفارشات کو مرکزی حکومت کو سونپا گیا اور اس پر پیش رفت بھی ہورہی ہے۔ اس سال کانفرنس کا موضوع 'اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی وثقافتی فروغ' رکھا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں اردو کو اکیسویں صدی کے سیاق میں عالمی سطح پر درپیش مسائل اور چیلنجز پر غور وخوض کیا گیا۔ کانفرنس کو اردو کا سماجی وثقافتی تناظر اردو زبان، ماضی حال اور مستقبل، اردو زبان وادب کا قومی وبین الاقوامی منظرنامہ، اردو صحافت اور ترجمہ، اردو تعلیم اور انفوٹینمنٹ شعبوں میں اردو جیسے حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے تحت ملک وبیرون ملک سے 52 مقالات منگوائے گئے اور انھیں مختلف اجلاس میں شعرا، ادبا وناقدین نے پیش کیا۔

وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے تحت کام کرنے والے ادارے قومی اردو کونسل کا مقصد اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی اور اردو کو روزگار سے جوڑنا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کی غرض سے کونسل ملکی سطح پر کام کر رہی ہے اور اب کونسل اردو کے عالمی منظر نامے پر بھی توجہ دے رہی ہے۔ ایک لینگوا فرینکا اور رابطے کی زبان ہونے کی بنا پر اردو آج عالمی سطح پر بھی مقبولیت کی نئی تاریخ رقم کر رہی ہے۔ دوسری عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد سے قبل ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کانفرنس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے نئی حکومت کا اردو کے تئیں ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس کانفرنس میں اردو زبان وادب کے ساتھ ہندوستانی ذہن و تہذیب کے حوالے سے بھی گفتگو ہوگی۔

ایک سوال کے جواب میں ڈائرکٹر نے کہا کہ اردو ریڈرس کو بڑھانے کی ہم مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے پورے ملک میں اردو لرننگ کورس کے مراکز قائم کیے ہیں۔ آپ کو جان کر مسرت ہوگی کہ ہم نے ملک کی شمال

پروفیسر عبدالستار دلوی، ممبئی

پروفیسر نصیر احمد خاں، دہلی

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، دہلی

پروفیسر مرزا حامد بیگ، پاکستان

پروفیسر عبدالحق، دہلی

پروفیسر قدوس جاوید، کشمیر

مشرقی ریاستوں میں بھی اردو کے سنٹرز قائم کیے ہیں۔ ہم نے آن لائن اردو کورس کا آغاز کیا ہے جس میں اب تک ہزاروں طالب علم رجسٹرڈ ہو چکے ہیں۔ ہمیں حکومت نے پوری پوری آزادی دی ہے کہ آپ اردو کے فروغ کے لیے پوری کوشش کریں اور ہم ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں۔

کانفرنس کی غرض و غایت بتاتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اردو خالصتاً ہند آریائی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی رابطے کی بھی زبان ہے اور آج یہ زبان دنیا کے مختلف خطوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کی ان بستیوں سے بھی اردو زبان و ادب کو ایک نئی جہت اور ایک نیا حوصلہ ملا ہے۔ اس عالمی کانفرنس کا انعقاد اسی مقصد کے پیش نظر ہے تا کہ اردو کو عالمی سطح پر بھی فروغ دینے کے امکانات تلاش کیے جا سکیں اور اسے عہد حاضر کے تقاضوں سے جوڑتے ہوئے اس زبان میں روزگار زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے جا سکیں۔

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، کناڈا، جرمنی، ڈنمارک، برطانیہ، ازبکستان، ایران، ماریشس جیسے ممالک سے آئے اردو کے اہم شعرا اور ادبا نے اپنے اپنے ملک میں اردو زبان و ادب سے متعلق مسائل و امکانات پر پر مغز گفتگو کی۔ ایک خوش آئند پہل اس کانفرنس کے ساتھ یہ بھی ہوئی کہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کو سیمینار سے قبل کونسل میں منگا کر ان کی پروف ریڈنگ ایڈیٹنگ کی گئی اور اسے کتابی شکل میں شائع بھی کر دیا گیا اور کانفرنس کے دوران اس کا اجرا بدست مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل محترمہ اسمرتی زوبن ایرانی عمل میں آیا۔ گزشتہ سال کی کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات پر مشتمل کتاب کا اجرا بھی کانفرنس کے پہلے دن کیا گیا۔

قومی اردو کونسل کی دوسری عالمی اردو کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر دنیا بھر سے آئے ہوئے مندوبین نے کونسل کے اس اقدام کی ستائش کرتے ہوئے اردو کے روشن اور تابناک مستقبل کی امید ظاہر کی۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس صبح 10.30 بجے شروع ہوا۔ انڈیا ہیبیٹیٹ سنٹر کا اسٹین ہال دنیا کے 10 ممالک سے آئے اردو کے چاہنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ سبھی لوگ اردو کی ترویج و ترقی کے خواہاں تھے اور کونسل کی ایک آواز پر یہاں جمع ہوئے تھے۔ ان سبھی کے ذہنوں میں اردو زبان و ادب کے فروغ کا جذبہ بھرا تھا جو انھیں یہاں کھینچ لایا تھا۔ اردو ایک ایسی تہذیبی وراثت ہے جو برسوں سے ہندوستان کی مٹی میں رچی بسی ہے اور اب اس زبان کی خوشبو پوری دنیا میں پھیل چکی ہے اور اردو نے اپنی تہذیبی بنیادوں پر پوری دنیا کا سفر طے کیا ہے۔ قومی اردو کونسل پوری دنیا میں اردو کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ قومی اردو کونسل نے اردو زبان و ادب کا عالمی سطح پر جائزہ لینے کے لیے گزشتہ سال کی کامیاب عالمی اردو کانفرنس کی ہی طرز پر اس سال بھی عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ کانفرنس میں استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ ہم نے یہ عالمی کانفرنس یہ جاننے کے لیے منعقد کی ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ کس حد تک ہو رہا ہے اور اردو

## سید محمد اشرف

لفظ ہندی، ہندوا اور ہندوستان یہ تینوں اردو زبان کی پیداوار ہیں۔ خلا میں اگر کوئی زبان گونجی تو وہ اردو زبان تھی۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ اقبال کا یہ ترانہ ہی خلا سے پہلی دفعہ گونجا۔ اردو رسم الخط کے ساتھ اردو تعلیم کو بنیادی سطح پر یقینی بنانا حکومت کی ذمے داری ہے۔ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ یہ فارسی، عربی، سنسکرت کی طرح باہر سے نہیں آئی لیکن آج اپنے گھر میں مدد کی آس لگائے بیٹھی ہے۔ جب تک اردو رسم الخط کو ابتدائی اور ثانوی سطح پر نہیں پڑھایا جائے گا اس وقت تک اردو کا مسئلہ نہیں حل ہو سکتا۔ اردو زبان ایک نسل سے ٹوٹ گئی ہے۔ آج کی نوجوان نسل اردو میں لکھے نانا نانی، دادا دادی کے خطوط نہیں پڑھ سکتی۔ آج کی نسل لسانی طور پر اپنے آبا و اجداد کی وراثت سے دور ہو گئی ہے۔ اگر انھیں اردو رسم الخط اور اردو زبان کی تعلیم دی گئی تو یہ نسل پھر سے اپنے تہذیبی ورثے سے جڑ جائے گی، زبانیں انسان کی پیدائشی جائداد ہیں اور اس پر کوئی بندش نہیں لگا سکتا۔ دوسری زبانوں کے فکشن، تنقید اور شاعری کا اگر اردو میں ترجمہ ہوگا تو اس سے نہ صرف اردو میں رنگارنگی پیدا ہوگی ساتھ ہی دوسری زبانوں کا ابھی فروغ ہوگا۔ ہمیں مدارس کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ اور اس کے رسم الخط کے تحفظ میں بے مثال کردار ادا کیا ہے۔

زبیر رضوی، دہلی

پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی، دہلی

پروفیسر زماں آزردہ، کشمیر

پروفیسر سید سجاد حسین، چنئی

عنایت حسین عیدن، ماریشس

پروفیسر صغیر افراہیم، علیگڑھ

زبان ملک اور بیرونِ ملک کے دور دراز علاقوں میں کس طرح ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ ہم اردو کو عالمی سطح پر وہ مقام دلانا چاہتے ہیں جس کی اردو حقدار ہے۔ گزشتہ سال کی عالمی کانفرنس کی پیش کردہ تمام تجاویز کو ہم نے حکومت کی خدمت میں پیش کر دیا تھا اور اس پر کام بھی ہو رہا ہے اور موجودہ حکومت بھی ہماری کوششوں میں تعاون کر رہی ہے۔ استقبالیہ کلمات کے بعد گزشتہ سال پڑھے گئے مقالات پر مشتمل کتاب کا اجرا کیا گیا۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر شمیم حنفی نے اردو کا ہندوستانیت کے تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو میں خالص ہندوستانی عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں اور یہ زبان پوری دنیا کا سفر کرتی رہی ہے۔ اردو کا مزاج خالص ہندوستانی ہے۔

عالمی اردو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کناڈا سے تشریف لائے نامور ادیب و شاعر و محقق اور ناقد ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ اردو آج پوری دنیا میں بکھری ہوئی ہے۔ آج ہمیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ جو کام دوسرے لوگوں اور اداروں نے نہیں کیا وہ اس ادارے نے کیا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ جس زبان میں ادب عالیہ کا خزانہ ہوگا وہ زبان زندہ رہے گی اور اردو میں ادب عالیہ بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو حسن یوسف ہے، کب تک اسے کنعان کے کنویں میں بند رکھیں گے۔ اردو کو بازارِ مصر میں پیش ہونا چاہیے۔

اس موقعے پر ممبئی سے تشریف لائے معروف ناقد و محقق پروفیسر عبدالستار دلوی نے اردو کا تہذیبی و تاریخی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کا فروغ بے حد ضروری ہے۔ اردو کو علاقائی زبانوں کے ساتھ بھی لین دین کا عمل جاری رکھنا چاہیے۔ حکومت ہند نے بھی اردو کی ترقی کے لیے جو حکمت عملی بنائی ہے وہ قابل تعریف ہے اور کونسل اس کام کو بہتر انداز میں انجام دے رہی ہے۔ نامور ناقد و شاعر پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ اردو کے فروغ کی کوششوں سے قبل ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں روزمرہ کے کام کاج میں زیادہ سے زیادہ اردو کا استعمال کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اس اجلاس کی نظامت بے حد خوبصورت انداز میں ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے کی۔

## پروفیسر اخترالواسع

ہمارے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا پورا حق ہے۔ یکم اپریل کو اسکول تو کھل جاتے ہیں لیکن اردو کی کتابیں ہمیں وقت پر نہیں مل پاتی ہیں۔ ایسے میں بچے ملک کی تعمیر میں کس طرح تعاون کر سکیں گے۔ زبانوں سے انسان کا وہی رشتہ ہے جو اس کا اپنی ماں کے دودھ اور اپنے وجود سے ہوتا ہے۔ کیندریہ ودیالیہ اور نوودے ودیالیہ میں اردو تعلیم کا نظم ہونا چاہیے۔ اردو میڈیم کے اساتذہ، پرنسپل اور وائس پرنسپل کی تقرری کو یقینی بنایا جائے۔ اردو والوں کو ان کا دستوری حق ملنا چاہیے۔ ملک کے آئین نے تمام مادری زبانوں کے تحفظ اور فروغ کی ضمانت دی ہے اس لیے حکومت کو ہماری مادری زبان اردو کی تعلیم کا ٹھوس انتظام کرنا چاہیے تا کہ کوئی بھی اردو کا طالب علم اپنے اس بنیادی حق سے محروم نہ رہ سکے۔ اردو کو جنم دینے والی ہندوستانی سرزمین ہی ہے اس لیے اردو رسم الخط کے ساتھ اس کو زندہ رکھنے کی سب کی ذمے داری ہے۔

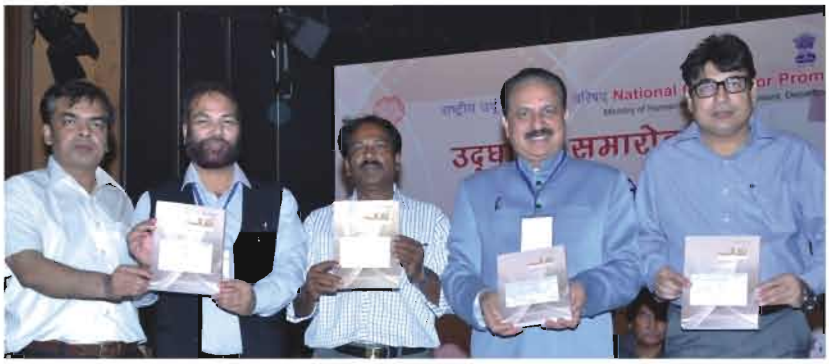

جمشید پور سے نکلنے والے رسالے 'راوی' کے اجرا کا منظر

علیم صبا نویدی، چنئی

پروفیسر ابن کنول، دہلی

پروفیسر وہاج الدین علوی، دہلی

پروفیسر علی احمد فاطمی، الہ آباد

ڈاکٹر اطہر فاروقی، دہلی

سید فیصل علی، نوئیڈا

چائے کے وقفے کے بعد دوسرا اجلاس ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس کی نظامت پروفیسر ناشر نقوی نے کی۔ اجلاس کا پہلا مقالہ مصر سے تشریف لائے ڈاکٹر احمد محمد احمد عبدالرحمان نے پڑھا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں 'ہندوستان میں اردو زبان کو درپیش چیلنجز' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو مشترکہ قومیت کی ترجمان ہے۔ 'عالمی تغیرات اور تحفظ اردو' کے موضوع پر مقالہ پڑھتے ہوئے روزنامہ انقلاب، ممبئی کے مدیر شاہد لطیف نے کہا کہ عالمی سطح پر زبان میں ڈھیروں تبدیلیاں ہوگئی ہیں اور ہمیں ان تبدیلیوں کو قبول کرنا چاہیے۔ انھوں نے سیمینار کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے امید ہے کہ تین روزہ عالمی کانفرنس میں اردو کی ترویج و ترقی کی سمت میں مناسب لائحہ عمل مرتب کیا جائے گا۔ کناڈا سے تشریف لائے نوجوان اردو اسکالر نعمان وحید نے اپنے مقالے 'اردو زبان اور نسل نو' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں نئی نسل کو اردو سکھانے پڑھانے کے لیے موجودہ ٹیکنالوجی سے مزین طریقے اپنانے ہوں گے۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ نئی نسل کیا چاہتی ہے۔ ان کا مطمح نظر کیا ہے۔ جرمنی سے آئے معروف شاعر سید اقبال حیدر نے اپنے مقالے 'اردو زبان کا فروغ ماضی و حال میں جرمنی اور دیگر ممالک' کے حوالے سے اظہار خیال کیا اور کہا کہ ہم اگر یہ فیصلہ کرلیں کہ زبان کو مرنے نہیں دیں گے تو اردو کی ترقی کی صورت خود بخود بنتی چلی جائے گی۔ رسم الخط کو تبدیل کرنے کی کوشش زبان کا جنازہ نکالنے کے مترادف ہے۔ ہم تارکین وطن اردو کا رونا تو روتے ہیں لیکن ہم اردو کی بقا کے لیے سنجیدگی سے کوشش نہیں کرتے ہیں۔ اجلاس کا صدارتی خطبہ پروفیسر عبدالحق نے دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اردو کی سماجی و ثقافتی شناخت پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ اپنے مشاہدات کو اکیسویں صدی کے افق پر لاکر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ظہرانے کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس سیشن کی صدارت قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے کی۔ اجلاس کا پہلا مقالہ معروف طنز و مزاح نگار نصرت ظہیر نے پڑھا۔ اپنے مقالے 'اکیسویں صدی میں اردو طنز و مزاح نگاری' میں انھوں نے اردو طنز و مزاح کے ارتقا کا جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ مزاح کو غیر سنجیدہ تصور کیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ غیر سنجیدہ بات کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس اجلاس میں جمشید پور سے شائع ہونے والے نئے ادبی رسالے 'راوی' کا ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور اطہر فاروقی کے ذریعے اجرا بھی کیا گیا۔ چنئی سے آئے علیم صبا نویدی کے مقالے کا عنوان تھا 'اردو زبان حال اور مستقبل' اپنے مقالے میں انھوں نے اردو کی تاریخی اور لسانی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی شاندار روایت رہی ہے۔ قدوس جاوید نے 'اردو کا سماجی و ثقافتی ڈسکورس' کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں پہلی بار اردو کے آئینے میں ہی جمہوریت کی تصویر دیکھی گئی۔ ان کے علاوہ شہاب عنایت ملک (جموں)، پروفیسر نعمان خان (دہلی)، ڈاکٹر مشتاق احمد (دربھنگہ) نے

## ڈاکٹر سید تقی عابدی (کناڈا)

100 برس قبل اردو ترقی بورڈ قائم کیا گیا تھا مگر اب اردو تحفظ بورڈ بنانے کی ضرورت ہے کیونکہ اس وقت اس بات کا جائزہ نہیں لیا گیا کہ نئے اور برق رفتار زمانے کے تقاضوں کے مطابق اردو کے مسائل اور تحفظ کے لیے جامع احاطہ کیا جاسکے۔ اردو ایک ایسی سخت زبان ہے جو بغیر کسی آبیاری کے زندہ اور توانا رہتی ہے لیکن ہندوستان کی حکومت نے قومی اردو کونسل کے

ذریعے اس کی ایسی آبیاری کی ہے جو دنیا کی کسی حکومت نے نہیں کی ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو رسم الخط کو سب سے بڑا چیلنج ہے جس کے تحفظ کو یقینی بنائے جانے کی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی زبان کے زمرے میں اقوام متحدہ میں اردو کا 23واں مقام ہے جب کہ بول چال اور استعمال کے لحاظ سے دنیا میں اردو کا چوتھا مقام ہے۔ کسی بھی طرح کے اندراج میں ہم اردو کو بطور مادری زبان لکھوائیں تبھی ہم اردو کو اس کا جائز حق دلانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ 74 ممالک دنیا میں ایسے ہیں جہاں اردو موجود ہے۔ اردو کی سماجی حالت چاہے جیسی بھی ہو لیکن اردو حسن یوسف ہے کب تک اسے کنعان کے کنویں میں قید رکھیں گے۔ اسے کنعان کے کنویں سے نکال کر بازار مصر میں پیش کیا جائے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ جس زبان میں ادب عالیہ کا خزانہ ہوگا وہ زبان زندہ رہے گی اور اردو میں ادب عالیہ کا خزانہ ہے۔ اردو اور ہندی دو بہنیں ہیں اور ان دونوں زبانوں کے درمیان بہتر تال میل ہونا ضروری ہے۔ اکیسویں صدی اردو کے لیے شاندار ثابت ہوگی جس میں اردو اپنی خوبصورتی اور شیرینی کو سمیٹے ہوئے پوری آب و تاب اور توانائی کے ساتھ زندہ رہے گی۔

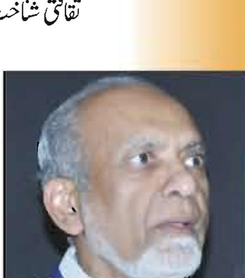

ناظم الدین مقبول، کناڈا

پروفیسر شافع قدوائی، علیگڑھ

پروفیسر مظفر شہ میری، حیدرآباد

پروفیسر نعمان خان، دہلی

پروفیسر ناشر نقوی، پٹیالہ

پروفیسر فرزانہ اعظم لطفی، ایران

بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کونسل نے اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ کانفرنس ایک نئی مثال قائم کرے گی۔ آخر میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے ایک ورلڈ اردو فورم بنانے کی تجویز پیش کی۔ انھوں نے تمام دنیا کے قلمکاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی غرض سے عالمی رائٹرس فورم بنانے پر بھی زور دیا۔ اس فورم کا مقصد ہوگا کہ اردو زبان میں جو بھی تحریریں اشاعت پذیر ہوں وہ پوری دنیا کے قاری پڑھ سکیں اور تمام قلمکار، شعرا، ادبا، ناقدین و محققین مل بیٹھ کر اردو کے فروغ کی سمت میں ایک لائحہ عمل مرتب کرسکیں۔

دوسرے دن کے اجلاس کے پہلے سیشن کا موضوع 'اردو کا سماجی و ثقافتی تناظر' تھا جس کی صدارت پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کی اور ڈاکٹر شفیع ایوب نے نظامت کی۔ سیشن کا پہلا مقالہ مختار شمیم نے پڑھا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں ہندوستان کی اردو ثقافت پر روشنی ڈالی اور اردو کا ثقافتی تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو کے شعرا نے ہندوستانیت اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے متعلق موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ 'اکیسویں صدی میں اردو ادب کا تاریخی وتہذیبی سیاق' کے موضوع پر بنارس ہندو یونیورسٹی سے تشریف لائے ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے اردو فکشن میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی نشاندہی کی۔

## پروفیسر عتیق اللہ

ادب، تہذیب کے تحفظ اور تہذیبی اقدار و اسالیب کو نسلاً بعد نسل منتقل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ وہ سارے اقدار و اسالیب جن کی تشکیل میں صدیاں صرف ہوئی ہیں یا ایک خاص عہد میں کسی مخصوص طبقے یا قوم کے عقائد و افکار، رسومات اور ان کی ادائیگی کے طریقوں، زندگی کے آداب و اطوار، فطرت سے رابطوں، امر ونواہی اور باہمی رفاقتوں اور رقابتوں کی نوعیت، اعتقادات میں فوق الفطری آثار اور

اوہام پرستی وغیرہ کے حوالے سے ادب جس طور پر آشنا کراتا ہے وہ دستاویزی نہیں ہوتے مگر دستاویزوں کے لیے اسناد، استدلال اور معتبر حوالے کا حکم ضرور رکھتے ہیں۔

اردو زبان کی تاریخ، ہماری تہذیبی زندگی بلکہ ہمارے اجتماعی لاشعور کی تاریخ ہے جس نے ایک سطح پر لنگوا فرینکا کا ایک عظیم تہذیبی اور تاریخی کارنامہ انجام دیا تو دوسری طرف کم سے کم عرصہ میں اپنی اس تخلیقی اہلیت اور تمول کا بھی ثبوت فراہم کیا جس کی بہترین مثال ہماری شاعری اور داستانوں کا غیر معمولی سرمایہ ہے۔ میرے نزدیک کسی قوم کے تخیل کی بلندی کو ناپنے کا اگر کوئی پیمانہ ہے تو وہ سائنس ہے نہ فلسفہ بلکہ شاعری ہے۔ جس قوم کی شاعری جتنی بلند ہوگی، اتنا ہی اس کا تخیل بھی بلند ہوگا اور اتنی ہی اس میں عوام الناس کے درمیان ترسیل و ابلاغ کی صلاحیت بھی زیادہ ہوگی۔

پروفیسر علی بیات، ایران

پروفیسر وفا یزداں منش، ایران

شاہد لطیف، ممبئی

ڈاکٹر ناصر عباس نیر، پاکستان

ڈاکٹر جمیل اصغر، پاکستان

سراج الدین نورمتوف، ازبکستان

افتتاحی تقریب میں دائیں سے پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر سید تقی عابدی، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور شگفتہ یاسمین

ڈاکٹر سیما صغیر کے مقالے کا موضوع تھا 'سماجی وثقافتی سرگرمیاں اور خواتین' انھوں نے خواتین کی سماجی وثقافتی سرگرمیوں پر گفتگو کی۔ چائے کے وقفے کے بعد میرٹھ سے آئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے پرمغز مقالے سے قارئین کو متوجہ کیا۔ امریکہ سے تشریف لائے جناب سید امین حیدر نے بھی اپنے گراں قدر خیالات سے نوازا۔ انھوں نے امریکہ میں فروغ اردو کی کوششوں پر بات کی اور امریکہ میں اردو کے مسائل پر بھی گفتگو کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ ہمیں ہر جگہ ہر اندراج میں اپنی مادری زبان کے خانے میں اردو لکھوانا چاہیے۔ اکیسویں صدی کا سب سے بڑا چیلنج اردو کا رسم الخط ہے۔ اردو کو ہندی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ممتاز ماہر لسانیات ممبئی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر عبدالستار دلوی نے 'اردو کی تہذیبی معنویت' پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے بھی اپنی گراں قدر گفتگو سے سامعین کو محظوظ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہر تہذیب کا اپنا وسیع تر تخیل ہوتا ہے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ یہاں پڑھے گئے تمام مقالات پرمغز اور علمی تھے۔ سبھی مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے میں فروغ اردو کے عالمی تصور کو پیش کیا ہے۔

ظہرانے کے بعد دوسرے سیشن کا آغاز ہوا جس کی صدارت معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے اپنے خوبصورت اور شگفتہ انداز میں انجام دی۔ پہلا مقالہ پاکستان سے تشریف لائے ڈاکٹر جمیل اصغر نے 'اقبال کی شاعری اکیسویں

## پروفیسر ابوالکلام قاسمی

اس کانفرنس میں شریک ملک وبیرون ملک کے اردو دانشوروں نے اپنے مقالے کے ذریعے اردو کے تعلق سے اس کی لسانی بنیادوں ڈھانچوں اور اس کے پس منظر اور مسائل وامکانات پر بھی سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ اردو کا اپنے رسم الخط سے جسم وجان کی طرح تعلق ہے جسے کسی بھی حالت میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اردو رسم الخط سے متعلق آئندہ کے تمام ممکنہ اندیشوں کو دور کرنے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ایسے ٹھوس اقدامات کیے ہیں جن کے ذریعے اردو رسم الخط کا بخوبی تحفظ کیا جاسکتا ہے۔

اردو زبان وادب نے جس طرح اپنے گردوپیش کی زبانوں اور ادبیات کو اپنے مخصوص رویوں اور رجحانات سے متاثر کیا ہے اس سے کہیں زیادہ اردو کے ادب نے عالمی اور مقامی رجحانات سے متوازی اور متوازن انداز میں اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ چوں کہ رد وقبول کا یہ سلسلہ مختلف ادبیات کے درمیان چلتا رہتا ہے اس لیے اردو ادب نے بھی اپنے آپ کو عالمی ادب کے رویوں سے کبھی الگ نہیں رکھا۔ دنیا کی بیش تر بڑی زبانوں کے ادب میں قدرے تقدیم وتاخیر کے ساتھ بعض رجحانات کا یکساں طور پر نفوذ اور وفور نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی زبانوں میں ادبی میلانات کو کسی بڑے فکری رجحان یا فلسفیانہ رویے کے پس منظر میں نمایاں ہونے کا موقع کم ملا ہے، مگر مغربی زبانوں میں جو ادبی رجحانات امتدادِ وقت کے ساتھ کارفرما رہے ہیں ان کے اثرات تاخیر سے ہی سہی مگر مشرقی زبانوں پر بھی ضرور مرتسم ہوتے رہے۔

ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی، مصر

ڈاکٹر مختار شمیم، بھوپال

محمد امین حیدر، یو ایس اے

ڈاکٹر سیما صغیر، علیگڑھ

ناصر ناکاگاوا، جاپان

صدی کے تناظر میں' پڑھا۔ پاکستان سے ہی آئے نوجوان اور ممتاز ناقد ناصر عباس نیر نے 'اکیسویں صدی اور اردو تنقید' پر اپنا بیش قیمت مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے وقت کا تصور اور اس کی قدر و قیمت اکیسویں صدی کے تناظر میں واضح کی۔ انھوں نے اپنے مقالے میں معاصر اردو تنقید پر بھی گفتگو کی۔ تہران یونیورسٹی کی اردو زبان کی استاد پروفیسر وفا یزدان منش نے 'ایران میں اردو کی صورت حال' پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے مقالے کا موضوع تھا 'عالمی ادب کے رجحانات سے اردو ادب کی اثر پذیری' انھوں نے اپنے مقالے میں یہ بتایا کہ عالمی ادب کے رجحانات سے اردو ادب نے امتیازی طور پر اثرات قبول کیے ہیں۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے گروپ ہیڈ سید فیصل علی نے 'اردو زبان کے عالمی تناظر' پر گفتگو کی اور یہ بتایا کہ اردو زبان کا فروغ تبھی ممکن ہے جب ہم اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کریں گے۔

چائے کے وقفے کے بعد پروفیسر فرزانہ اعظم لطفی، پروفیسر علی بیات، پروفیسر علی احمد فاطمی، ناظم الدین مقبول وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔ صدارتی خطبہ دیتے ہوئے سید محمد اشرف نے تمام مقالات کا مختصراً جائزہ لیا اور قومی اردو کونسل کی فروغ اردو کی کوششوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ آج جو کام قومی اردو کونسل کے ذریعے ہو رہا ہے وہ اردو کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

## شہزاد عبداللہ (ماریشس)

ماریشس بھی اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب وثقافت کا نمائندہ ملک ہے جہاں اردو کی ترویج واشاعت کے لیے نہ صرف رضاکارانہ طور پر خدمات انجام دی جارہی ہے بلکہ حکومت بھی اس پیاری زبان کی آبیاری کے لیے حتی المقدور کوشش کررہی ہے۔

ماریشس میں اردو ہماری تہذیب سے جڑی ہوئی ہے مسلم رسم ورواج مذہبی تقریبات وغیرہ کا اہتمام اردو زبان میں کیا جاتا ہے۔ جہاں تک ذرائع ابلاغ کی بات ہے اس ضمن میں کہا جاسکتا ہے کہ ماریشس میں ریڈیو پر اردو میں کئی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر بھی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ پرائمری سطح سے لے کر کالج تک کی پڑھائی میں اردو زبان کی قدر کی جاتی ہے۔ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر اور حکومت ہند کا شکر گزار ہوں جنھوں نے یہ عزت بخشی اور میں یہاں اس کانفرنس میں موجود ہوں۔ میں حکومت ہند سے مستحکم رابطے کا خواہش مند ہوں لہٰذا کونسل کے ڈائرکٹر اور حکومت ہند سے مودبانہ گزارش ہے کہ ماریشس میں اردو کی ترویج واشاعت میں آپ ہمیں تعاون دیں۔

وہاں کے اردو سیکھنے والے طلبا کے لیے ہندوستان آنے اور یہاں کے طلبا کے ساتھ بات چیت اور ثقافتی روابط کا بندوبست کیا جائے۔ میں کونسل سے درخواست کروں گا کہ ماریشس میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں آپ ہمیں ہر ممکن امداد فراہم کریں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی سہ روزہ عالمی کانفرنس کے تیسرے اور آخری دن مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل محترمہ اسمرتی ایرانی نے دس دنوں کے اندر کونسل کی تشکیل نو کرنے کا اعلان کیا۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی فروغ اردو کی کوششوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس عالمی اردو کانفرنس کے ذریعے پوری دنیا میں ہم اردو کے تئیں ایک مثبت پیغام دے رہے ہیں۔ انھوں نے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی لگن کی تعریف کی اور کہا کہ زبان ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے ملک کی تہذیب وثقافت میں شیرینی بھری جاسکتی ہے اور ملک کے

روبینہ فیصل، کناڈا

معصوم عزیز کاظمی، گیا

ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، دہلی

صدف مرزا، ڈنمارک

سید اقبال حیدر، جرمنی

دائیں سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، عبدالستار دلوی، سید امین حیدر، پروفیسر عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، سید تقی عابدی اور پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

اتحاد وسلامتی کو ہم قائم رکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کے ذریعے دی گئی تمام تجاویز کا استقبال کیا جائے گا اور وزارت برائے فروغ انسانی وسائل اردو کی ترویج وترقی میں ہر ممکن تعاون دیتی رہے گی۔ انھوں نے 21 فروری کو یوم مادری زبان کے طور پر منائے جانے کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قومی اردو کونسل بھی اس سلسلے میں ہمیں تجاویز اور مشورے بھیجے تاکہ ہم ان پر غور وخوض کر سکیں۔ انھوں نے نیشنل بک ٹرسٹ (NBT) کے ذریعے منعقد کیے جانے والے کتاب میلوں کی تعداد بڑھانے کی بھی بات کہی اور بنیادی سطح پر بھی اردو تعلیم کی یقین دہانی کرائی۔ انھوں نے اپنی بات علامہ اقبال کے اس مصرع پر ختم کی کہ: 'ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'۔

اس سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے گلدستہ پیش کر کے محترمہ اسمرتی ایرانی کا استقبال کیا۔ انھوں نے محترمہ وزیر کی خدمت میں ایک یادگاری مومنٹو بھی پیش کیا۔ انھوں نے ایک پاور پوائنٹ پریزینٹیشن کے ذریعے کونسل کی کارکردگی پیش کی۔ اس موقعے پر کمشنر برائے لسانی اقلیات پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو کی گنگوتری بھارت کی دھرتی ہے، اردو یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی، قومی اردو کونسل کی کوششیں فروغ اردو کے سلسلے میں قابل ستائش ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے محترمہ وزیر سے درخواست کی کہ ملک کے آئین کے مطابق اردو کو جائز مقام دلایا جائے اور بنیادی سطح پر اردو کو بحیثیت مادری زبان پڑھانے کا انتظام کرایا جائے۔ انھوں نے نیشنل بک ٹرسٹ میں اردو کے عملے کی بحالی پر بھی زور دیا۔ اس کے علاوہ اردو پڑھنے والے طالب علموں کو وقت پر اردو کی کتابیں دستیاب کرانے کی بھی گزارش کی ساتھ ہی اردو میڈیم اسکولوں میں اردو جاننے والے اساتذہ اور پرنسپل کی تقرری کی بھی سفارش کی۔ انکم ٹیکس کمشنر اور معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے کہا کہ اردو بنیادی طور پر ہندوستانی زبان ہے۔ انھوں نے بھی اردو کی بنیادی تعلیم پر توجہ دینے کی درخواست کی۔ عالمی کانفرنس میں پڑھے گئے تمام مقالوں پر مشتمل کتاب کا اجرا وزیر برائے فروغ انسانی وسائل محترمہ اسمرتی ایرانی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے جوائنٹ سکریٹری ایس ایس سندھو اور جواہر لعل نہرو یونیورسیٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس کے سپوری بھی موجود تھے۔

اس عالمی کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں کچھ اہم نکات زیر بحث آئیں ہیں جو اس طرح ہیں:

آئین ہند کے مطابق اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔ پرائمری سطح پر اردو کو بحیثیت مادری زبان پڑھائے جانے کا انتظام کرایا جائے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے عملے میں اردو جاننے والوں کی بحالی کی جائے۔ این سی ای آر ٹی کے تحت اردو کی کتابیں اردو میڈیم اسکولوں میں وقت پر مہیا کرائی جائیں۔ ان تمام نکات پر غور وخوض کیا جائے گا۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں حکومت جلد ہی پیش رفت کرے گی۔

قومی اردو کونسل کی اس سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کے آخری دن اردو صحافت اور ترجمہ، اردو کا تعلیمی اور انفوٹینمنٹ شعبوں میں رول کے موضوعات کے تحت سیشن منعقد ہوئے، جس میں ملک اور بیرون ملک سے آئے مختلف مندوبین اور اردوداں حضرات نے مقالے پیش کیے۔

پروفیسر نصیر احمد خاں، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، جناب زبیر رضوی اور پروفیسر وہاج الدین علوی کی صدارت میں منعقدہ ان اجلاس میں، ڈاکٹر محمد احسن (بھوپال)، ثوبان سعید (لکھنؤ)، مرزا حامد بیگ (پاکستان)، پروفیسر سجاد حسین (چینئی)، معصوم عزیز کاظمی (بہار)، ناصر ناکاگاوا (جاپان)، عنایت حسین عیدن (ماریشس)، محترمہ روبینہ (کناڈا)، پروفیسر زماں آزردہ (سرینگر)، محترمہ صدف مرزا (ڈنمارک)، پروفیسر صغیر افراہیم (علی گڑھ)، سہیل احمد فاروقی (دہلی)، پروفیسر ابن کنول (دہلی)، ڈاکٹر اطہر فاروقی (دہلی)، مظفر شہ میری (حیدر آباد) وغیرہ نے اپنی بیش قیمت گفتگو اور مقالات سے حاضرین کو زبان کے تئیں مثبت پیغامات دیے۔ ■

Abdul Hai

## دوسری عالمی اردو کانفرنس

# کلیدی خطبہ

پروفیسر شمیم حنفی

زبانیں بھی انسانوں کی طرح سفر کرتی ہیں۔ اور اس وقت جب ہم اکیسویں صدی کے دوران اردو کے سماجی اور ثقافتی فروغ سے وابستہ سوالوں کا جائزہ لینے کے لیے یکجا ہوئے ہیں، ہمیں سب سے پہلے اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا کہ بیسویں صدی کے خاتمے تک اردو نے کون سی منزلیں سر کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اکیسویں صدی خلا میں نہیں پیدا ہوئی۔ اسے بیسویں صدی نے جنم دیا ہے اور اپنے لگ بھگ ہزار برس کے سفر میں اردو زبان اور ادب کی روایت ہماری مشترکہ تہذیب اور تاریخ کے ایک پر پیچ مرحلے سے گزر کر موجودہ دور کی دہلیز تک پہنچی ہے۔

ہمارے لیے بیسویں صدی تاریخ کی سب سے پر تشدد اور پریشان کن صدی تھی۔ اس صدی کے دوران ہم نے بہت خواب دیکھے اور خوابوں کی پامالی کا ایک ہولناک تماشہ بھی دیکھا۔ اس صدی کے دوران ہم نے بہت کچھ کھویا اور شاید بہت کم پایا۔ ہمیں آزادی بھی ملی تو خون میں نہائی ہوئی۔ انسانی تاریخ کی ہجرتوں میں ایک سب سے بڑی اجتماعی ہجرت کا تجربہ بھی ہمارے حصے میں آیا۔ اس تجربے نے بھی اردو کے لیے ایک نئی مشکل اور کئی سوالات پیدا کیے۔ اکیسویں صدی کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد بھی ان سوالوں کی آنچ برقرار ہے۔ اس کانفرنس کے کانسیپٹ نوٹ کا یہ جملہ مجھے بے چین کرتا ہے کہ ''اردو بولنے والوں کو ہندوستان کے قومی دھارے میں لانے اور ان کی سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی خواہشات کے لیے اردو میں نئے پروگرام کا آغاز کیا جائے۔''

اس غلط فہمی پیدا کرنے والے مسئلے پر تفصیل سے کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے۔ پھر بھی دو باتوں کی نشاندہی ضروری ہے۔ پہلی تو یہ کہ ہندی کی طرح اردو کا علاقہ بھی بڑی حد تک مبہم ہے اور بنیادی طور پر اس مسئلے کو شمالی ہندوستان کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جانا چاہیے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اردو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ ویکرم محمد بشیر کی زبان ملیالم تھی۔ قاضی نذر الاسلام کی زبان بنگالی۔ غلام محمد شیخ گجراتی میں لکھتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کی زبان سندھی تھی۔ بلّھے شاہ اور وارث شاہ نے اپنے اظہار کا وسیلہ پنجابی کو بنایا تھا۔ سلمیٰ تمل میں لکھتی ہیں۔ ہمارا یہ رنگا رنگی ملک اور معاشرہ تو تقریباً دو درجن زبان اور بے شمار بولیوں کی ملی جلی فضا میں سانس لیتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور سچائی جسے بھلانے کا کوئی جواز نہیں اردو کی ہندوستانیت یا 'قومی دھارے' سے متعلق ہے۔ 1947 کی تقسیم سے پیدا ہونے والی کڑواہٹ اور شدید جذباتیت کے دور میں ایک پاکستانی دانشور نے بہت صاف لفظوں میں کہا تھا:

''اردو زبان سے عظیم تر کوئی چیز ہم نے ہندوستان کو نہیں دی۔ اس کی قیمت تاج محل سے بھی ہزاروں گنی زیادہ ہے۔ ہمیں اس زبان پر فخر ہے۔ ہمیں اس کی ہندوستانیت پر فخر ہے اور ہم اس ہندوستانیت کو عربیت یا ایرانیت سے بدلنے کو قطعاً تیار نہیں ہیں، اس زبان کے لب و لہجے میں اس کے الفاظ اور جملوں کی ساخت میں ہماری بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں اور ہم نے مانجھ مانجھ کر اس زبان کی ہندوستانیت کو چمکایا ہے۔''

محمد حسن عسکری (جھلکیاں)

لیکن یہ 'ہندوستانیت' بھی کسی بندھے ٹکے مفہوم کی پابند نہیں ہے۔ زندہ، متحرک اور طاقتور تصورات بہتے ہوئے پانی کی طرح کسی ایک دائرے میں گردش نہیں کرتے۔ جس

پروفیسر شہاب عنایت ملک، جموں

نصرت ظہیر، دہلی

محمد احمد عبدالرحمٰن، مصر

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، میرٹھ

نعمان وحید بخاری، کناڈا

طرح کوئی بھی شخص ایک ندی میں دو بار نہیں نہا سکتا، اسی طرح ہر آن بدلتی ہوئی، بکھرتی اور بنتی ہوئی دنیا کے ساتھ چیزوں کی طرح خیالات کی حقیقت بھی کبھی یکساں نہیں رہتی۔ ہماری 'ہندوستانیت' کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ ہے کہ اجتماعی زندگی اور تاریخ کی تجربہ گاہ میں اس نے کبھی صداقت اور سچائی کی ایک شکل پر اصرار نہیں ہے۔ پراچین بھارت کی ہندوستانیت، اس کے بعد ہماری سرزمین پر بیرونی تصورات اور تہذیب کی آمد کے ساتھ نئے سرے سے رونما ہونے والی ہندوستانیت اور پھر انیسویں صدی کے نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ایک جدید، حقیقت پسندانہ اور سائنسی ہندوستانیت کے فروغ نے ہمارے اجتماعی کلچر کو اور ہمارے خیالوں اور قدروں کے موسم کو کبھی ایک دائرے کا قیدی نہیں رہنے دیا۔ ہماری ہندوستانیت کا لیدا اس اور کبیر اور میر اور نظیر اور غالب اور اقبال اور ٹیگور سے ہوتی ہوئی ہماری زندگی اور تجربے اور پہچان کا حصہ بنی ہے۔ اس کے کئی روپ ہیں اور کئی رنگ جو صبح سے شام تک، دھوپ چھاؤں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا منظر نامہ ترتیب دیتے رہتے ہیں۔ مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی تاریخ پندرہویں صدی عیسوی کے ساتھ شروع ہوئی۔ مگر ذہنی بیداری اور نشاۃ ثانیہ کا سلسلہ اس سے بہت پہلے لکھی ہوئی یا Recorded تاریخ سے بھی یہ پہلے شروع ہو چکا تھا۔ البیرونی اور امیر خسرو، اشوک اور اکبر، نانک اور کبیر اور میر اور غالب یہ سب اسی ذہنی بیداری، اسی جاندار اور حرکت پذیر ذہنی بیداری کی نت نئی صورتیں ہیں۔ یہ سفر اور سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

بیسویں صدی سائنس کے نازِ بے جا کی صدی تھی، جب جدید سائنس نے ہمارے صدیوں کے تربیت یافتہ معاشرے میں ایک نیا ارتعاش پیدا کیا۔ اسی صدی کے دوران سائنس کا غرور بھی ٹوٹا اور ہمارے بہت سے خواب بکھرے۔ دو عالمی جنگیں اور ہمالیہ سے کنیا کماری تک پھیلی ہوئی سرزمین کی عجلت پسندانہ تقسیم ہماری اجتماعی تاریخ اور زندگی کے لیے بہت بڑے سانحے تھے۔ چیزیں کتنی نیک نیتی کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بدلنے کے ساتھ ساتھ بگڑ بھی جاتی ہیں اس بھید کو سمجھنے کے لیے ہمیں زمانے کی ہر کروٹ کے بعد اپنی سرخوشی اور اپنی اداسی کو ذرا غور سے دیکھنا ہوگا، اپنے اندیشوں اور اپنے امکانات کا پھر سے جائزہ لینا ہوگا، اپنے باہر کی دنیا کو صاف کرنے کے ساتھ اپنے اندر کی دنیا کو بھی صاف کرنا ہوگا۔ زندگی کی صفائی کا دارومدار ذہن کی صفائی پر ہے اور اس عمل کے دوران ہم طرح طرح کے تجربوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ٹھٹھک کر اور ٹھہر کر رہ تو نہیں جاتے۔ ہم اپنے مسئلوں اور مشکلات کا حل اپنے سفر کی سرکردہ منزلوں کے بجائے دراصل اپنے آئندہ اور اگلے قدموں کے ساتھ آنے والی زندگی کے امکانات اور وسوسوں میں، خوابوں میں اور ارادوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ اب ہمارے سامنے بیسویں صدی کی سائنس کے علاوہ اکیسویں صدی کی ٹکنالوجی کا سیلاب بھی ہے۔ ہمیں اسی موجودہ زندگی اور آنے والی زندگی، دونوں کے چیلنجز کا سامنا ہے۔

شام لال کے لفظوں میں:

"Preparing for the twenty first century therefore, means little apart from coming to grips with the current challenges. (The Future is Bad News)

اس سطح پر اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کا معاملہ لگ بھگ ایک جیسا ہے، ایک سانجھا درد جس کی آنچ کہیں ہلکی ہے کہیں تیز، مگر اس کے آزار سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ Infotech Society کے مسئلے ہمارے ملک میں مغربی ملکوں کی بہ نسبت مختلف ہیں۔ میں اطلاعاتی انقلاب یا انفارمیشن انقلاب کو محض فریب نظر محض سراب یا Mirage یا عہدِ حاضر میں انسان کے ٹکنالوجیکل کامرانی اور اخلاقی بے حسی یا روحانی زوال کا اعلانیہ نہیں سمجھتا۔ خبر رساں اور عوامی تفریح کے شعبے میں اس ٹکنالوجی کی افادیت تسلیم، گرچہ سماجی مفکروں کا ایک حلقہ خبر رساں کے پھیلتے ہوئے جال اور اس پورے انفارمیشن نیٹ ورک (Network) کو Garbage information کا سادھن بھی سمجھتا ہے۔ ہم اس حد تک نہ جائیں، پھر بھی اس سچائی سے انکار تو نہیں کر سکتے کہ سامراجی اور سرمایہ دارانہ سیاست کے پھیر میں انفارمیشن ٹکنالوجی Mis information کی ترویج اور ترقی کا ایک ذریعہ بھی بن گئی ہے۔ ہمارے زمانے کے تمام سوچنے والے ذہن اس ترقی سے بہت خوش اور مطمئن نہیں ہیں۔ کیونکہ انسانی تہذیب اور ثقافت کی تعمیر کے وسیلے صرف مادی اور ٹکنالوجیکل نہیں ہوتے۔ ڈیوڈ لیونس (David Lyons) کا خیال ہے The information Soceity, Polity Press 1990) ) کہ ایک سچائی جو ہمیشہ یاد رکھی جانی چاہیے یہ ہے کہ کمپیوٹر کی تشکیل بھی ایٹم بم اور میزائل کی طرح فوجی اسٹیب لشمنٹ کی تحریک پر ہوئی تھی۔ اسی لیے سائنس پر مبنی فلاحی ریاست (Science-based War fare State) نے بہت جلد ایک سائنس پر مبنی جنگی ریاست (Science-based Welfare State) کی حیثیت اختیار کر لی۔ بقول شخصے انفارمیشن ٹکنالوجی کا لایا ہوا ذہنی انقلاب ایک مہیب ڈیٹا بینک تو تیار کر سکتا ہے، لیکن اس کے توسط سے کیا انسان یہ بھی جان سکے گا کہ اپنے اجتماعی سفر میں اس سے بھول کہاں ہوئی اور چیزیں مسلسل بگڑتی کیوں جا رہی ہیں؟ یہ سوالات ہماری اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور صرف اردو زبان کے مسئلوں پر بات چیت میں ان پر سوچ بچار کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہے۔ لیکن جب ہم اردو کو ایک تہذیبی علامیے کے طور پر دیکھتے ہیں تو ہمیں ان تبدیلیوں کے سلسلے میں بھی محتاط اور چوکنا رہنا چاہیے جو ایک نئی زندگی سے وابستہ ہیں اور ہمارے چاروں طرف رفتہ رفتہ اپنا اثر پھیلا رہی ہیں۔

یہ داستان طولانی ہے، مگر اسے ختم تو کرنا ہی ہے اس لیے میں یہاں اپنے ایک مرحوم دوست اور ہندی کے مشہور سم کالین کوی ½ledkyhu dfo ½سرویشور دیال سکسینہ کی ایک نظم کے ان تین مصرعوں پر اپنی بات ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

نڈر آگے بڑھو
تمھاری راہ میں چھوٹا سا
بانس کا پُل ہے—
بانس کے اس پُل کا ایک نام اردو بھی ہے!

■

ڈاکٹر محمد کاظم، دہلی

ڈاکٹر محمد احسن، بھوپال

ڈاکٹر ثوبان سعید، لکھنؤ

ڈاکٹر مشتاق احمد، دربھنگہ

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، وارانسی

صغیر افراہیم

# قومی اردو کونسل اور 'بچوں کی دنیا'

اردو دوستوں کی مسلسل عملی جدو جہد کی بدولت اب حکومت اور عدالت دونوں سطحوں پر اردو زبان کی تعلیم کے تئیں کچھ اعلانات کیے جارہے ہیں۔ یہ نیک شگون ہے۔ اس کے لیے ہم اُن تمام محبانِ اردو کے ممنون ہیں جنھوں نے اَن گنت کوششیں کیں۔ اُن کی کاوشیں رنگ لارہی ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہماری ذمے داری اس لیے اور بھی بڑھ جائے گی کہ سرکاری کام کاج میں تبدیلی پیدا ہوگی۔ اشتہارات، احکامات اور گشتی مراسلات کی تعداد بھی بڑھے گی۔ توجہ اس پر مرکوز کرنی ہوگی کہ اردو میں درخواستوں کو لکھنے اوران کے جوابات دینے والوں کا حلقہ وسیع ہو۔ اس کے لیے ہمیں اردو کو گھروں اور اسکولوں سے براہِ راست جوڑنا ہوگا۔

آج بھی بیشتر ہندوستانی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ مسئلہ لکھنے اور پڑھنے کا ہے۔ اس کا حل محض سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر کرا لینے سے پورا نہیں ہوگا بلکہ ہمارا یہ فرض ہوگا کہ پرائمری سطح سے اعلیٰ درجات تک اس سے وابستہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے مثبت اقدام کریں۔ مثلاً دفتروں اور اداروں کی فضا کو اردو کے حق میں سازگار بنانے کے ساتھ ساتھ والدین کے ذہنوں کو ہموار کرتے ہوئے بچوں کو اردو سکھانے کا جتن کریں۔ شاید یہ دور اس اعتبار سے اچھا کہلائے کہ بچوں کے لیے جدید ٹکنالوجی پر مبنی دلچسپ کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ ماضی میں جس یکسوئی سے یہ کام ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، اسمٰعیل میرٹھی، شفیع الدین نیرؔ وغیرہ نے کیا تھا، عصر حاضر میں یہ فریضہ افراد کے علاوہ مختلف تنظیمیں اور ادارے بھی اُسی دلجمعی سے انجام دے رہے ہیں۔ نئی نسل کی ذہنی تربیت اور اردو کے فروغ میں قومی اردو کونسل قابلِ ستائش ہے۔ مرکزی حکومت کا یہ ادارہ بدلتی ہوئی قدروں اور نت نئی ایجادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت کارآمد کتابیں شائع کررہا ہے۔ میں اپنی بات کو شعبۂ اطفال اور قومی اردو کونسل تک محدود رکھنا چاہتا ہوں بلکہ کونسل کے ذمے داران کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ وہ ایسی تکنیک کو بروئے کار لارہے ہیں جو بچے کے ذہن کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرتے ہوئے اسے دلی خوشی اور سکون بھی مہیا کرتی ہے۔ اب غالب، اقبال اور حالی کی شاعری کے علاوہ چار درویشوں کا قصہ، فسانۂ عجائب اور بوستان کی کہانیاں بھی بچوں کی پسندیدگی میں شامل ہیں۔ نظمیں، غزلیں، گیت اور نثری قصے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی فخریہ پیش کش ہیں۔

بچوں کی تعلیم وتربیت کے تعلق سے 'پیامِ تعلیم'، 'میزانِ تعلیم'، 'گلدستۂ تعلیم'، 'نئی پھلواری'، 'شگوفہ'، 'اچھا ساتھی' وغیرہ نے بڑی ہلچل پیدا کی ہے۔ قومی کونسل نے بھی اس جانب بھرپور توجہ دیتے ہوئے رسالہ 'بچوں کی دنیا' جاری کیا جو حلقۂ اطفال میں سنگِ میل ثابت ہوا ہے۔ یہ رسالہ سب سے زیادہ خوبصورت اور دیدہ زیب ہی نہیں بلکہ معیار و میزان کے اعتبار سے بھی بچوں کی دنیا میں چھا گیا ہے۔ اس میں عجیب و غریب خبریں ہیں، دلچسپ کہانیاں ہیں، معلوماتی مضامین ہیں، ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہیں۔ رسم و رواج، تیج تہوار کے علاوہ مذہب، تہذیب، تمدن، ثقافت اور صحافت کے تعلق سے بھی بہت کچھ ہے۔ ایسے شگوفے اور دماغی ورزش کے اسباق کہ ہیری پوٹر کے واقعات بھی ماند پڑ جائیں۔ کوئز، بیت بازی کے علاوہ اردو ایس ایم ایس اور فیس بک وغیرہ کی جدید جانکاری بھی اس سے ملتی ہے...... حیرت اس پر ہے کہ طلب اور استطاعت کے باوجود دائرے کو پورے ملک میں وسعت کیوں نہیں دی جارہی ہے؟ جبکہ آسام ہو یا ممبئی، کشمیر ہو یا کیرل اردو حلقہ 'بچوں کی دنیا' کے گیت گا رہا ہے۔ اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں نے ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' کے حلقے کو بڑھانے کے لیے ملک کے دور دراز علاقوں سے رابطہ قائم کیا تو محمد اظفر خاں (ممبئی)، ڈاکٹر یحییٰ خاں (کیرالہ)، ڈاکٹر شمسہ عارف (بھوپال)، محمد عبدالمنان (کٹیہار)، مولانا احسن المظفر (کولکاتا)، ڈاکٹر محمد ہارون (مالیگاؤں)، ڈاکٹر عبدالعلی (گوہاٹی)، ڈاکٹر شبانہ رفیق (باندہ)، ظفر احمد (جھانسی)، ڈاکٹر محمد انیس (اناؤ) جیسے کئی معتبر حضرات کو شکوہ ہے کہ مطالبے کے مطابق مطلوبہ تعداد میں رسالہ 'بچوں کی دنیا' اُن تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ شاید وجہ یہ ہو کہ رسالہ کم تعداد میں

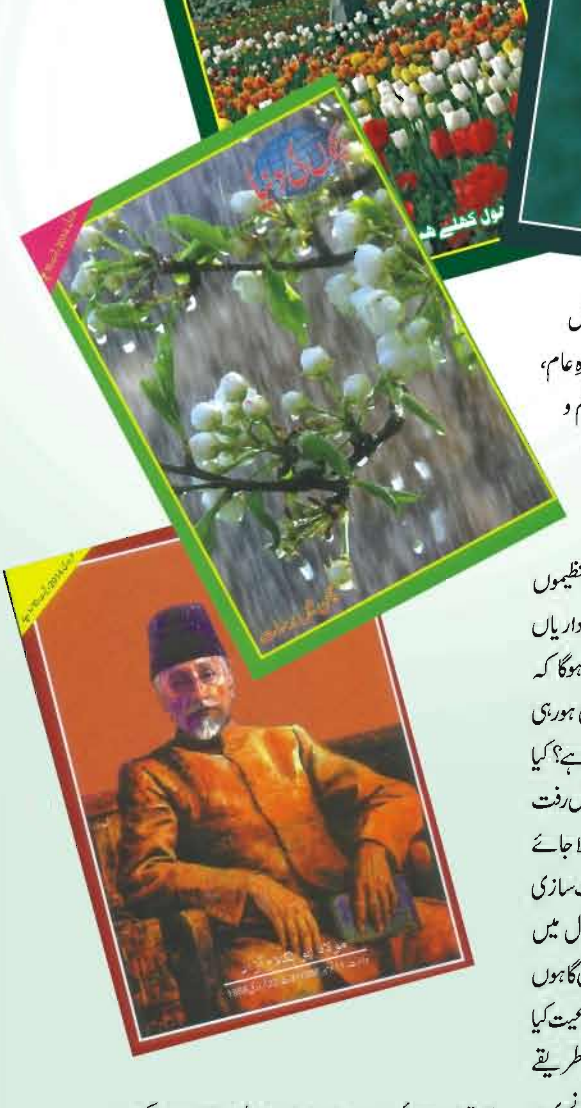

چھپ رہا ہے۔ کچھ ایسی ہی شکایت ابھی پچھلے ماہ یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج، اے ایم یو، علی گڑھ میں ریفریشر کورس کے لیے آئے اساتذہ نے بھی کی۔ ان کی درخواست پر رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ واقعی قاری کی مانگ کے لحاظ سے اشاعت نہیں ہے۔ اضافے کے سوال پر پس وپیش کی کیفیت محسوس کی کہ مرحلہ مشکل ہے۔ اس کے علاوہ لاشعوری طور پر یہ بھی خدشہ لاحق ہو رہا ہے کہ جس برق رفتاری کے ساتھ مذکورہ بالا رسالہ نونہالانِ وطن کے ذہنوں کی تربیت کر رہا ہے کیا وہ اسی تسلسل کے ساتھ اپنا معیاری وجود قائم رکھ پائے گا؟ اس کا معیار قائم رہنا اس لیے بھی لازمی ہے کہ یہ بچوں کی ہی نہیں اساتذہ کی بھی تربیت کر رہا ہے، انھیں جدید ترین ایجادات سے روشناس کراتے ہوئے ماضی کے مثبت اور خوشگوار واقعات سنا رہا ہے۔ اس میں ایسے رنگا رنگ اسباق ہیں جو ذہنی نشوونما، ملک کی سالمیت اور قومی یکجہتی کے لیے بے حد معاون ہیں۔

ہم سب اس سے بخوبی واقف ہیں کہ طلبا قوم کا مستقبل اور ملک کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس لیے ان کی معقول تعلیم، صحیح تربیت، اچھی پرورش، سلیقہ مندانہ نگہداشت اور ڈسپلن کا پابند بنانا استاد کا فرض ہے۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق مثبت اور صحت مند پرداخت سے نونہالانِ وطن مہذب انسان اور باوقار شہری بن سکتے ہیں تب کہیں جاکر اُن کے ذریعے ملک و قوم کی ترقی کی امید کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اساتذہ کے لیے بدلتے ہوئے منظرنامے کے تحت طلبا کی ضرورتوں اور اُن کی نفسیات کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونا از حد ضروری ہے۔ شعبۂ تعلیم کے تئیں ماضی قریب کی ہدایات نے دورِ حاضر میں اس کی اہمیت اور افادیت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ جدید ترین تعلیمی نصاب کے نسخۂ مجرب نے زندگی کے مختلف شعبوں کا احاطہ کر لیا ہے اور انسانی ذہن کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے لیے آج اس سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔

کالج میں داخل ہونے والے طلبا سے زیادہ آج اسکول کے بچوں پر بھرپور توجہ دینا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ ان کے ادب کی شکل ایک علیحدہ اور مستقل حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ کل دنیا میں بچوں کے ادب کو جو منفرد مقام حاصل تھا وہ صرف ادیبوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا لیکن بدلے ہوئے عالمی پس منظر میں بچوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بچوں کے ادب میں انٹرنیٹ سے وابستہ جدید ترین اطلاعات اور ذہنی ورزش کے سوال نامے کو بھی عملی طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔ عالمی پس منظر میں اس کی اہمیت کو شدت سے تسلیم کیا جا رہا ہے کہ بچوں کے لیے ایسا بامعنی اور آسان مواد مہیا کیا جائے جو اُن کی سیرت سازی میں موثر اور مفید ہوتا کہ بچوں کے ذہن پر انصاف، فرض شناسی، ایفائے وعدہ، محنت کی روزی، حسنِ سلوک، رفاہِ عام، ذہانت، شجاعت، مساوات، وفاداری، پاسداری، علم و فضل کی عظمت، روشن خیالی جیسے اوصاف کا نقش مرتسم ہو سکے۔

ایک بات اور کہ آج بچوں کے ادب کو سرکار کی ذمے داری میں شامل کیا گیا ہے۔ ایسے میں تنظیموں اور اداروں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادیبوں کی ذمے داریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ بچوں کے ادیبوں کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہمارے عہد میں عالمی نظریات کیا ہیں؟ کیا کاوشیں ہو رہی ہیں؟ اور ہمارے یہاں ان کی کتنی ضرورت و اہمیت ہے؟ کیا ہم پیش آئند مسائل کو بخوبی اُجاگر کر رہے ہیں؟ اس پیش رفت میں بامعنی، بامقصد اور دلچسپ ادب کو اس طرح ڈھالا جائے کہ وہ بآسانی مطالعے کے ساتھ ساتھ بچوں کی شخصیت سازی میں بھی پوری طرح معاون ہو۔ موجودہ صورتِ حال میں دانشورانِ قوم کو دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں سے وابستہ دانش گاہوں میں جو بچوں کا ادب شاملِ نصاب ہو رہا ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ معیار کیسا ہے؟ منزل تک جلد پہنچنے کے کیا طریقے اختیار ہوئے ہیں؟ یہ سب اس لیے کہ آج عالمی پیمانے پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بچوں کی ایک الگ دنیا ہے۔ اس لیے اُن کے ذہن کو زیادہ متاثر کرنے والے مواد کی ضرورت ہے جس کو مرکزی حکومت کا ادارہ قومی اردو کونسل بخوبی مہیا کر رہا ہے۔ 'بچوں کی دنیا' کے مطالعے سے بچوں کو سچی خوشی، ذہنی تسکین اور منزل کی جانب بڑھنے میں مدد مل رہی ہے۔ قومی اردو کونسل کا یہ قدم ہر اعتبار سے قابلِ قدر اور قابلِ ستائش ہے۔ کاش مضمون نگار بھی اسی یکسوئی اور دلجمعی کا مسلسل مظاہرہ کرتے رہیں اور ان اسباق سے متاثر ہو کر اساتذہ اپنے عزم کو اور بھی مستحکم کریں۔ کیوں کہ بچوں کے اندر غور و فکر اور کرید و تجسس کی مثبت صلاحیت کو بروئے کار لانا ہوگا۔ محبت، مساوات اور درگزر کے جذبے کو فروغ دینا ہوگا۔ ان کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنی ہوگی۔ ایسا تبھی ممکن ہے جب منظم خاکے کے تحت ابتدائی درجات میں سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے پر توجہ دلائی جائے۔ ایسی توجہ جس میں ذہنی مشق زیادہ ہو اور دلچسپی بھی برقرار رہے...... اس مقصد کے لیے میری نظر میں سب سے مناسب رسالہ 'بچوں کی دنیا' ہے۔ لہٰذا قومی اردو کونسل کے ذمے داران کو اس کی اشاعت بڑھانے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ جب تک اس کی اشاعت میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے اُس وقت تک اردو طبقے کا یہ فرض ہے کہ وہ اسکولوں، دیگر تعلیمی اداروں اور شہر کی لائبریریوں میں 'بچوں کی دنیا' منگانے کا اہتمام کریں یا اپنا رسالہ پڑھنے کے بعد وہاں پہنچا دیں تاکہ اس رسالے تک زیادہ سے زیادہ بچوں کی رسائی ہو سکے۔

■

**Prof. Saghir Afraheim**, Editor 'Tehzeeb-ul-Akhlaq', Dept. of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202001 (UP)

کرشن بھاوک

# اردو شاعری میں روزمرہ

اردو میں اسلوب یا مواد کی سطح پر دیکھا گیا ہے کہ اکثر شعرا عام بول چال کی زبان میں مستعمل فقروں کو بروزن پا کر یا پھر عربی فارسی کی بحراں کے اوزان میں ڈھال کر چست و درست کر کے اپنے اشعار کو وقیع و مستند بنانے میں رغبت کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ عام بول چال کی اسی زبان کو اردو زبان میں 'روزمرہ' کا بھی نام دیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں روزمرہ کے امثال یک جا کرنے سے قبل چند لغات کے حوالے سے لفظ 'روزمرہ کے مختلف معنوں پر غور کرلیا جائے۔ سید احمد دہلوی نے فرہنگِ آصفیہ (جلد دوئم) میں لفظ 'روزمرہ' کے یہ معنی دیے ہیں: ن۔ صفت ((1 ہر روز، ہمیشہ، بلا ناغہ، برابر، متواتر، آئے دن (2 اسم مذکر) ہر روز کی گفتگو۔ بول چال، بات چیت، محاورہ، اصطلاح ((3 تکیہ کلام، سخن تکیہ (ص 1050) محمد مصطفی خاں مداح نے 'اردو ہندی شبد کوش' میں لفظ 'روزمرہ' کے یہ معنی دیے ہیں: پرتی دن، ہر روز نتیہ پرتی (ص 585) اِسی طرح پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ سے ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل و پروفیسر کلونت سنگھ نے 'فارسی پنجابی لغت' میں لفظ 'روزمرہ' کے یہ معنی دیے ہیں: ''ہر روز، نِتا پرتی، سدا، وہ شبد، جو نِت بولے جاندے ہن، وہ چیز، جو ہر روز ملے۔'' ایڈیشن سنہ 1996، ص 378

اِس لفظ کے عین برعکس قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے نومبر سنہ 1905 میں شائع اور نصیر احمد خاں کی لغت کی جلد دوم میں ہندی لفظ 'بول چال' کے معنی دیتے ہوئے کہا گیا ہے۔ بات چیت، اندازِ گفتگو (مو، اسم، ہ) اب ہم اردو شاعری میں مستعمل روزمرہ یا بول چال میں محاورے کی نشاندہی کریں گے، تاکہ قارئین کو اس امر کا مکمل یقین ہو سکے کہ عوام آئے روز جو بھی بات چیت کیا کرتے ہیں، وہ بھی لاشعوری طور پر بسا اوقات بروزن بھی ہوا کرتی ہے اور نہ ہونے کی بھی صورت میں چند الفاظ کے رد و بدل سے یا تو بروزن شعر کا بذاتِ خود ایک مصرع بن جایا کرتی ہے یا معمولی سی محنت سے وزن سے ایک بروزن شعر یا مصرع کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ تحقیق و مطالعے کے پیشِ نظر اِس مختصر مقالے کو آگے چند عنوانوں کے تحت دیا جارہا ہے:

### 1. خدا کا وجود:

شعرا نے اس دنیا کے خالق اور اس کی نایاب تخلیق، دنیا کے بارے میں بطور شکرانہ لوگوں کی عام گفتگو سے بھی استفادہ کیا ہے اور اکثر سہل ممتنع میں شعر کہا ہے، مثلاً خواجہ میر درد کا شعر ہے ''جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا/ تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا'' ٹی این راز کا بھی شعر ہے۔ ''بیٹھا کہیں پہ سب کو نچاتا ہے رات دن/ کٹھ پتلیاں ہیں ہم تو فقط اس کے ہاتھ کی'' جب بھی کچھ نیک و بد واقع ہوتا ہے، انسان کا سر فلک کی

جانب اٹھ جایا کرتا ہے، جون ایلیا کا یہ بہترین شعر: ''یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو/کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا؟'' اِسی طرح حسنین مصطفیٰ آبادی انسانوں کی فطری عادت پر طنز کرتے ہوئے یہ شعر فرماتے ہیں: ''ہر ایک کام کی خاطر ہے وقت بندے کو/نہیں ہے وقت تو خالق کی بندگی کے لیے۔'' وسیم بریلوی کا یہ جاندار شعر خدا کے وجود پر سوالیہ نشان لگانے والوں کے بارے میں ہے۔ ''سلیقہ ہی نہیں شاید اُسے محسوس کرنے کا/ جو کہتا ہے خدا ہے تو نظر آنا ضروری ہے۔'' مایۂ ناز سائنس دان تک خدا کے وجود سے منکر نہیں رہے ہیں۔ اصل میں اشعار کے مقصود و مفہوم کی پوشیدگی سے بھی فن شاعری میں ہمیشہ گیرائی و گہرائی در آیا کرتی ہے۔

**2.عاشقانہ طرز گفتگو:**

اکثر عشق کے یہ دونوں طائر باہم بات چیت کے دوران ایسے ایسے جملے بول جایا کرتے ہیں، جن کو شاعر بہ آسانی ایک شعر میں ڈھال لیا کرتے ہیں، مثلاً محمد باعشن مغموم کلکتوی کے اس شعر پر غور فرمائیں: ''یہ ٹھیک ہے کہ ہم سے بہت بات مت کرو، لیکن یہ کیا کبھی بھی ملاقات مت کرو۔'' (رسالہ 'ادبی محاذ' شمارہ جنوری تا مارچ ص 71) بہت برس قبل کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بھی اِسی سے مشابہت رکھنے والا یہ شعر کہا تھا۔ ''ہم سے ترکِ تعلقات سہی، یہ مگر کیا کہ بات بھی نہ کرو۔'' (کلیاتِ سحر، 2012، ص184)

میر تقی میر نے کہا تھا ''یوں اٹھے اس گلی سے ہم اے میرا/ جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے'' کراچی کے شاعر رومانہ روم ایک عام آدمی کے لہجے میں یہ شعر کہتے ہیں۔ ''ہے زخم زخم بدن پھر بھی اے میرے ہمدم/تم ایک بار ذرا مسکرا کے دیکھو تو۔'' اور اسی انداز میں فیض نظام رامپوری بھی رقم طراز ہیں۔ ''مجھے اس طرح نہ دیکھو، مجھے اس طرح نہ چاہو/ مری آنکھ بھر نہ آئے/ مری سانس رک نہ جائے۔''

عارف احمد کا یہ شعر بھی روزمرہ کی زبان میں کہا گیا ہے۔ ''دیتی ہے پتہ اڑتی ہوئی گرد کی خوشبو/ شاید وہ ابھی گزرے ہیں اس راہ سے گزرے سے۔'' اور عبداللہ ساجد فرماتے ہیں کہ ''آپ کو انکار ہے میری محبت سے مگر/ کہہ رہے ہیں آپ ہی کا لوگ دیوانہ مجھے۔'' راجیش آنند اسیر کا شعر دیکھیے۔ ''آ جایئے جب یاد ہماری کبھی آئے/ اب بھی وہی دیواریں ہیں/ وہ در نہیں بدلے۔'' ذوق کا ایک شعر محبوب سے کہے جانے والے الفاظ کی گویا یوں ترجمانی کر رہا ہے۔ ''آنے سے میرے ٹھہر گئے آپ وگرنہ/ جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا۔'' مہندر پرتاپ چاند نے ایک محبوب کی جدائی کا منظر یوں قلم بند کیا

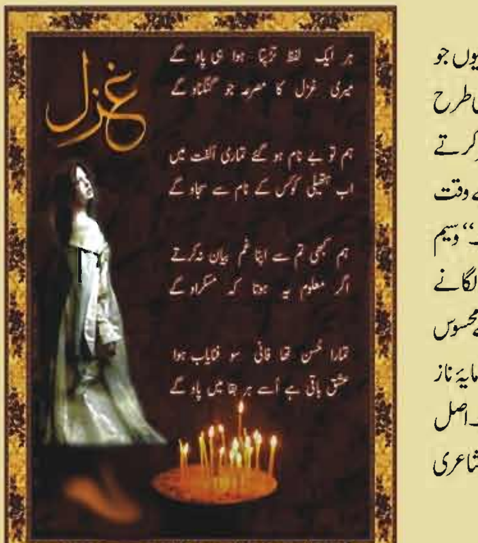


ہے۔ ''وقتِ رخصت کا منظر کہ میں دیر تک/ ہاتھ اپنا ہوا میں ہلاتا رہا۔'' عاشقوں کو اپنے محبوب اکثر عجلت میں ہی دکھائی دیا کرتے ہیں۔ بقول محمد کلیم ضیا ''آ کے بیٹھے بھی نہیں ٹھیک سے اور چل بھی دیے/ جب بھی آتے ہو تو آتے ہو ہوا کی صورت۔'' ایسا لگتا ہے کہ لفظ بہ لفظ ایک عاشق کا یہ اپنے محبوب سے براہِ راست خطاب ہی ہو رہا ہے۔ منوہر وجے کے اگلے شعر میں بھی یہی خاصیت عاشق پر طاری ہے۔ ''آپ کے جانے سے ہوتی تو ہے تکلیف بہت/ آپ کے آنے سے آرام بھی آ جاتا ہے۔'' اور اگلے شعر میں بھی شاعر کو کم از کم مشقت کرنی پڑی ہوگی ''وہ چائے پی رہا تھا کسی دوسرے کے ساتھ/ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی کچھ جھینپ سا گیا۔'' ایسے اشعار کی وسعتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایسے فقرے کسی بھی شخص کو مخاطب کر کے کہے جا سکتے ہیں۔ خواجہ میر درد کے یہاں ایسے نثری نوعیت کے اشعار کی افراط ہے: ''جی کی بس جی میں رہی، بات نہ ہونے پائی/ ایک بھی اُس سے ملاقات نہ ہونے پائی۔'' اور قائم چاند پوری کی عام زندگی اور بات چیت سے منسلک یہ شعر بھی ملاحظہ کر کے لطف اندوز ہوں۔ ''در دِل کچھ کہا نہیں جاتا/ آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا۔'' موجودہ وقت کے شاعروں کے اسی نوعیت کے چند اشعار اور ملاحظہ کریں:

میں روٹھنا چاہوں بھی تو کیا سوچ کے روٹھوں
اس کو تو منانے کا ہنر بھی نہیں آتا

عادل شعوری

ہمارے یار جو روٹھے ہوئے ہیں
گلے ان کو لگانا چاہتے ہیں

نثار احمد نثار

چھوڑ کر جب وہ جارہا تھا
روک لینا تھا راستہ اس کا

فاروقی جائسی

ناصر کاظمی کا یہ شعر تو ایک دم باہمی مکالمے میں ہی ڈھلا رکھا ہے۔

بھول بھی جاؤ بیتی باتیں
ان باتوں میں کیا رکھا ہے''

عدیم ہاشمی کا یہ شعر بھی تو اسی راہ پر گامزن نظر آسکتا ہے:

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی شاعری میں قربتوں کے مواقع بیشتر جگہوں پر نظر آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ شعر قابل غور وفکر ہے:

آتے آتے ہی تقاضا ہے چلے جانے کا
آیئے بیٹھیے سرکار یہ کیا بات ہوئی

اکبر الہ آبادی کا مقبولِ عام شعر ہے:

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

اس نوعیت کے اشعار مرزا داغ اور غالب کے یہاں کثرت سے ملتے ہیں۔

**3.مناظر فطرت کا استعارہ:**

صحرا، باغ، آسماں، دریا، سمندر، وغیرہ کے استعارے بول چال یا روزمرہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں:

اپنی ہی خوشبو کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا وہ
جنگل میں دربدر دوڑتا رہتا تھا وہ

پیام انصاری

ظفر محمود ظفر نے تنکے کا سہارا کو بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے:

وقت کیسا بھی ہو ہمت نہیں ہارا کرتے
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا لکھنا

کوئی بھی انسان چھوٹا نہیں ہوتا اور یہ دور عام و معمولی آدمی کو عزت وعظمت بخشنے والا ہے۔ ہم عصر شاعر خورشید طلب کا یہ عمدہ شعر ملاحظہ ہو:

میں ایک جگنو مری حیثیت ہی کیا لیکن
یہ کم نہیں خس و خاشاک مجھ سے روشن ہیں

اِس ضمن میں مندرجہ ذیل مزید اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں:

کوئی بھی میرے کرب سے آگاہ نہیں ہے
میں شاخ سے گرتے ہوئے پتے کی صدا ہوں

راج نرائن راز

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی

لہٰذا حیات ہو، قدرت ہو یا کائنات، انسان ان سے تا زندگی کبھی بھی اپنا تعلق قطع نہیں کرسکتا۔

**4.عام زبان میں شاعری:**

روزمرہ یا بول چال کی زبان شاعری کا اہم حصہ ہے اور عمدہ اشعار کی تخلیق بجائے خود ہوتی چلی جاتی ہے۔ مصرعے بھی ایسے حیران کن بنتے ہیں کہ قاری پڑھتا ہے اور ان کے بروزن ہونے پر بسا اوقات شک و شبے تک کرسکتا ہے۔ دیکھیے:

حضور آپ کا بھی احترام کرتا چلوں
اِدھر سے گزرا تو سوچا سلام کرتا چلوں

بیتاب لکھنوی

یوں ہی تو زمانے کے نشانے پہ نہیں ہم
کچھ بھی نہ کیا ایسا نہیں، کچھ تو کیا ہے

ظفر گورکھپوری

س شخص کو لوگ قابلِ ستائش نہیں سمجھتے ہیں اس کی وفات کے بعد اس کی بابت بھی صرف شائستگی کے ہی موجب اس کی مذمت نہیں کرتے ہیں، البتہ اس کی خوبیوں کا ہی ذکر کرنا ہمیشہ انسانی تہذیب میں شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً اکبرالہ آبادی کا یہ شعر اسی بات کا ضامن کہا جاسکتا ہے۔ ''کہے جو چاہے میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر/ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھے مرنے والے میں'' اسی طرح کے اور بھی متعدد اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

**5.نصیحت آموزی میں روزمرہ کا دخل:**

اکثر دوکان داروں کو لوگ کم نہ تولنے کی نصیحت کیا کرتے ہیں۔ ایک شعر میں قریشی گنگوہی بڑے سلیقے و طریقے سے کہتے ہیں:

تیرے گاہک نہ ٹوٹ جائیں کہیں
کم تو ہرگز نہ تول اے بھائی

جرأت کا شعر ہے:

عبث انگڑائیاں لے لے کے کیوں ملتے ہو آنکھوں کو
بھلا یہ بھی تو گھر ہے سو رہو گر نیند آئی ہے

اِس ظاہری نیک صلاح کے پیچھے بھی ذاتی مطلب پرستی پنہاں ہے۔ کیفی اعظمی کی شاعری میں عاشق اپنے دل کی تسلی یا کسی اور بنا پر اپنی معشوقہ کی بابت اِس اعلان پر ہی اکتفا کرتا ہے کہ:

وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

غالب کی شاعری میں عاشق تو اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر بس یہی کہتے ہوئے اپنے دل کے لیے آسودگی و عافیت محسوس کر لیتا ہے:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اِس کے عین برعکس مرزا داغ کی شاعری میں عاشق تو حسد کے مارے یہاں تک کہنے میں بھی کوئی گریز نہیں کرتا ہے کہ:

تمھیں چاہوں تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
میرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

جو ہر تماپوری جینے اور مرنے کے تضاد کا اسلوب اپناتے ہوئے عاشقوں کی نمائندگی کرنے والا یہ شعر پیش کرتے ہیں ''ہم عاشقوں کی محبت عجیب ہوتی ہے/کسی کے پیار میں مرتے ہیں جان جاتے ہوئے'' دو متضاد امر یہاں واضح طور پر نمایاں ہیں۔ غالب کا یہ شعر محبوب کے ساتھ محبت کا تعلق توڑنے سے بہتر ہے کہ کم از کم دشمنی کا ہی رشتہ ہے:

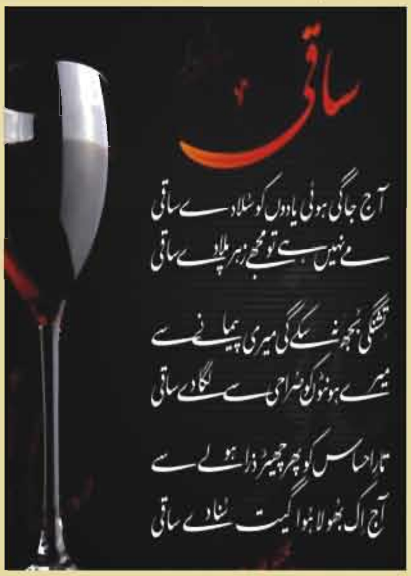


قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

مرزا داغ کا یہ معروف عاشق کے دوز مانوں کی دلی کیفیات کا نقشہ پیش کرتا شعر ہے:

وقت دو مجھ پر کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں
اک تیرے آنے سے پہلے، اک تیرے جانے کے بعد

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

میر تقی میر

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا یہ شعر قابل ستائش ہے:

کب تک اے سحر ضبط کا آزار سہو گے
جو بات ہے وہ اس کو بتا کیوں نہیں دیتے

مرزا داغ کا یہ شعر روزمرہ بولے جانے والے محاوروں میں سے ایک ہے۔

نظر کا تیر جگر میں رہے تو اچھا ہے
یہ گھر کی بات ہے گھر میں رہے تو اچھا ہے

**6.ضرب المثل بن جانے کی خاصیت:**

جس زبان میں روزمرہ کے محاورے اور سلیس و نفیس طرزِ ادا و الفاظ کی پیش کش جتنی زیادہ ہوا کرتی ہے، اس زبان کی ہمہ گیری و مقبولیت میں کوئی بھی شک و شبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ ایسے اشعار جلد ہی عام فہم ہونے کے بموجب ضرب المثل ہو جایا کرتے ہیں۔ چند مثال قابلِ غور ہیں:

یا تو پاس دوستی تجھ کو بتِ بیباک ہو
یا مجھی کو موت آجائے کہ قصہ پاک ہو

ذوق

ٹھوکریں ٹھوکروں پہ کھاتا ہے
دل مگر راہ پر نہیں آتا

عرفان پربھانوی

یہی ایک اولین اور اصلی وجہ ہے کہ روزمرہ کی زبان سے مزین پورے اشعار کے اول یا دوئم مصرعے عام زبان میں ضرب المثل کا بھی درجہ حاصل کرلیا کرتے ہیں۔ یہاں چند مثال لائق غور و فکر ہیں:

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

رضا خاں برق

قیس صحرا میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو

میاں داد سیاح

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ظہیر دہلوی

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

عبرت مچھلی شہری

لائے اس بت کو التجا کرکے
کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

رسالہ اسباق، جولائی، ستمبر 2007ص80، گمنام لال عاصی

یہ غم چار دن کا ہے خوشی دو چار دن کی ہے

مجھے معلوم ہے کل زندگی دو چار دن کی ہے
لالہ ٹیکارام تسلی

دورِ حاضر میں آدمیت کے فقدان کے سبب بے حساب درد کو دیگر شعرا کی مانند شاد عارفی نے بھی اپنے اس شعر میں یوں طنزیہ بیان کیا ہے:

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

اردو دنیا، اکتوبر سنہ 2012، مظفر حنفی، مقالہ شاد عارفی: ایک منفرد فنکار، ص46

اوروں سے آراستہ لاتعداد اشعار شعرا کی پرواز تخیل کا ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر ملاحظہ کریں۔ اے رشی، ان سے کیا کہے کوئی/ جن کی آنکھوں کا مر گیا پانی (ڈاکٹر کے کے رشی) اس نوعیت کے متعدد اشعار قابل ستائش اور لائق تحقیق کہے جاسکتے ہیں:

دکھاوے کے ہیں سب یہ دنیا کے میلے
بھری بزم میں ہم رہے ہیں اکیلے
افسر میرٹھی

زمانہ شعبدہ بازی کا یا پھر ہے خوشامد کا
جو ہیں اہلِ ہنر وہ آج کل بیکار بیٹھے ہیں
دوست بھاردواج

ٹوٹا ٹوٹا بکھرا بکھرا لگتا ہے
آج تو ہر اک شخص ہی تنہا لگتا ہے

اس طرح کے اشعار دورِ حاضر کے مختلف مسئلوں کے آئینہ دار ہوا کرتے ہیں۔

**7.فلسفہ وتصوف کا اثر:**

فلسفیانہ وصوفیانہ شاعری کی طرح اردو کی عشقیہ شاعری میں ذو معنی اشعار کی کثرت ہے:

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا
کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
ذوق

اپنی ہی خوشبو کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا وہ
جنگل میں در بدر ڈھونڈتا رہتا تھا وہ
پیام انصاری

خشک ہونٹوں کو کچھ نمی دے دے
زندہ رہنے کو زندگی دے دے
بشیر بدر

ہم عصر شعرا میں عرفان پربھنوی کی شاعری میں روزمرہ کا کافی دخل نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار لہجے کی پختگی کے ساتھ ایک دل نواز ہم آہنگی و عام فہم زبان کی سلاست ونفاست کے حامل ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

ہوس زمانے کی دل ہی میں مار دی ہم نے
جو ہم پہ بوجھ بنی تھی، اتار دی ہم نے
دیکھتے دیکھتے دنیا کو بدل دیں عرفان
جمع ہوجائیں اگر ہم سے قلندر دو چار

کہیں کہیں زبان کی سادگی بھی شاعر کی صوفیانہ سادہ دلی و سادگی کی چغلی کھاتی ہوئی ایسے عمدہ فلسفیانہ اشعار کی سوغات ہمیں بخش جایا کرتی ہے:

ابھی ستاؤں گا کچھ دیر اسی دوراہے پر
بعد میں دیکھوں گا سوچوں گا، کدھر جاؤں گا
پرتپال سنگھ بیتاب

**8.مرگ دائمی سے متعلق روزمرہ:**

موت کے متعلق بھی شاعروں نے روزمرہ کی بول چال کے فقروں کا برمحل استعمال کیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار قابلِ غور ہیں:

دیکھ کر ایک جنازے کو یہ احساس ہوا
شام ہوتی ہے تو ہر آدمی گھر جاتا ہے
عتیق الہ آبادی

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والے شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم
چکبست

قبر میں رکھ کر نہ ٹھہرا کوئی دوست
ہیں نئے گھر میں اکیلا رہ گیا
میر انیس

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا
داغ

دنیا تو جہنم ہے مگر چھوڑ کے اس کو
جانے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہے
عمر شفق

ایک ایک کرکے سارے مسافر بچھڑ گئے
کب تک کسی کا ساتھ نبھاتا ہے راستہ
اجیت سنگھ حسرت

بڑے سلیقے سے یہ کہہ کے زندگی گزری
ہر ایک شخص کو مرنا ضرور پڑتا ہے
منور رانا

مر گئے پھر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
بے وفا پوچھے ہے 'کیا دیر ہے لے جانے میں'
ذوق

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے
محمود رامپوری

اک مسافر کے سفر جیسی ہے سب کی دنیا
کوئی جلدی میں کوئی دیر سے جانے والا
ندا فاضلی

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے آتا ہے کہاں سے
اقبال

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے
سکندر علی وجد

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں
ناصر کاظمی

اس مختصر سے مقالے میں اردو شاعری کی تنقید کے ایک خاص اچھوتے پہلو کا سرسری ساذکر کرنا مقصود رہا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں نقاد اور محقق اردو شاعری کا تجزیہ لسانیاتی وفنی زاویے سے بھی کرنے کی سعی کریں گے۔ ■

**Dr Krishan Bhavuk**, Kothi No 201-A, Street No18-k, Guru Nanak Nagar, Patiala - 147003

ادبی مباحث

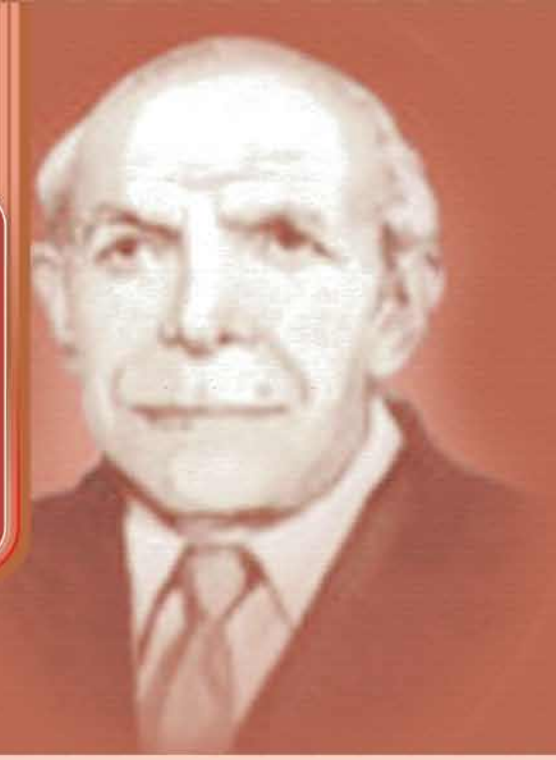

معین الدین عقیل

# غلام عباس کی اولین طبع زاد تخلیق

غلام عباس (1983-1907) اپنے معاصرین میں کئی اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہیں[1]۔ ان کی بنیادی حیثیت اور شہرت ایک افسانہ نگار کی ہے اور اس فن میں وہ اپنے سادہ و دل نشین اسلوب، کردار نویسی، کہانی میں ندرت و جاذبیت اور زندگی کی حقیقی تصویر کشی کے لحاظ سے مشکل ہی سے ایسا کوئی ثانی رکھتے ہیں جو بہ حیثیت مجموعی ان تمام صفات سے متصف ہو۔ وہ یوں بھی منفرد و مختلف ہیں کہ کلاسیکی و جدید مغربی ادب سے بے حد متاثر اور اس کے رمز شناس ہیں جب کہ تعلیم یکسر واجبی رہی ہے۔ حصول علم میں دل چسپی لینے کی کوئی روایت ان سے منسوب نہیں بلکہ اس کے برعکس اسکول سے غائب رہنا اور وہ وقت کسی دور افتادہ ویرانے میں گوشہ نشینی اختیار کر کے انگریزی کہانیوں کے ترجمے، انگریزی سے نابلد رہنے کے باوجود محض اس خواہش کی تکمیل کرنا کہ اس طرح کچھ یافت ہو جائے گی اور ملازمت کرنے سے بچے رہیں گے۔[2] اس یافت کی ضرورت والد کا سایہ سر سے گزر جانے کے باعث ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک ناشر کی ترغیب پر معروف انگریزی کہانیوں کے ترجمے کی طرف راغب ہوئے۔ انگریزی سے واقفیت نہ تھی کہ اسکول سے تو راہِ فرار اختیار کر رکھی تھی۔ لہٰذا یافت کی خاطر اور کچھ اپنے شوق کے زیر اثر انگریزی-اردو لغت سے لفظ بہ لفظ مدد لیتے ہوئے ترجمے کرتے رہے اور اس طرح ہونے والی آمدنی والدہ کے سپرد کرتے ہوئے یہ تاثر دیتے رہے کہ یہ یافت نوکری کے باعث ہے۔[3] اسی صورت میں کہ جب ان کی عمر ابھی 18 سال ہی تھی، ٹالسٹائی ((1910-1828) کے ایک افسانے 'جلاوطن' کا ترجمہ ایک رسالے 'ہزار داستان' (لاہور، جنوری 1925) میں شائع ہو گیا۔[4] یہ ان کا ادبی آغاز تھا۔ اسی عرصے میں ان کی ایک کہانی 'بکری' کا ذکر بھی ملتا ہے جسے انھوں نے 1922 میں، جب ان کی عمر فقط 15 سال تھی، شائع کروایا۔[5] ان کے اس وقت کے ادبی سفر کے بارے میں یہ اطلاعات عام ہیں کہ ابھی تخلیق کی طرف وہ مائل نہیں ہوئے، اور ترجمے ہی کرتے اور شائع کرواتے رہے۔ اس دوران ان کی چند کہانیوں کے نام: برف کی بیٹی، چاند کی گڑیا، جاپانی اور دوسری کہانیاں، جادو کا لفظ ملتے ہیں۔ مصدقہ تو نہیں لیکن یہ کہانیاں غالباً اس اولین دور ہی کی ہیں جب انھوں نے ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن یہ سب، چاہے ترجمہ ہوں یا ان کی اپنی تخلیقات، 'جلاوطن' کے بعد کی کاوشیں ہیں۔ اپنی اس دل چسپی کے اظہار کے طفیل 1928 میں وہ امتیاز علی تاج (1970-1900) کے رسالے 'پھول' کی ادارت سے وابستہ ہو گئے، جس سے ان کا تعلق 1937 تک برقرار رہا۔ اس عرصے کے آغاز میں انھوں نے تاج صاحب کی فرمائش پر واشنگٹن ارونگ (1859-1783) کی معروف تصنیف 'الحمرا' کا ترجمہ کر ڈالا، جو 1929 میں جو امتیاز علی تاج کے اہتمام سے شائع ہوا۔[6]

'جلاوطن' ان کی پہلی کاوش ہے جو شائع ہوئی، لیکن یہ ترجمہ تھی۔ ان کی ذاتی تخلیق پہلے پہل کون سی تھی اور وہ کب شائع ہوئی، اس بارے میں معلومات عام نہیں ہیں۔ ہاں فنی لحاظ سے ان کے تخلیق کردہ افسانوں میں پہلا افسانہ 'مجسمہ' تھا؟[7] جس کے اولین افسانہ ہونے کے بارے میں بظاہر کوئی اختلاف نہیں۔[8] ہزار داستان، پھول، تہذیبِ نسواں، شیرازہ اور ہمایوں یہ ایسے رسائل ہیں جن میں ان کی ابتدائی تحریریں اور تخلیقات اس وقت یا کچھ بعد میں شائع ہوتی رہیں، لیکن یہ بات شاید عام نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے شہر امرتسر سے نکلنے والے خواتین کے ایک رسالے 'سہیلی' میں بھی لکھا ہے۔ یہ رسالہ خدیجہ بیگم (ایم اے؛ ایم او ایل؛ گولڈ میڈلسٹ) کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ نوشابہ خاتون قریشی (بی اے) اس کی اعزازی مدیر اور رضیہ خاتون مدیر تھیں۔[9] غلام عباس کی کم از کم ایک تخلیق بلکہ اولین طبع زاد تخلیق: 'کھوئے ہوئے کھلونوں کی بستی' اس کے جون 1926 کے شمارے میں شائع ہوئی۔[10]

غلام عباس اپنے تراجم کے آخر میں یا آغاز ہی میں بالعموم نشاندہی کر دیا کرتے تھے کہ وہ کس کا ترجمہ ہے یا محض 'ماخوذ' ہے۔ وہ جس طرح مغربی کہانیوں سے متاثر تھے اس کا ایک اندازہ 'کھوئے ہوئے کھلونوں کی بستی' سے بھی ہوتا ہے جو یقیناً ترجمہ نہیں ہے اور نہ اسے ماخوذ کہا جا سکتا ہے لیکن گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک وہ جوناتھن سوئفٹ (Jonathan Swift، 1667-1745) کا معروف ناول Gulliver's Travels[11] پڑھ چکے ہوں گے۔ ان کی مذکورہ کہانی میں اس کا مرکزی کردار 'رشیدہ' ایک ایسی بستی میں اور اس ہیئت میں پہنچتی ہے اور کچھ ایسے حالات سے دوچار ہوتی ہے جیسا کہ سوئفٹ کے ناول کے حصہ اول: A Voyage to Lilliput میں اس کے مرکزی کردار لیمیویل گولیور (Lemuel Gulliver) کے ساتھ جزیرہ للی پٹ میں پیش آئے تھے۔ اس کے باوجود یہ کہانی ترجمہ نہیں ہے اور ماخوذ بھی نہیں ہے بلکہ غلام عباس کی تخلیق ہے اور 'جلاوطن' کے منظر عام پر آنے کے باوجود، جو ترجمہ ہے، یہ اولین طبع زاد تخلیق ہے جو منظر عام پر آئی۔ اس وقت ان کی عمر 19 سال تھی۔ چونکہ میری معلومات کی حد تک، 'جلاوطن' یا دیگر تراجم سے قطع نظر، یہ کہانی غلام عباس کی

اولین طبع زاد تخلیق ہے جب کہ ان کی دیگر تخلیقات اس کے بعد شائع ہوئیں، اس لیے اسے غلام عباس کی اولین تخلیق کے طور پر اور نایاب ہونے کے سبب، عام ملاحظے اور غلام عباس پر بطور ایک ماخذ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

### کھوئے ہوئے کھلونوں کی بستی

(صفحہ 34) رشیدہ کا کتا ڈبو آج صبح سے گم ہے۔ خالہ جی ملنے آئی ہوئی تھیں۔ رشیدہ ان کے بچوں کے ساتھ سارا دن کھیل کود میں بہلی رہی۔ ڈبو کا خیال نہ آیا۔ لیکن جب رات کو وہ چارپائی پر سونے لگی تو اسے یاد آیا کہ ڈبو غائب ہے جسے چھاتی سے چمٹا کر سویا کرتی تھی۔ بڑا رنج ہوا۔ کتنی ہی دیر اسی فکر میں لگی رہی۔ صبح ہوگی تو ماما سے کہہ کے گھر کا کونا کونا دکھواؤں گی۔ شریر تو ہے ہی مجھے ستانے کے لیے (صفحہ 35) کہیں چھپ گیا ہوگا۔

آدھی رات کو جب رشیدہ گہری نیند کے مزے لے رہی تھی تو یکا یک اس کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن یہ خواب نہ تھا۔ رشیدہ کو اس بات کا پورا پورا یقین تھا وہ عجیب وغریب ملک کے چھوٹے چھوٹے سے بازاروں میں پھرنے لگی۔ بازاروں میں بڑی بھیڑ تھی۔ موم کے آدمی، عورتیں، بچے، چینی کے آدمی، عورتیں، بچے، لوہے، مٹی، کپڑے کے آدمی، عورتیں، بچے، کتے، بندر، درخت، چڑیاں، مور، کبوتر، بلی، گھوڑے، تانگے، بیل گاڑیاں، ریل گاڑیاں، موٹریں، جہاز اس کثرت سے تھے کہ خدا کی پناہ۔ لوگ تو خیر آہستہ آہستہ چل پھر رہے تھے لیکن ریل گاڑیاں اور موٹریں اتنی تیزی سے مکانوں کے گرد گھوم رہی تھیں کہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔

رشیدہ حیران ہو ہو کر انھیں دیکھ رہی تھی۔ وہ ان سب سے اتنی بڑی تھی کہ اونچے اونچے مکانوں کی چوٹیاں اس کی کمر تک پہنچتی تھیں۔ اس کی ٹانگوں کے گرد بہت سے لوگ چمٹے ہوئے تھے۔ کوئی اس کا پہنچا پکڑے ہوئے تھا۔ کوئی اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ کوئی اسے دھکیل رہا تھا۔ کوئی اسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بندر اس کے سر اور شانوں پر چڑھ کر گدگداتے تھے۔ بعض رو رہے تھے بعض چلا رہے تھے۔ غرض یہ کہ عجیب تماشا ہو رہا تھا۔

رشیدہ اس ننھی ننھی مخلوق اور ان کی عجیب عجیب حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر ہنستی تھی۔ لیکن وہ جلد ہی دق ہوگئی۔

"اب چپ بھی ہوتے ہو کہ نہیں؟"

یہ سنتے ہی سب کے سب چپ ہوگئے لیکن ریل گاڑیاں اور موٹریں برابر چلتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی آجائے تو بھی (صفحہ 36) انھیں روک نہیں سکتی۔ رشیدہ ان لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھنے لگی:

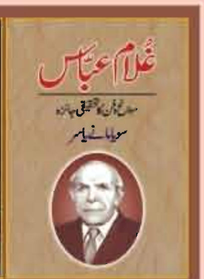


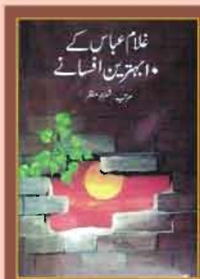


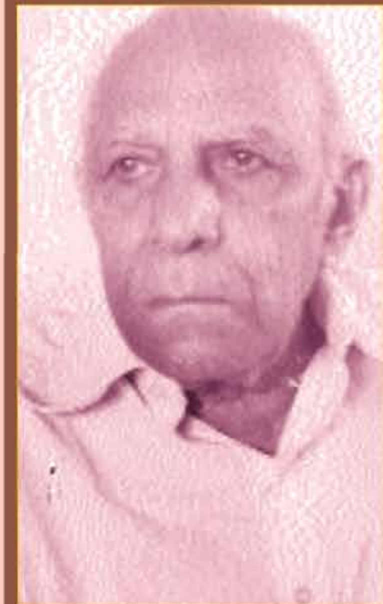

"تم کون ہو اور میں کہاں ہوں؟"

ایک مٹی کے بنے ہوئے سپاہی نے یہ سن کر اپنے کان کھڑے کیے۔ پہلے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا، پھر ناک صاف کی۔ سلام کر کے بولا:

"بی بی جی! ہم دنیا کے کھوئے ہوئے کھلونے ہیں۔ اور یہ کھوئے ہوئے کھلونوں کی بستی ہے۔ کیا آپ ہمیں لینے آئی ہیں؟

اس سے پہلے کہ رشیدہ جواب دیتی، اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے داہنے پاؤں کے انگوٹھے کو چاٹ رہا ہے۔ نیچے جھک کر دیکھا تو ڈبو تھا۔ اٹھایا۔ اٹھا کر چھاتی سے لگایا اور اس کا منہ چومنے لگی۔

ڈبو نے رونا شروع کیا۔ "بی بی مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ بی بی مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"

اپنے ڈبو کو پا کر رشیدہ نے جانا چاہا لیکن تمام کھلونے رو رو کر کہنے لگے:

"بی بی جی ہمیں بھی۔ ہمیں بھی بی بی جی۔"

اس نے اپنی جان چھڑا کر تنگ بازار میں بھاگنا شروع کیا۔ لیکن کھلونے بھی کب پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے روتے چلاتے بھاگے۔ جتنی تیزی سے وہ بھاگتی اتنی ہی تیزی سے کھلونے بھی بھاگتے۔ یہاں تک کہ وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔

رشیدہ چارپائی سے نیچے گری ہوئی اپنے اردگرد کی چیزوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ رضائی، سرہانہ، بچھونا، سب فرش پر گرے ہوئے تھے۔ رشیدہ کپڑے جھاڑ کر اٹھی۔ دیکھتی کیا ہے کہ خالی چارپائی پر اس کا ڈبو چت لیٹا ہوا ہنس رہا ہے۔

## حواشی

1. ان کی پیدائش 1909 بھی بتائی جاتی ہے، لیکن خود غلام عباس کے بیان، مشمولہ: British Muslim Fictions; Interviews with Contemporary Writrs مرتبہ: کلیر چیمبرس (Claire Chambers) لندن، 2011، ص 78-79، اور ان کی بیگم کرسٹین ولاسٹو (Christine Vlasto)، [کرسٹین عباس]، (1921-1922) کی روایت کے مطابق 1907 ہی ہے۔ غلام عباس کے خصوصاً بچپن کے حالات کے لیے غلام عباس کی ذاتی یادداشتوں پر مبنی ان کی بیگم کرسٹین عباس کا انگریزی مضمون: Ghulam Abbas، غیر مطبوعہ، مخزونہ: Christopher Long.co.uk دل چسپ اور اہم ہے۔
2. کرسٹین عباس، محولہ بالا۔
3. ایضاً
4. احمد حسین صدیقی: دبستانوں کا دبستان، جلد اوّل، کراچی 2003، ص 329
5. مرزا حامد بیگ 'اردو افسانے کے رویے'، اسلام آباد، 1991، ص 491
6. احمد حسین صدیقی، ص 329
7. مطبوعہ: 'کاروان' (لاہور)، سالنامہ 1933
8. جیسے: شہزاد منظر 'غلام عباس ایک مطالعہ' لاہور، 1991، ص 31، و نیز فرمان فتح پوری 'افسانہ اور افسانہ نگار' لاہور، 2000، ص 110
9. اس رسالے کا دفتر 'کوٹھی سنگھی بابو صاحب' میں واقع تھا۔
10. صفحات: 34 تا 36
11. اولین اشاعت: لندن، 1726، اصل نام: Travels into Several Remote Nations of the World

■

**Dr. Moinuddin Aqeel**, B-215/15, Gulistan-e- Jaohar, Karachi - 75290 (Pakistan)

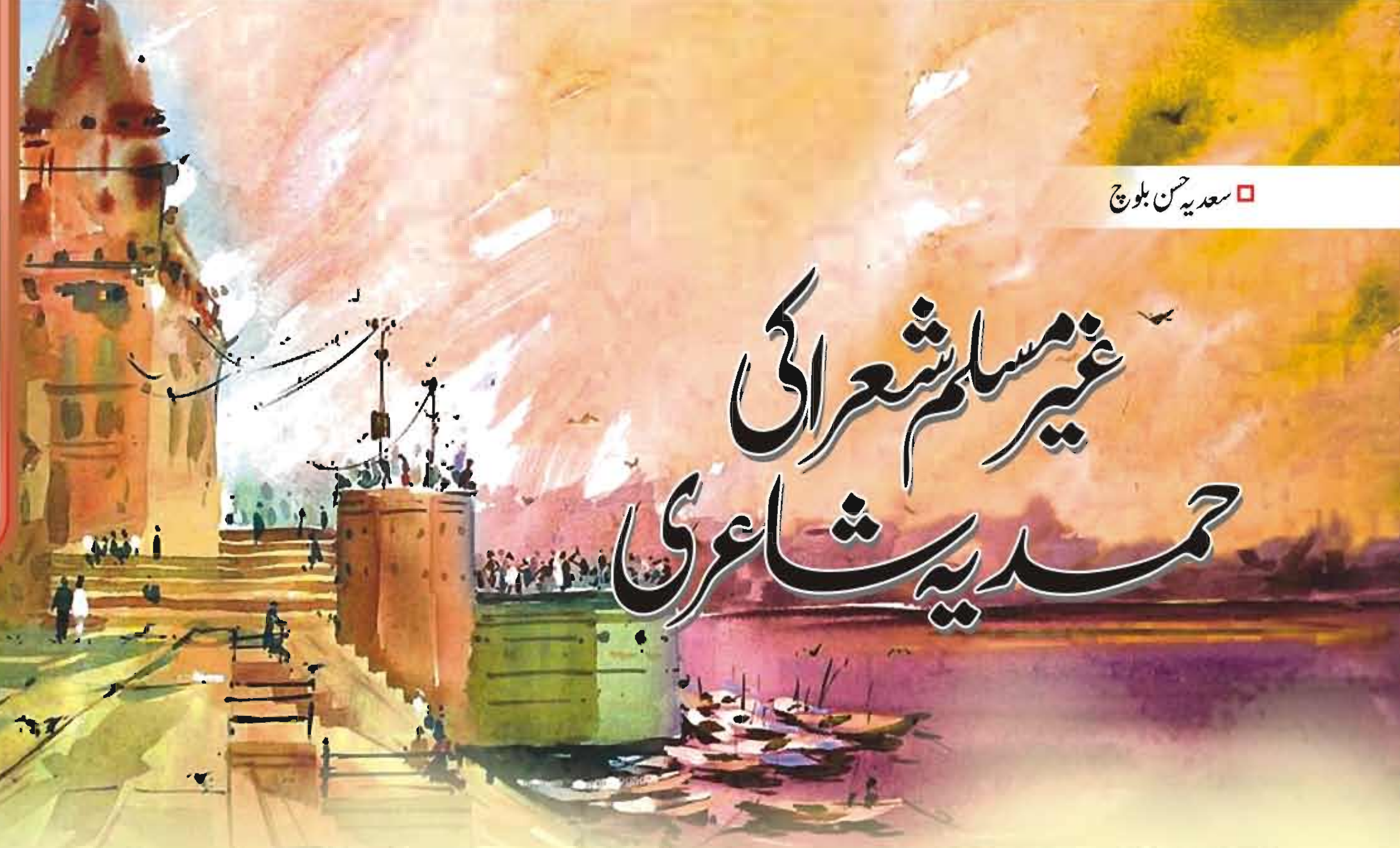

سعدیہ حسن بلوچ

# غیر مسلم شعرا کی حمدیہ شاعری

Beauty is truth, truth is beauty. Exquisite samples of Hamad can be found in the poetry of Sikhs, Hindus and other non- Muslims which are based on the acceptance of Universal truth of existence of God. The garden of Hamd-o-Munajat has been enriched with precious pearls of Hamdia poetry by the non Muslims. The study of these increased out faith in God. It is critically viewed the works of non-Muslim poets in this essay.

توحید ایک عالم گیر متفقہ صداقت ہے۔ وید مقدس کہتا ہے ''ایکم برھم دتیونتسیہ پرتماستیہ'' گرنتھ صاحب میں ہے ''ایکواونکار'' اور قرآن کریم ''لاالٰہ الا اللہ'' کی صدائے حق بلند کرتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمان شعرا کی دیکھا دیکھی غیر مسلم شعرا نے بھی فارسی روایت کو پورے طور پر اپنایا اور ان کے یہاں ہمیں وہی استعارے، علامتیں اور تشبیہات ملتی ہیں جو مسلمان شعرا سے خاص تھیں۔ اردو شاعری کی ابتدا میں گرونا نک اور کبیر کے یہاں خالص توحید کے مضامین بطور دلیل ہمارے سامنے ہیں۔

پھر یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ شاعر کا بحیثیت شاعر کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے اور 'سچ' کا اعلان کرتا ہے۔ اسی لیے اسے ہر جگہ صرف خدا دکھائی دیتا ہے۔ لالہ لعل چند فلک کہتے ہیں:

آتش کدے کے اندر روشن ہے نور تیرا
کعبہ میں بتکدہ میں بھی ہے ظہور تیرا

مندر میں کوئی تجھ کو ماتھا نوا رہا ہے
مسجد میں کوئی سجدہ میں سر جھکا رہا ہے

غیر مسلم شعرا کے حمدیہ کلام کے مطالعے کے بعد ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی حمد گوئی محض روایت کی پاسداری ہے۔ یہ نکتہ بھی اپنی جگہ درست ہے مگر بعض غیر مسلم شعرا نے اس عقیدت کے ساتھ تصور توحید سے اپنی وابستگی ظاہر کی ہے کہ مسلمان بھی مبہوت رہ جاتے ہیں اور بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں:

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ہم دیکھتے ہیں کہ برعظیم پاک و ہند میں غیر مسلم شعرا کے یہاں حمد گوئی کا آغاز کیسے ہوا؟ مسلمان شعرا اور نثار اپنی ہر تحریر کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کرتے تھے۔ ان روایات کو غیر مسلموں نے بھی بعینہٖ اپنایا اور اپنی ہر نوع کی کتب کو 'بسم اللہ' سے مزین کیا۔ اس کی درجنوں مثالیں ہمیں بآسانی دستیاب ہوجاتی ہیں۔

حمد سے آغاز کلیات یا دیوان کی روایت بھی ان کے یہاں خاصی قوی رہی ہے اور اردو کی قدیم مثنویات کے آغاز میں حمد، نعت اور منقبت بھی ملتی ہے۔ حمدیہ نظمیں بھی ہندو شعرا کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہندو شاعر دیوان چند گڈ ہوک نے 'ترانۂ توحید' کے نام سے حمدیہ نظموں کا مجموعہ انتخاب بھی مرتب کیا ہے جو ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل اور 93 حمدیہ منظومات اس میں شامل ہیں۔ ناشر رام داس کوہلی بک سیلر اینڈ پبلشر، لاہور ہیں۔ اگرچہ اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے مگر دیوان چند کی ایک اور کتاب 'لمالۂ' کے نام سے دستیاب ہوئی ہے جو دیال سنگھ لائبریری میں دیکھی جا سکتی ہے اور جس پر 1390 کا سال اشاعت درج ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'ترانۂ توحید' بھی اسی کے لگ بھگ شائع ہوا ہوگا اور اسی بنیاد پر ہم اسے اولین حمدیہ انتخاب بھی قرار دیتے ہیں۔

دوسرا حمدیہ انتخاب 'نغمۂ توحید' کے نام سے 1981 میں صوفی عبدالقادر اور ظفر صابری نے لاہور سے شائع کیا۔ اسی طرح اردو کا پہلا حمدیہ و مناجاتیہ دیوان کا اعزاز بھی ایک ہندو شاعر کنہیا لال ہندی کو نصیب ہوا۔ غیر مسلم شعرا کی حمد و مناجات کا مختصراً جائزہ پیش ہے۔

**عاشق: مہاراجہ کلیان سنگھ** (1751 پ) مہاراجہ شتاب رائے کے فرزند دہلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور اردو پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ متعدد فارسی اور اردو تصانیف کے خالق تھے۔ ان کی مثنوی قاضی عبدالودود نے مرتب کی۔ ان کی حمدیہ شاعری سے ان کے عاشق خدا اور رسولؐ اور آلِ رسولؐ ہونے کا پتا چلتا ہے۔ نیز تلمیحات اسلامی بھی برتتے نظر آتے ہیں۔

اللہ کی حمد لکھ رہا ہوں
مداح رسول کبریا ہوں
عاشق ہوں دل سے پنج تن کا
وصاف حسین اور حسن کا

**منشی جگن ناتھ، خوشتر** (1809-1864) خوشتر کی بہت سی مذہبی تصانیف ہیں۔ مگر سب سے معرکہ آرا تصنیف 'رامائن خوشتر' ہے۔ انھوں نے تلسی کی رامائن کا 1851 میں منظوم ترجمہ کیا۔ جو اپنے بھرپور اسلوب، پرشکوہ

الفاظ تراکیب، چستی بندش اور اعلیٰ تخیل کے لحاظ سے مایۂ ناز تصنیف ہے۔ ان کی مناجات کے چند اشعار درج ذیل ہیں ۔مناجات کے ایک ایک شعر سے خوشتر کے تصور توحید باری کی درست سمتی کا احساس ہوتا ہے:

مناسب ہے بشر کو وقت حاجات
کرے درگاہ باری میں مناجات
وہی حاجت روائے دوجہاں ہے
کرم فرمائے عالم بے گماں ہے
اسی کی ذات ہے غفار و ستار
اسی کا نام ہے قہار و جبار
وہی دوزخ وہی دیتا ہے جنت
وہی ذلت وہی دیتا ہے عزت

**منشی جوالا پرشاد برق** (1863-1911) اردو کے پہلے مزاحیہ اخبار 'اودھ پنچ' سے منسلک رہے۔ انھوں نے بنگالی اور انگریزی کے کئی ناول ترجمہ کیے۔ ان کی 'مثنوی بہار' خاصی معروف ہوئی۔ حمد کے چند اشعار دیکھیے جن میں وہ مظاہر قدرت میں خدا کی جلوہ گری دیکھتے ہیں:

دنیا میں ظہور صبح ہوا گلشن پر کیا جوبن ہے
خورشید کا غنچہ کھلنے لگا، اللہ کی قدرت روشن ہے
ہر پھول میں اس کی خوشبو ہے، اکسیر ہے بوٹی بوٹی میں
ہر شاخ میں اس کی خاصیت، تاثیر ہے پتی پتی میں

**کشن پرشاد شاد** (1864-1940) کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ اقبال کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ داغ کے شاگرد تھے۔ کلام شاد، رباعیات شاد کے علاوہ نعتیہ مجموعے 'خمکدۂ رحمت' کے بھی خالق ہیں۔ نمونہ مناجات ملاحظہ ہو جس میں وہ اللہ تعالیٰ سے 'بادۂ توحید' کے طلب گار ہیں اور مدینے کی زیارت کے شدید خواہاں ہیں:

ہاں بس اب بادۂ توحید عطا کر مجھ کو
جلوہ ہر رنگ میں تو اپنا دکھا دے یارب
ہے تمنا کہ مدینے کی زیارت کرلو
اپنے محبوب کا تو روضہ دکھا دے یارب
مرضِ ہجر کا بیمار ہے مدت سے یہ شاد
داروئے وصل محمدؐ سے شفا دے یارب

**جویا آنولوی** (1875-1948) قوم کے کائستھ تھے۔ ان کی مثنوی 'سرو چراغاں' میں تعارف کے زیر عنوان منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے آپ کے حالات لکھے ہیں اور 14 فروری 1956 کی تاریخ درج کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی 1956 میں طبع ہوئی۔ ان کی 'حمد و مناجات' میں اپنی عبدیت، عاجزی وانکساری اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا بیان ہے۔ کہتے ہیں:

مطلع سرِ دیواں ہے رقم حمد خدا کا
روشن ہو سخن کیوں نہ مجھ آشفتہ نوا کا
الحمد وظیفہ ہو نہ کیوں فکرِ رسا کا
مشہور ہے 'استاد خدا ہے شعرا کا'
تیرے متوکل کا، غنی دست نگر ہے
سلطان بھکاری ہے ترے در کے گدا کا

مناجات کا شعر دیکھیے:

جویا ہوں مرا طرزِ سخن سب سے جدا ہو
ہو رنگ سخن خاص مجھ آشفتہ نوا کا

**حمدیہ نظمیں بھی ہندو شعرا کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہندو شاعر دیوان چند گڈ ہوک نے 'ترانۂ توحید' کے نام سے حمدیہ نظموں کا مجموعہ انتخاب بھی مرتب کیا ہے جو ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل اور 93 حمدیہ منظومات اس میں شامل ہیں۔ ناشر رام داس کوہلی بک سیلر اینڈ پبلشر، لاہور ہیں۔ اگر چہ اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے مگر دیوان چند کی ایک اور کتاب 'لمالہ' کے نام سے دستیاب ہوئی ہے جو دیال سنگھ لائبریری میں دیکھی جاسکتی ہے اور جس پر 1390 کا سال اشاعت درج ہے۔**

**جوش ملسیانی، منشی لبھورام** (1883-1976) معروف شاعر تھے۔ 'جنون و ہوش' ان کا مجموعہ کلام ہے۔ ان کے نزدیک خدا، کائنات کی رگ رگ میں ہویدا ہے۔ 'خدا کس جگہ نہیں' کے عنوان سے کہتے ہیں:

جو شرق و غرب میں دیکھو وہاں بھی ہے موجود
جو فوق و تحت میں دیکھو وہاں بھی ہے وہ ضرور
اگر نہیں تو امیروں کی محفلوں میں نہیں

آرزو کرتے ہیں کہ ان کا سر بارگاہ الٰہی میں مستقل جھکا ہی رہے کہتے ہیں:

عبودیت پہ الٰہی مجھے بھی ناز رہے
جھکا ہوا ترے در پر سرِ نیاز رہے
یہ آرزو ہے عطا کر مجھے وہ ذوقِ نظر
شہود و غیب میں باقی نہ امتیاز رہے

اسکول کے بچوں کے لیے انھوں نے قیام پاکستان کے بعد 1948 میں دعا لکھی، جو اپنے سہل اسلوب اور مضامین وحدت و عبودیت کی دلکشی سے معمور ہے۔ کہتے ہیں:

مرے داتا مری بگڑی کو بنانے والے
مجھ کو ہر ایک مصیبت سے چھڑانے والے
ایک میرا ہی نہیں سب کا سہارا تو ہے
دردمندوں کے ہر اک درد کا چارا تو ہے
میں غریبوں کے ہر اک دکھ کی دوا ہوجاؤں
یعنی دوزخ میں بھی جنت کی ہوا ہوجاؤں
دل سے نکلی ہوئی سن لے یہ صدائیں میری
تیری رحمت کو ترستی ہیں دعائیں میری

**چکبست، پنڈت برج نرائن** (1882-1926) کا شعری مجموعہ 'صبح وطن' سرتیج بہادر سپرو کے مقدمے کے ساتھ 1926 میں شائع ہوا۔ مذہبی اور علمی شاعری کے حوالے سے چکبست کا نام بہت معروف و مقبول ہوا۔ ان کے کلام میں خدا سے شکوے کے عناصر بھی ہیں۔ کہتے ہیں:

رنج و راحت کا سبب دنیا میں کچھ پایا نہیں
حشر میں ہم صاف کہہ دیں گے خدا کے سامنے

اب کی تو شام غم کی سیاہی کچھ اور ہے
منظور ہے تجھے مرے پروردگار کیا

نظم 'جلوۂ معرفت' میں ذات باری کا وجود مظاہر کائنات میں دیکھتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں:

رنگ و بو ہو کے سمایا وہی گلزاروں میں
ابر بن کر وہی برسا کیا کہساروں میں
شوق ہوکر دل مجذوب پہ چھایا ہے وہی
درد بن کر دل شاعر میں سمایا ہے وہی

**شام موہن لال، جگر بریلوی** (1890پ) کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ ان کی مثنوی 'پیام ساوتری' کو خاصی مقبولیت ملی۔ مثنوی کے آغاز میں دی گئی حمد، اعترافِ خداوندی کی مظہر ہے۔ کہتے ہیں:

اے قادرِ مطلق اور مختار
ہیں جس کے ازل ابد پرستار
آغاز کی ابتدا ہے جس سے
انجام کی انتہا ہے جس سے
تو آتا نہیں سمجھ میں کیا ہے
لیکن یہ یقین ہے بڑا ہے
خالق ہے تو دوجہاں کا آقا
مالک ہے تو جسم و جاں کا آقا

**مہر دہلوی، سورج نرائن** (1930م) بڑے عالم وفاضل، ویدانت کے ماہر اور باکمال شاعر تھے۔ بچوں کے لیے متعدد نظمیں لکھیں۔ وہ دیوان موسوم بہ 'کلام مہر' جلد اوّل و دوم یادگار ہیں۔ حمدیہ مسدس سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

برسات کا ہے موسم جگنو چمک رہے ہیں
تاروں کے آسماں پر ہیرے دمک رہے ہیں
کلیاں چٹک رہی ہیں گلشن مہک رہے ہیں
کوئل کی ہیں صدائیں بلبل چہک رہے ہیں
سب میں ہے نور تیرا سب میں ضیا ہے تیری
سب کی زباں پہ یارب حمد و ثنا ہے تیری

**فضا، منشی گوبند پرشاد** کی مثنوی 'گلزارِ فضا' کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ سلطان واجد علی شاہ کے بڑے پرستار ہیں۔ یہ مثنوی 1859 میں طبع ہوئی۔ اس سے زیادہ ان کے حالات دستیاب نہ ہوسکے۔ مثنوی کا آغاز حمد و مناجات سے ہوتا ہے۔ صفحہ اوّل پر 'بسم اللہ' بھی رقم ہے۔ قدیم طرز املا میں لکھے گئے چند حمدیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جھکا سرای قلم لکھ حمد باری
کہ حاصل ہو سخن کو پایداری
وہی شاہنشہہ کون و مکاں ہی
وہی سلطان ملک جسم و جان ہی
وہی ہے عالم پیدا و پنہاں
وہی ہے ناسخ طومار عصیاں
غرض بے مثل اس خالق کی ہے ذات
فضا اب صدق دل سے پڑھ مناجات

مناجات میں اپنے گناہوں کا صدق دل سے اعتراف کرتے ہیں اور محمدؐ وآلِ محمدؐ کے طفیل مغفرت کی طلب کرتے ہیں:

خداوندا مری امید برلا — کرم سی مجھکو راہ راست پر لا
نہ مجھ سے راست کوئی کام آیا — زباں پر بھی نہ تیرا نام آیا
اگرچہ ہیں گنہ میری شب تار — کرم تیرا ہی خورشید پر انوار
نہ رکھ رحمت سی اپنی دور مجھکو — سمجھ بیچارہ و مجبور مجھ کو
دعا مقبول ہو ای رب غفار — بحقِ مصطفی و آلِ اطہار

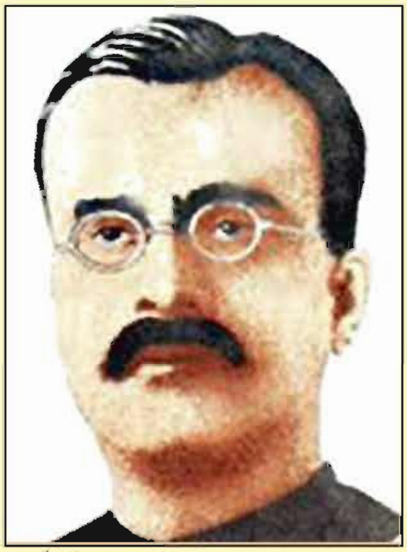

**ہمدم اکبر آبادی** کا اصل نام پنڈت کنور گوری پرشاد تھا۔ ان کا شعری مجموعہ 'غنچۂ طرب' آگرہ سے شائع ہوا۔ اندرونی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ مولانا ظفر علی خان کے معاصر تھے ان کے مذکورہ مجموعے میں حمد اور قصیدہ درحمد خدائے قدیر" کے عنوان کے تحت دلکش حمدیہ اشعار ہیں۔ تلمیحاتِ اسلامی کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ کلام میں روانی و شگفتگی نمایاں ہے:

یہ بحر و بر سب اوسکے ہیں، نہیں کوئی شریک اوسکا
وہی ظاہر، وہی باطن، وہی پنہاں، وہی پیدا
زمیں اوسکی، زماں اوسکاں، مکیں اوسکے، مکاں اوسکا
ادھر اوس کا اُدھر اوسکا، یہاں اوسکا، وہاں اوسکا

مذکورہ بالا اشعار میں صنعتِ تضاد اور صنعتِ تکرار نے شعر کے ظاہری حسن میں اضافہ کیا ہے۔ تلمیحاتِ اسلامی دیکھیے:

بچائی نوحؑ کی کشتی، دیا اعجاز عیسیٰؑ کو
ہوا غرق فنا فرعون، اوتارا پار موسیٰؑ کو
کہیں نمرود کی آتش بنی گلزار کی صورت
خلیلؑ اللہ پر نازل کہیں اوسکی ہوئی رحمت
کہیں پر قید زنداں سے دیا یوسفؑ کو چھٹکارا
کہیں پر رام بن کر بھائیوں کا ہوگیا پیارا

حمدیہ قصیدے کے اختتام پر دعا کرتے ہیں:

تا کجا طولِ سخن ہمدم خموش
اس سخن کی بھی ہے کوئی انتہا
لکھنے والے لکھ گئے اس میں بہت
تو لکھے گا کیا، تیرا کیا حوصلا
در اجابت کا کھلا ہے سامنے
مانگ لے اب مانگنی ہے جو دعا
ورد تیرا نام ہو آٹھوں پہر
بندۂ عاجز کی ہے یہ التجا

**دلورام کوثری** (1939پ) ہندو شعرا کی فہرست میں واحد شاعر ہیں جو مذہب اسلام کی حقانیت سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ بالآخر اسلام قبول کرکے مسلمانیت کے شرف سے معزز ہوئے کوثری کو اسلام اور ذات رسولؐ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ آپ کا نعت گویان میں اہم مقام اور نام ہے۔ تصانیف میں آبِ کوثر، بزم کوثری، مسدس کوثری اور بشارت انجیل شامل ہیں۔ نمونہ حمد ملاحظہ ہو جس میں نعت کے اشعار بھی شامل ہیں:

خدا نے کیے جب تقسیم رتبے
تو یوں سب کو پھر قدردانی میں رکھا
غرض سب سے اول خدا نے بالآخر
محمدؐ کو یاران جانی میں رکھا
مرے منہ سے منظور تھی نعت احمدؐ
مجھے فرد رطب اللسانی میں رکھا

**جے چند پریم** منشی جے چند پریم، حصار (ہریانہ) کے معروف شاعر تھے۔ 'تلخیِ حیات' کے عنوان سے ان کا مجموعہ کلام 1970 میں منظر عام پر آیا۔ 'گزارش' کے عنوان سے انھوں نے اپنا مختصر تعارف دیا مگر سال ولادت درج نہیں کیا۔ 1935 میں شعرگوئی شروع کی۔ 1936 میں ریلوے ہیڈکوارٹرز آفس لاہور میں بطور آفس کلرک تعینات ہوئے اور وہاں پنڈت دتّہ پرشاد صاحب فدا سے اصلاح لیتے رہے۔ ملتان ریلوے ڈویژنل آفس تبدیلی پر بلند پایہ شاعر و مضمون نگار حضرت کشفی ملتانی کی شاگردی اختیار کی۔ پریم، کشفی ملتانی کا نہایت احترام سے ذکر کرتے اور شکریہ ادا کرتے ہیں۔

باوجود ہندو ہونے کے پریم کے کلام میں حمد وثنا کے

علاوہ دیگر اسلامی تہواروں پر بھی اشعار ملتے ہیں جس سے ان کے وسیع المشرب اور تارک رسوم و قیود ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔'التجا' کے عنوان سے دعا کرتے ہیں:

دل اگر دے تو خدا دے ہمیں عالی ظرفی
ہم کو منظور تنگ ظرفیِ منصور نہیں
پہلے اُس کے ذرا بندوں کی تو خدمت کر لے
پھر یہ کہہ دے کہ خدا ہم سے کہیں دور نہیں

'حمد و ثنا' میں بھی اسی وسیع المشربی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اسلامی تلمیحات سے مستفید ہوتے ہیں:

کوئی جائے کاشی کوئی کعبہ ڈھونڈے
تجھے ہم تو دل میں نہاں دیکھتے ہیں
زمیں پر فلک پر یہ کس کے ہیں جلوے
کہ پُرجن سے ہر دو جہاں دیکھتے ہیں
تو ہی تو نظر آیا اہلِ نظر کو
تجھے کور باطن کہاں دیکھتے ہیں
سرِ دار بھی ہم کہیں گے انا الحق
کہ مرنے میں کب ہم زیاں دیکھتے ہیں

رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب European and Indoeuropean poets of urdu and Persian میں جن غیر مسلم شعرا کا ذکر کیا ہے ان میں فراسو، شور میرٹھی، الیگزینڈر ہیڈرے آزاد، حکیم عاصی اور ملکہ جان کی حمدیہ شاعری قابلِ ذکر ہے۔

**فراسو، فرانس گاولیب کوئن** (1861-1777)

Francois Gotlieb Koine "Farasu"

جرمن نسل سے تھا اور ہندوستان میں پیدا ہوا۔ اس کے خالو نواب ظفریاب خان مظفر جنگ نے اس کی پرورش کی۔ فراسو کے والد نے ایک ہندوستانی عورت سے شادی کی تھی۔ وہ بیگم سمرو (Sumero) کی عدالت سے وابستہ تھا۔ کلیات فراسو، لالہ سری رام کی لائبریری میں تھا۔ اس کے دیوان کا نام 'گنبدِ گیتی نما' ہے۔ اس کا ایک قصیدہ 'مقولات تعالیٰ' کے نام سے تصوف اور خدا کے بارے میں تھا۔ فراسو کا کلام مرتب ہوسکا اور نہ ہی شائع ہوا۔ فراسو کے استاد خیراتی خان دل سوز مقیم علی گڑھ تھے جو شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ فراسو کی ایک حمدیہ مثنوی کے چند اشعار جن میں حمد و مناجات کے ملے جلے مضامین ملتے ہیں، درج ذیل ہیں:

خدایا کر مجھے وحدت سے آگاہ
اسیرِ دام کثرت ہوں میں ہر راہ
گناہوں سے نہایت ہوں میں دل ریش
مثل ہے کردنی خویش آمدہ پیش
کر اپنا فضل اب مجھ پر نہایت
سجھا دے اب مجھے راہ ہدایت
تو ہی تو چارۂ بے چارگاں ہے
تو ہی قوت دہِ ہر ناتواں ہے
رکھ اپنی ہی محبت میں ہمیشہ
مرے دل کو تو کر دے عشق پیشہ
مجھے الفت میں تو دیوانہ کر دے
شرابِ عشق سے مستانہ کر دے
فراسو ہے تری الفت کا طالب
کہ تیری ذات ہے ہر شے پہ غالب

مندرجہ بالا اشعار سے فراسو کی فارسی دانی، مہارت شعر گوئی اور توحید فہمی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔

**شور میرٹھی** (1894-1823) George Poech 'Shore' فرانسیسی تھا۔ شور کے آبا و اجداد فرانس سے آکر ریاست گوالیار میں ملازم ہوئے تھے۔ اپنے دور کے معروف شاعر تھے۔ ان کی وفات پر داغ نے قطعہ وفات لکھا۔ شور چھ دیوان اردو اور ایک فارسی دیوان کے خالق تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

چلیں گے کیونکر اٹھا کے سر پر ٹلے گا دل سے یہ بار کیونکر
کہ ہے گناہوں کا بوجھ بھاری الٰہی توبہ الٰہی توبہ
ہوئے تھے پی کر ہم ایسے غافل کہ خوفِ عقبیٰ رہا نہ اے دل
کیا تھا کیوں شغلِ بادہ خواری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

سکسینہ شور کے اسلوب شعری اور اردو و فارسی پر اس کی کامل دستگاہ کی بابت لکھتے ہیں:

As a poet shore occupies a very high niche in the temple of Anglo Indian Urdu Poetry. He has the rare distinction of writing with ease in Persian and Urdu. He has a remarkable knowledge and considerable command over these languages and wrote well as copiously."

**آزاد، الیگزنڈر ہیڈرلی** (1829-1861) نے صرف بتیس برس کی عمر پائی۔ وہ نواب زین العابدین خان عارف کے شاگرد تھے۔ انھوں نے عارف کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ سکسینہ نے ان کی شاعری کا جو انتخاب دیا ہے۔ اس میں سے 'حمد' کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

زہے وحدت وہی دیر و حرم میں جلوہ آرا ہے
ازل سے محو ہوں جس کے جمالِ حیرت افزا کا

**حکیم ایلس ڈی سلوا عاصی** بقول سکسینہ Hakim Ellice De Sylva Asi، بھوپال کے ڈی سلوا شاخ کے شعرا میں بہترین شاعر تھے۔ وہ پرتگالی النسل تھے۔ ان کے کلام سے حمد کی دلکش اور معیاری مثالیں دستیاب ہیں مثلاً:

گل و گوہر تو کیا ہر شے میں ہے جلوہ عیاں تیرا
خدا تو بے نشاں تھا پر ملا ہم کو نشاں تیرا
پکارا دیر میں ناقوس سے تجھ کو برہمن نے
حرم میں نام زاہد نے لیا وقت اذاں تیرا
تیری موجودگی ہر شے کے جز و کل سے ثابت ہے
مگر حسرت یہ ہے دل میں نہیں ملتا نشاں تیرا

حمدیہ رباعی کی ردیف ہی 'قادر مطلق' ہے۔ کہتے ہیں:

اب موقع امداد ہے یا قادرِ مطلق
شیطاں ستم ایجاد ہے یا قادرِ مطلق
مظلوموں پہ بیداد ہے یا قادرِ مطلق
فریاد ہے! فریاد ہے! یا قادرِ مطلق

**ملیکہ** Malika اینگلو انڈین شاعرات کی فہرست میں Armenian Malika کا نام حمد گو شاعرات میں لیا جاسکتا ہے۔ ملکہ کلکتہ میں رہتی تھی۔ معروف رقاصہ، مغنیہ اور شاعرہ تھی۔ دیوان 'مخزن الفت ملکہ' کے نام سے شائع ہوا۔ جو تاریخی نام ہے اور اس سے 1303ھ برآمد ہوتے ہیں۔ حضرت شوخی اور داغ ملکہ کے دادا استاد تھے۔ نمونہ حمد ملاحظہ ہو:

بخشے گا ہر گناہ وہ عصیاں شعار کا
بے حد ہے رحم بندوں پہ پروردگار کا
تر دامنی سے اپنی نہیں غم مجھے ذرا
بحر کرم ہے جوش پہ آمر زگار کا
ملکہ ہے جس کے ورد زباں نامِ کبریا
صدمہ نہ ہوگا اس کو لحد کے فشار کا

غیر مسلم شعرا کے کلام سے مندرجہ بالا مثالوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے حمدیہ و مناجاتی کلام میں ان کا بھی نا قابل نظر انداز حصہ ہے۔

■

**Sadia Hasan Balooch**, Lahore, Pakistan

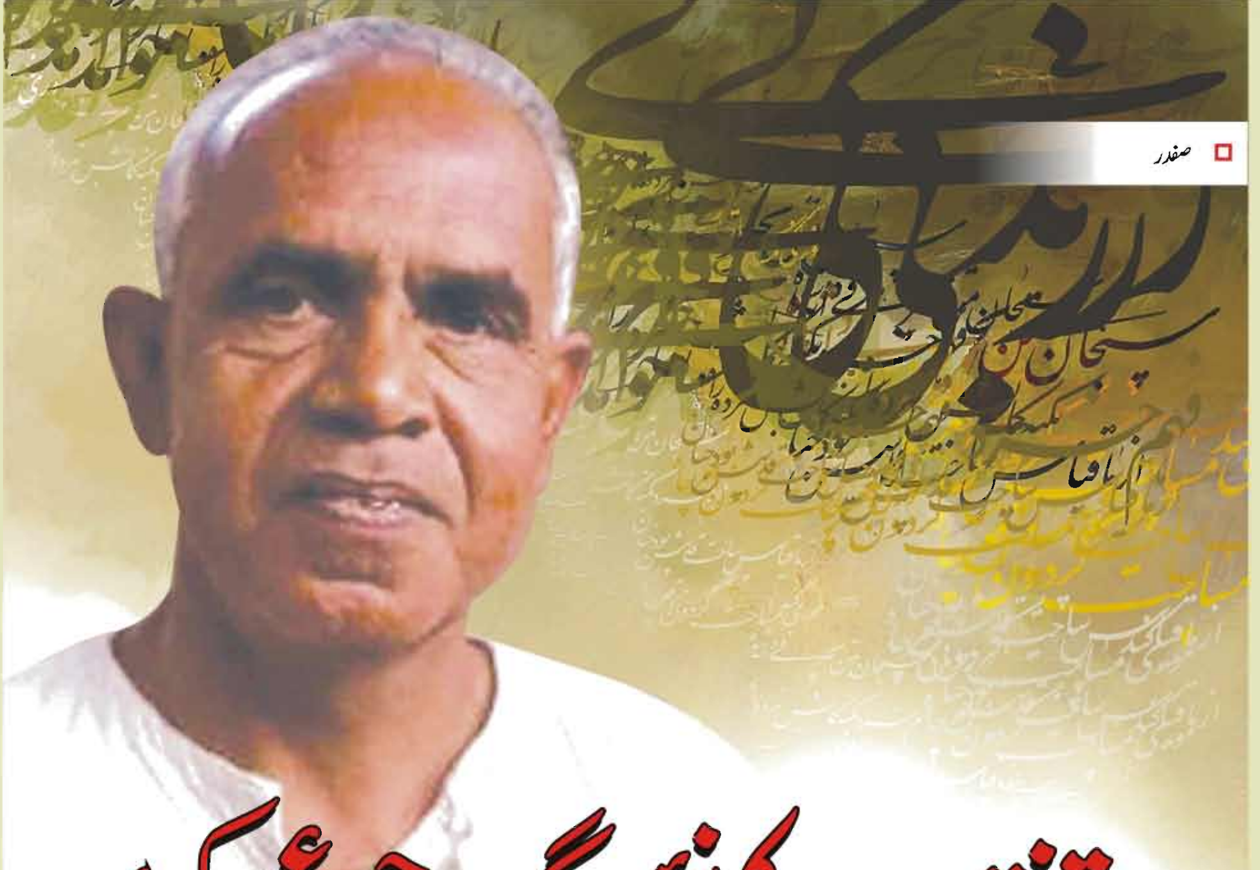

# اردو تنقید کی نئی رہ گزر۔ حسن عسکری

صفدر

اردو میں ترقی پسند تحریک بڑی دھوم دھام سے داخل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو شعروادب کی جملہ اصناف پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ اردو تنقید کے میدان میں ترقی پسندوں کے پیش روؤں نے اس طوفان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر یہ سعی رائیگاں ثابت ہوئی۔ ترقی پسندوں کی گھن گرج کا مقابلہ کرنے کے لیے جس تیز وطرار ذہین، طنز سے بھرپور دھاردار زبان، وسعت مطالعہ، مدلل گفتگو کی ضرورت تھی وہ ان بزرگوں کے پاس نہ تھی۔ ان ہتھیاروں سے لیس ہوکر حسن عسکری اردو تنقید کے افق پر نمودار ہوئے اور ادب کے غیرادبی معیاروں کے خلاف صف آرا ہوگئے۔

حسن عسکری کے اسلوبِ نگارش سے بعض اہلِ علم کبیدہ خاطر ہوئے مگر ہم سنجیدگی سے سوچیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس اسلوب کے بغیر ترقی پسندوں کا مقابلہ ممکن نہیں تھا۔ اس میں کچھ تو حسن عسکری صاحب کی انانیت، اور وسعتِ مطالعہ کو دخل ہے اور کچھ ترقی پسندوں کی گھن گرج اور ادّعایت کا ردِعمل ہے۔

حسن عسکری نے فن پارے کے معروضی مطالعے پر زور دیا۔ ترقی پسند تحریک کا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ فن پارہ سوشلسٹ طرزِ فکر کی نمائندگی کرتا ہے یا نہیں؟ اسی کو معیار بنا کر ترقی پسند ناقدین فیصلے دیتے رہے ہیں۔ عسکری نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ ذیل میں چند اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں جن کی روشنی میں ان کے نظریہ تنقید کو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ 'آدمی اور انسان' میں رقمطراز ہیں:

''مجھے نہ تو افسانہ نگار کہلانا پسند ہے نہ تنقید نگار، میں تو اپنے آپ کو اس زمرے میں شامل سمجھتا ہوں جس کا نام ایک فرانسیسی ناول نگار نے Poor Little Buggers رکھا

**حسن عسکری کے اسلوبِ نگارش سے بعض اہل علم کبیدہ خاطر ہوئے مگر ہم سنجیدگی سے سوچیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس اسلوب کے بغیر ترقی پسندوں کا مقابلہ ممکن نہیں تھا۔ اس میں کچھ تو حسن عسکری صاحب کی انانیت، اور وسعتِ مطالعہ کو دخل ہے اور کچھ ترقی پسندوں کی گھن گرج اور ادّعایت کا ردِعمل ہے۔**

ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ تو قاضی ہیں نہ مفتی ہیں نہ چوکیدار۔ بس اتنی اہلیت ضرور رکھتے ہیں کہ جو کچھ دیکھا اسے کہہ دیتے ہیں۔''(1)

اسی مضمون میں رقمطراز ہیں:

''چونکہ میں طرح طرح کی پسندیوں سے متعلق کہنے جا رہا ہوں اس لیے میں پڑھنے والوں کو اتنا اور بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں انھیں دیر کی طرف بلا رہا ہوں نہ حرم کی طرف۔ چند باتیں دیکھ کر یا چند کتابیں پڑھ کر میرے اندر جو ردِعمل پیدا ہوا ہے، میں تو اسے صرف بیان کر رہا ہوں۔ یہ ردِعمل دوسروں کے لیے کہاں تک قابلِ قبول ہے، اس کا خیال رکھنا میرے لیے غیرضروری ہے۔ بلکہ اگر میں اس کا خیال رکھ کر لکھنے لگوں تو میری حیثیت ایک لکھنے والے کی نہیں رہے گی، کچھ اور ہوجائے گی۔''

عہدِ سرسید کی تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے مضمون 'استعارے کا خوف' میں تحریر فرماتے ہیں:

''ادب میں ایک شریعت نافذ ہوئی ہے اور ادب سے تین مطالبات کیے گئے۔

1. ادب اثرانگیز ہو یعنی جذبات کو فی الفور حرکت میں لائے۔
2. اصلیت پر مبنی اور عقل کے دائرے میں بند ہو۔

3. مفید اور کارآمد خیالات پیش کرے... اور مولانا حالی۔ ان تک کو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ ہمارے ادب کا بڑا حصہ جذبات سے خالی ہے۔ اگر ادب جذبات سے خالی ہے تو کیوں؟ اس میں جذبات کی جگہ اور کیا ہے؟ جذبات کی کمی کے باوجود یہ ادب واقعی ادب ہے یا نہیں؟ ان سوالوں پر حالی کی نسل نے کبھی غور نہیں کیا۔"(2)

ان اقتباسات سے ہم درج ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں: (1) نقاد، قاضی، مفتی اور چوکیدار نہیں ہوتا (2) وہ بنے بنائے اصولوں اور مطالبوں کو مطالعہ شعر کے لیے غیر ضروری اور غیر تنقیدی خیال کرتے ہیں (3) وہ نت نئے شعری تجربات کے لیے بھی اپنے ذہن کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔ ایک فن پارے کو کیا ہونا چاہیے؟ وہ اس طریقِ تنقید کے مخالف ہیں۔ اس کے برعکس ایک فن پارے میں کیا ہے؟ اس کی تلاش و جستجو ان کا مطمحِ نظر ہے۔

شاعر کیا ہے؟

حسن عسکری تخیل کو شاعری کی اساس مانتے ہیں تخیل کے عمل کے بغیر فن پارہ وجود میں نہیں آسکتا۔ اس کے بغیر فن پارہ فن پارہ نہیں بنتا۔ بلکہ مردہ لفظوں کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون 'حالی کی مناجاتِ بیوہ' مشمولہ 'آدمی اور انسان' میں لکھتے ہیں:

"اگر ادب کی افادیت ضروری قرار دی جائے تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ شعر کی افادیت شاعر کے خلاق ذہن کا ایک ادنیٰ پہلو ہے اور اس کے تخیل سے الگ ہو کر وجود میں نہیں آسکتی۔"

اس کتاب میں شامل ایک مضمون فن برائے فن میں رقم طراز ہیں:

"جب تک حقیقت پر انسانوں کے تخیل کا عمل نہیں ہوتا وہ مردہ رہتی ہے۔"

حسن عسکری موضوعاتی شاعری کو شاعری تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہر تجربہ شعر نہیں بن پاتا۔ تجربات جب تک شاعر کے جذبات و احساسات میں رچ بس نہ جائیں وہ شعر نہیں بن سکتے۔ اپنے مضمون 'حالی کی مناجاتِ بیوہ' میں رقمطراز ہیں:

"اچھا شاعر ہر چھوٹے بڑے تجربے کی فوری تجسیم کے لیے بے قرار نہیں رہتا۔ اس میں اتنا ضبط ہوتا ہے کہ وہ ان تجربات کو اپنے اندر جذب ہونے دے اور بعد میں ان ہی مدد سے کسی بڑے شعری مقصد کے حصول میں صرف کرے۔"

اس طرح تجربات شاعر کی شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں اور کسی اور تجربے کے وسیلے سے ایک نئے شعری قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ واث علوی کے طویل مضمون 'کنواں

اور پانی کی ٹنکی' میں عسکری کے اسی خیال کی بازگشت ملتی ہے۔

حسن عسکری صاحب کے نزدیک شاعری کا اصل موضوع 'آدمی' ہے۔ وہ آدمی اور انسان میں فرق کرتے ہیں۔ تہذیب کا پروردہ انسان ان کے نزدیک بے روح ہے۔ ہر لمحہ، ہر چیز کو حیرت سے دیکھتا اور مسلسل اپنے حواس کے وسیلے سے اردگرد کی دنیا کو ایک نئے ڈھنگ سے محسوس کرتا آدمی ان کی توجہ کا مرکز ہے۔ وہ اس آدمی کو شاعری اور ادب کا اصل موضوع خیال کرتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اپنے مجموعہ مضامین 'آدمی اور انسان' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

"جب آدمی کو انسان بننا میسر آجاتا ہے تو وہ اس طرح بولنے لگتا ہے۔ 'تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی'

**یوں ہونے کو تو ہر چیز شاعری کا موضوع بن سکتی ہے۔ لیکن بڑی شاعری کا موضوع اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک اس میں وہ عناصر شامل نہ ہو جائیں جن کا تعلق انسان کی ذہنی اور روحانی زندگی سے بہت گھرا اور بامعنی نہ ہو۔"**

2. اسی کتاب میں شامل اپنے مضمون 'آدمی اور انسان' میں لکھتے ہیں:

میں انسان پرستی سے اس لیے ڈرتا ہوں کہ اس کے بعد آدمی کے ذہن میں لطیف، وسیع اور گہرے تجربات کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور آدمی کئی اعتبار سے ٹھس بن کر رہ جاتا ہے۔ جب انسان کی صفات پہلے ہی سے مقرر ہیں تو اس کے بارے میں نئے تجربات ہی کیا ہو سکتے ہیں؟ جو چیز پہلے ہی سے مکمل ہے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ انسان اور انسانیت کے موجودہ تصورات سے بڑا ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ انسان خارجی زندگی جیتا ہے اور آدمی ذہنی جذبات اور روحانی سطح پر اپنے وجود کا اثبات مہیا کرتا ہے۔ حسن عسکری اس وجود کو بڑی شاعری کا موضوع خیال کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا مضمون ہی میں سائنسی کارناموں پر نظمیں لکھنے کی گورکی کی نصیحت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ انسان کی یہ سرگرمیاں بھی عزت کے لائق ہیں اور سائنس دانوں کے کارنامے اس قابل ہیں کہ ان پر نظمیں لکھی جائیں لیکن ان چیزوں کو 'نئی دلاورانہ' شاعری کا ایک اہم ترین موضوع قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہر اس چیز کو اہم سمجھا جا رہا ہے جس کا تعلق انسان کی خارجی زندگی سے ہے۔ یوں ہونے کو تو ہر چیز شاعری کا موضوع بن سکتی ہے۔ لیکن بڑی شاعری کا موضوع اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک اس میں وہ عناصر شامل نہ ہو جائیں جن کا تعلق انسان کی ذہنی اور روحانی زندگی سے بہت گہرا اور بامعنی نہ ہو۔"

آدمی اور انسان کی تفریق کا یہ مطلب نہیں کہ حسن عسکری علم اور سائنسی ترقی سے نالاں ہیں اور آج کے مہذب انسان کو غاروں کے پناہ گزیں آدمی کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ یا وہ انسان کی تمام تر ترقیات کو دریا برد کرنے کے درپے ہیں۔ آدمی سے مراد ذہنی، جذباتی اور روحانی طرز زندگی کے اثبات کی طرف اشارہ ہے۔ انسان ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہے، مگر آدمی کے سامنے کی چیزوں میں ایسے گوشے دریافت کرتا ہے جو روحانی اور جذباتی سطح پر قلاش انسان کو نظر نہیں آتے۔ دراصل یہ 'آدمی' خود فنکار ہے اس آدمی کو انسان کے قالب میں زندہ رکھنا فنکار کی ذمے داری ہے۔ اگر فنکار اپنے اندر حیرانیوں کی دنیا آباد نہ کر سکا تو وہ تخلیق کار نہیں ہو سکتا۔ گویا وہ مظاہر کے ان گوشوں تک رسائی میں ناکام ہے جو فنکار کی حیثیت سے ایک فنکار ہی دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ اسے تخلیق کار ہونے کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

حسن عسکری کے سلسلے میں بھی لوگ اس جہانِ حیرت

کے آباد کرنے کو فن کی اساس سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیقی زبان برتی ہوئی، فرسودہ اور بے روح نہیں ہوتی۔ بلکہ زندہ متحرک اور حیرتوں کی ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ اپنے ایک مضمون 'قحطِ افعال' مشمولہ 'ستارہ اور بادبان' میں لکھتے ہیں:

''ادب میں لفظ ہی تجربہ ہوتے ہیں۔ نظم ہو یا افسانہ تجربے کو محض لشتم پشتم بیان کر دینے سے بات نہیں بنتی۔ یہاں موضوع یا تجربہ پوری نظم یا افسانے میں ہی نہیں بلکہ ہر حرف اور فقرے میں موجود ہونا چاہیے۔ اگر لکھنے والے میں اپنے تجربے سے سچی اور تخلیقی دلچسپی ہے تو اس کا ثبوت صرف یہی ہے کہ اس کے الفاظ ایسے نہ ہوں جیسے لاشوں سے گڑھا پاٹ دیا گیا ہو... سچے شاعر اور وحشی انسان دونوں میں ایک بات مشترک ہے یعنی دونوں کو ہر چیز جاندار نظر آتی ہے۔''

'آدمی اور انسان' کی تفریق کے ساتھ جو چیز عسکری صاحب کے نظریات کی اساس قرار دی جاتی ہے وہ ان کا نظریہ 'فن برائے فن' ہے۔ مقصدی اور افادی ادب جس کا بیج سرسید اور حالی نے بویا تھا عسکری کے عہد میں ایک تناور درخت بن گیا تھا۔ عسکری نے اس درخت پر بھرپور ضربیں لگائیں اور اہلِ قلم کو اس مسئلے پر نئے سرے سے غور و فکر پر مجبور کیا۔

حسن عسکری کے یہاں فن برائے فن تخیّل کی بے سمت اڑان، زندگی سے فرار اور خیالی دنیا کی آبادکاری کا نام نہیں ہے۔ فن برائے زندگی کے علمبردار زندگی کو اپنی میراث سمجھتے اور اپنے نقطہ نظر سے سمجھاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جو لوگ فن برائے زندگی کا نعرہ نہیں لگاتے ان کے ادبی تصورات کا گویا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہمیں دوسروں کے بیانات پر تکیہ کرنے کے بجائے براہِ راست عسکری سے ملاقات کرنی چاہیے۔ اب ان کی تحریروں سے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ فن برائے فن سے عسکری کیا مراد لیتے ہیں۔

اپنے ایک مضمون فن برائے فن، مشمولہ 'انسان اور آدمی' میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

'فن برائے فن کا مقبول ترین تصور یہ ہے کہ تمام دلچسپیوں سے بے نیاز ہو کر بس جمالیات کے پیچھے پڑا رہے۔ یہ تصور اس لحاظ سے تو مہمل ہے کہ خالص فن کا مکمل نمونہ کم از کم ادب میں تو دستیاب نہیں ہوتا... اس بھدی شکل میں یہ نظریہ شاید ہی کسی فنکار نے قبول کیا ہو۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جب لوگوں کو فن اور دوسرے عوامل کا فرق جاننے کی فکر ہوئی تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فن کی روح جمالیاتی تسکین ہے۔

یہاں عسکری ایلیٹ کے نظریے کے قریب آجاتے ہیں کہ ادب کو محض ادب کے اصولوں سے نہیں جانچا جا سکتا مگر ایک فن پارہ ادب ہے یا نہیں۔

اس کا فیصلہ جمالیاتی اصولوں ہی کے تحت ممکن ہے۔

فن برائے زندگی کے علمبردار زندگی کو اپنی میراث سمجھتے اور اپنے نقطہ نظر سے سمجھاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جو لوگ فن برائے زندگی کا نعرہ نہیں لگاتے ان کے ادبی تصورات کا گویا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہمیں دوسروں کے بیانات پر تکیہ کرنے کے بجائے براہِ راست عسکری سے ملاقات کرنی چاہیے۔ اب ان کی تحریروں سے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ فن برائے فن سے عسکری کیا مراد لیتے ہیں۔

ادب اور زندگی کا نعرہ لگانے والے اہلِ قلم نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ زندگی جیسے ان کی منکوحہ ہے۔ جو اہلِ قلم ان کے ہم آواز نہیں وہ سب زندگی سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں جب کہ واقعہ یہ ہے کہ نظریات کے کابوس میں بند یہ حضرات خود زندگی سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چار دیواری میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ حسن عسکری جو بڑے شد و مد سے فن برائے فن کی وکالت کرتے ہیں، فن اور زندگی کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

''شاعری میں عظمت نہ تو وجودِ محض کے احساس کے بغیر آسکتی ہے نہ ہستی کے تفصیلی شعور کے بغیر لیکن ہستی کا شعور کھو دینے کے بعد تو ادب کاغذ کا پھول رہ جاتا ہے۔'' (قحط افعال، ستارہ اور بادبان، علی گڑھ 77، ص 17)

ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیں: عسکری لفظ کو موضوع اور معنی سے آزاد کرنے کی کوشش کے خلاف ہیں کہ ادب موضوع اور معنی سے دامن کش نہیں ہو سکتا۔

یہ تصور اس لحاظ سے تو مہمل ہے کہ خالص فن کا مکمل نمونہ کم از کم ادب میں تو دستیاب نہیں ہوتا... اس بھدی شکل میں یہ نظریہ شاید ہی کسی فنکار نے قبول کیا ہو۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جب لوگوں کو فن اور دوسرے عوامل کا فرق جاننے کی فکر ہوئی تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فن کی روح جمالیاتی تسکین ہے۔

''اس دور میں ایک عجوبہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ بغیر مواد کے لوگ تخلیق کی کوشش کر رہے ہیں۔ لفظ اس طرح آزاد اور خودمختار نہیں ہیں جس طرح لکیریں یا آوازیں۔ لفظ خالص آواز نہیں ہیں نہ وہ فطری ہیں بلکہ انسان کی ایجاد ہیں... وہ ہمارے ذہن کو ایک خالص تصور اور ایک خاص معنی کی طرف لے جاتے ہیں... لفظوں کو خالص بنانے کے لیے ہمیں ان کے مقصد کو نظر انداز کرنا پڑے گا اور اس کے بعد لفظوں اور آوازوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہ جائے گا۔ یعنی ادب موسیقی میں مدغم ہو کر غائب ہو جائے گا۔ تو جہاں تک ادب کا تعلق ہے اگر ادب کو اپنی ہستی برقرار رکھنی ہے تو وہ موضوع اور معنی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ معنی کے بغیر ادب پارہ محض گولر کا پھول ہے۔'' (ہیئت یا نیرنگِ نظر، مشمولہ، آدمی اور انسان علی گڑھ، 76، ص 22)

کیا یہ زندگی سے فرار ہے؟ کیا فن برائے فن کا مطلب یہی ہے کہ حیات، تجرباتِ حیات اور احساسات سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے؟ ظاہر ہے سب کا جواب نفی میں ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ نظریے کی کال کوٹھری سے آزادی کی کوشش میں فنکار اس حد تک نکل گئے کہ لفظ کو آواز محض تک لے جانے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ہمارے یہاں بہت کم، اور مغرب میں علامت پسندوں کے یہاں زیادہ مگر عسکری اس تصورِ فن کے قائل نہیں ہیں۔

غرض جب عسکری فن پاروں کے معروضی مطالعے پر زور دیتے ہیں وہ بنے بنائے اصولوں کی روشنی میں فن پاروں کا جائزہ نہیں لیتے بلکہ کھلے دل کے ساتھ یہ جاننے کے لیے فکرمند ہوتے ہیں کہ فن پارے میں نقاد کے مطالعات و تعصّبات کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ وہ نئے تجربات کو خوش آمدید کہتے ہیں آدمی اور انسان میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

مجھے تو ناصر کاظمی کی زبان سے یہ سوال سن کر بڑا اطمینان ہوا کہ صاحب! تغزل کیا چیز ہوتی ہے؟ (آدمی اور انسان ص 173)

زبردست علمی استعداد، اظہار کی بے پناہ صلاحیت، مغربی روایات اور نت نئی تحریکات سے آگہی نے عسکری کو جہاں وسعتِ قلب عطا کی وہیں ان کی شخصیت میں انانیت، خوداعتمادی، خوئے فتح مندی کے عناصر کا بھی اضافہ کیا۔ وہ اپنے مضمون 'ہیئت یا نیرنگِ نظر مشمولہ آدمی اور انسان، میں بودلیئر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

الزام دینا، مخالفت کرنا اور انصاف کا مطالبہ کرنا بھی کیا بد مذاقی نہیں ہے؟ (آدمی اور انسان ص 67-68)

بودلیئر کا جملہ عسکری کے اسلوب کی اساس ہے۔

■

**Dr. Safdar**, B-18, Kohe-Noor Colony, Near Masjid, Pairadise Colony, Amravati - 444601 (MS)

ذاکر فیضی

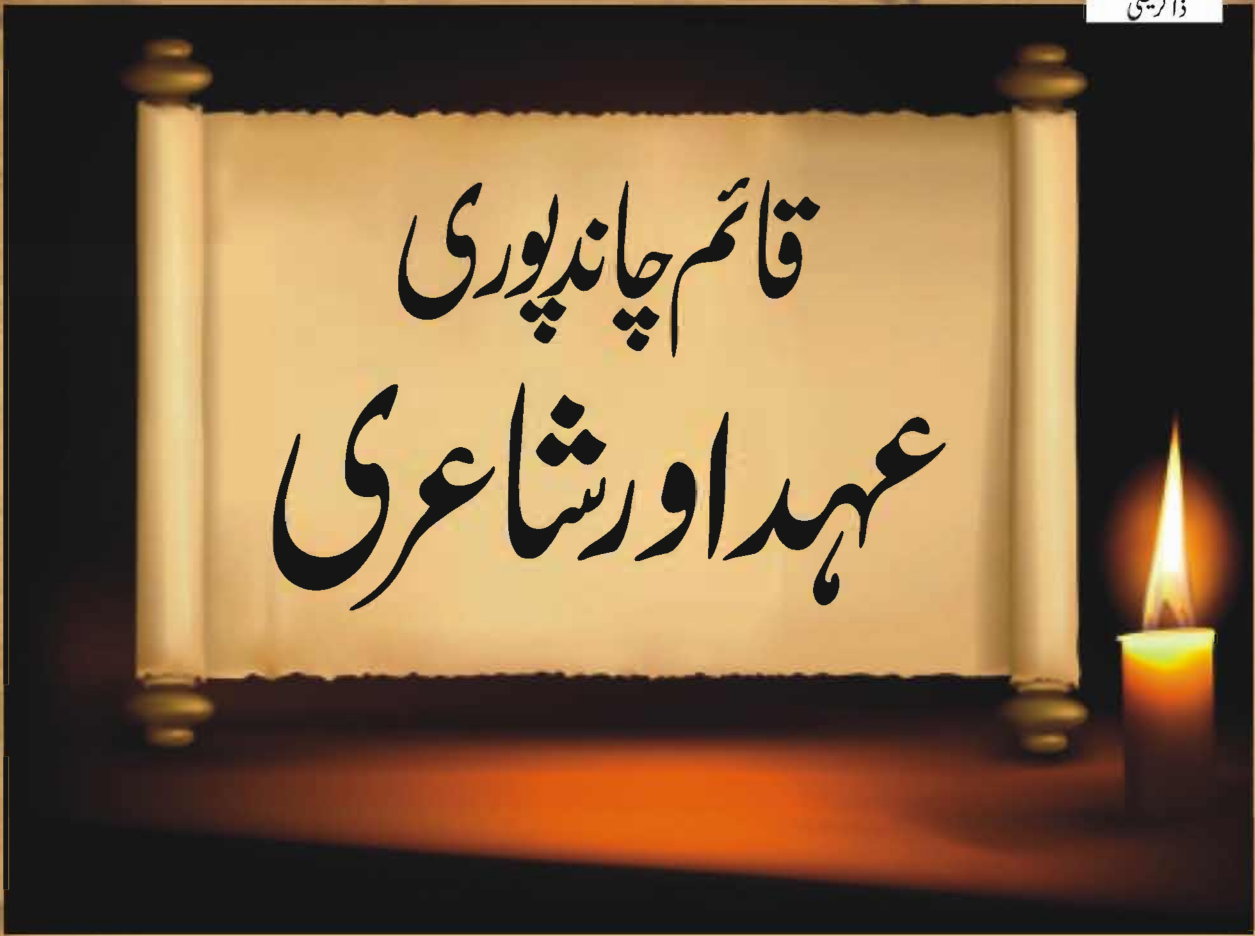

# قائم چاند پوری
# عہد اور شاعری

ہر شاعر کا اپنا ایک عہد ہوتا ہے، معاشرہ ہوتا ہے، تہذیب ہوتی ہے۔ ہر شاعر اپنے فن کے ذریعے اسی سماج، رہن سہن، رسم و رواج اور معاشرے کی تہذیب و اخلاقیات کے علاوہ اس عہد کے انسانوں کی نفسیاتی الجھنوں کا اظہار کرتا ہے۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو اور کسی بھی صنف سخن سے تعلق رکھتا ہو اپنے عہد اور اس عہد کے انسانوں کے ذہنوں کی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ قائم چاند پوری کی شاعری کو سمجھنے کے لیے پہلے ہم ان کے عہد اور اس عہد کی سیاست پر گفتگو کریں گے۔

قائم چاند پوری 1735 میں چاند پور، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ محمد شاہی عہد میں چاند پور، ضلع مراد آباد کا ایک قصبہ تھا۔ قائم چاند پوری کے والد نے ان کا نام قیام الدین رکھا، لیکن نانا نے ان کا نام محمد قائم تجویز کیا۔ قائم نے اپنے تذکرے 'مخزن نکات' میں خود اپنا نام قیام الدین تحریر کیا ہے۔ قائم چاند پوری نے اپنے زمانے میں رائج تعلیم کے مطابق اپنے دادا اور نانا سے تعلیم حاصل کی۔ قائم چاند پوری نے 1795 میں وفات پائی۔[1]

کہا جاتا ہے کہ دلّی عالم میں انتخاب شہر ہے۔ اسی لیے فنکار، کلاکار اور کاریگر وغیرہ کافی عرصۂ دراز سے دلی کا رخ کرتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ دلّی آکر ہر ایک چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے قائم چاند پوری بھی نوجوانی ہی میں دلّی چلے آئے اور یہاں پر انھوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ عربی میں مہارت حاصل تو نہیں کر سکے لیکن اتنی تعلیم ضرور حاصل کر لی تھی کہ بعد میں امروہہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد قائم چاند پوری شاہی توپ خانے میں ملازم ہو گئے تھے اور احمد شاہ کے زمانے تک ملازم رہے اور داروغہ کے عہدے تک پہنچے۔[2]

قائم چاند پوری کا دور وہی دور تھا جو ہندستان کی تاریخ کا بدترین دور مانا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات 1707 میں ہوئی۔ اس کی وفات کے بعد حکومت کے خزانے کی ایسی حالت نہیں رہ پائی تھی، جیسی اکبر اعظم، جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں تھی۔ جس کی خاص وجہ دکن کی جنگیں تھیں۔ مزید یہ کہ اورنگ زیب کے بعد جو حکمراں تخت نشین ہوئے، اس سے پہلے کہ سلطنت کی معاشی اور سیاسی اصلاح کرتے، انھوں نے تخت شاہی کے حصول کے لیے آپس میں ہی جنگیں شروع کر دیں۔ جس کی وجہ سے تباہی و بربادی ہوئی۔ اورنگ زیب کا بڑا بیٹا معظم بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ اس کا ذاتی کردار تو شریفانہ تھا مگر سیاست میں شرافت سے کام نہیں چلتا اور دوسری طرف اس کی ضعیفی نے اس کے حوصلوں کو پست کر رکھا تھا۔ اس لیے اس نے ہندستان کی عظیم الشان حکومت کو پستی کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔

1712 میں معظم کا بیٹا جہاندار شاہ اپنے بھائیوں کو قتل کرا کر تخت پر قبضہ کر بیٹھا۔ وہ بہت عیش پرست تھا، جس کی وجہ سے خزانہ خالی ہو گیا۔ 1713 میں فرخ سیر سید برادران کی مدد سے جہاندار شاہ کو قتل کر کے تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد فرخ سیر کو امرا نے راستے سے ہٹایا۔

1719 میں سید برادران نے تین شہزادوں کو ایک کے بعد ایک تخت شاہی پر بٹھایا لیکن وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے اور پھر 1719 میں ہی باری آئی روشن یعنی محمد شاہ رنگیلا

کی۔ جس کو سید برادران نے سترہ سال کی عمر میں بادشاہ بنایا۔ لیکن تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے ایسی حکمت عملی اپنائی کہ سید برادران کا ہی خاتمہ کر دیا۔ مگر اس کے بعد محمد شاہ شراب وشباب میں ایسا ڈوبا اور رنگینیوں میں ایسا کھویا کہ رنگیلا بادشاہ کہلایا اور اس کی رنگ رلیوں کو بے رنگ کرنے کے لیے نادر شاہ آدھمکا۔ وہ آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح مغل سلطنت کا معمولی سا باقی رہ گیا 'رنگ' بھی لے اڑا۔ اسی افراتفری میں دکن، اودھ اور بنگال کے صوبیداروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا، نادر شاہ کے حملے کے بعد اسی طرف سے ایک اور مصیبت آئی جس کا نام احمد شاہ ابدالی تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے دلّی کی عوام سے سب کچھ چھین لیا۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ 1748 میں تخت پر بیٹھا۔ احمد شاہ کے مزاج میں بیوقوفی کی حد تک لڑکپن تھا۔ خالد علوی اپنی کتاب 'قائم چاند پوری' میں لکھتے ہیں:

''......اپنے باپ سے بڑھ کر عیش پرست اور نکما تھا۔ اس کی ماں اودھم بائی ایک طوائف تھی جس کو نواب قدسیہ بیگم عالم صاحبۃ الزمانی جیسے خطابات دیے گئے۔ تمام فرائض حکومت ایک خواجہ سرا جاوید ادا کرتا تھا۔ اودھم بائی کے ایک جاہل اور ناشائستہ بھائی کو چھ ہزاری منصب عطا کیا گیا تھا۔ احمد شاہ کے مزاج میں حد درجہ لڑکپن تھا۔ اس نے اپنے تین سال کے بیٹے کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا اور ایک سالہ بچہ نائب بنا کر لاہور بھیجا۔''[3]

قائم چاند پوری نے ایسی ہی بیوقوفیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک شہرآشوب میں کہا ہے:

دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا
کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا
اس خاندان میں حمق کا جاری ہے سلسلا
دوں دوش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا
آخر گدھا پن ان کا ترا داد خواہ ہے

بادشاہوں کا یہ 'گدھا پن' ہی تھا جس کی وجہ سے قائم چاند پوری دیگر شعرا کی طرح دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ قائم کو دہلی چھوڑنے کا ملال تھا۔ روزگار کے علاوہ فضلا کی محبت اور دوستی سے محروم ہو گئے تھے۔ اپنی اس کیفیت کا انھوں نے اظہار اس طرح کیا ہے:

اے گردش زمانہ تری کم روی کے بیچ
یکسر نواح ہند سے شعر و سخن گیا
سودا تو اپنے حال میں مدت سے مست ہے
قائم رہا تھا ایک، سو اپنے وطن گیا

دلّی کی مرکزیت پر جب نادری حملہ اور اس کے بعد بادشاہوں کے قتل اور معزولی کی روایت چل پڑی تو شعرا نے سراسیمہ ہو کر فکر معاش میں ان درباروں کا رخ کیا جو مغلیہ سلطنت کے کھنڈر پر تعمیر ہو رہے تھے یا ہو چکے تھے۔ ان ریاستوں میں شعرا کی قدردانی ہوئی۔ اودھ، ٹانڈہ، رامپور اور فرخ آباد وغیرہ نہ یہ کہ دلّی کے شعرا کو پناہ ملی بلکہ فراغت کی زندگی بھی میسر ہوئی۔ قائم نے ٹانڈہ اور پھر رامپور جا کر نوابوں کا سایۂ عاطفت ڈھونڈا۔

قائم نے جو دور دیکھا وہ سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے بے پناہ پستی اور زبردست انحطاط کا دور تھا لیکن ادبی صورت حال قطعاً مختلف تھی۔ جہاں ایک طرف اس دور کا سیاسی اور سماجی انحطاط اپنی مثال آپ ہے وہیں دوسری طرف شعر وادب کا عروج بھی اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ مثلاً شاعری ایک اجتماعی شوق بن گئی تھی۔ خواص وعام سبھی اس کے دلدادہ تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے [4] کہ مکتب کے لڑکے بھی غزلیں خریدتے تھے، گویا بزرگوں سے لے کر بچوں تک

> **1719 میں سید برادران نے تین شہزادوں کو ایک کے بعد ایک تخت شاہی پر بٹھایا لیکن وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے اور پھر 1719 میں ہی باری آئی روشن یعنی محمد شاہ رنگیلا کی۔ جس کو سید برادران نے سترہ سال کی عمر میں بادشاہ بنایا۔ لیکن تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے ایسی حکمت عملی اپنائی کہ سید برادران کا ہی خاتمہ کردیا۔ مگر اس کے بعد محمد شاہ شراب وشباب میں ایسا ڈوبا اور رنگینیوں میں ایسا کھویا کہ رنگیلا بادشاہ کہلایا اور اس کی رنگ رلیوں کو بے رنگ کرنے کے لیے نادر شاہ آدھمکا۔**

سب اس فن شریف کے اسیر ہو گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مغل بادشاہوں اور امرا نے شعرا کی سرپرستی کی اور خود بھی شاعری کرتے تھے۔ محمد شاہ رنگیلا، شاہ عالم ثانی آفتاب، مرزا جہاں بخت اور سلیمان شکوہ خود بھی شاعر تھے اور شعرا کو انعام واکرام سے نوازتے تھے اور ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کرتے تھے۔

قائم نے مشکل زمینوں میں بڑی رواں اور شوخ غزلیں کہی ہیں۔ قائم نے اپنی شاعری میں اپنے ہم عصروں کی صنعت لفظی ومعنوی کو بھی برتا ہے جس کی خاص وجہ شعرا کے درمیان صنعتوں کے استعمال کو لے کر مقابلہ آرائی تھی۔ قائم نے اپنی شاعری میں رعایت لفظی کے بے شمار نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ چند مثالیں حاضر ہیں:

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا
تیر سا کچھ دل سے گزر کر گیا
ہوتے ترے محال ہے ہم درمیاں نہ ہوں
جب تک وجود شخص ہے سایہ نہ جائے گا
زلف دیکھی ہے کس کی خواب میں رات
ہم سحر تک تھے پیچ وتاب میں رات
سوز پروانہ یوں سنے ہے چراغ
جیسے کانوں میں نیل ڈالا ہے

قائم چاند پوری کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ضرب المثل بن گئے۔ چونکہ اردو میں ایسے شاعروں کی تعداد بہت کم ہے، جن کے اشعار کو اتنی مقبولیت میسر آئی ہو، اس لیے قائم چاند پوری کی اپنے ہم عصر شعرا میں ایک انفرادی حیثیت ہو جاتی ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

یہ وہ اشعار ہیں کہ تقریباً ڈھائی سو سال گزر جانے کے باوجود ان کی مقبولیت اور اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ یہ اور بات کہ راویان ان میں مزاج کے مطابق ترمیم وتحریف کرتے رہے ہیں۔

اکثر شعرا اور فنکار اپنے عہد سے ناخوش رہتے ہیں، شاید یہی وہ چیز ہوتی ہے جو کسی ادیب، شاعر یا فنکار کو تخلیق کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے ایک کامیاب افسانہ، ناول، ایک کامیاب غزل یا کوئی بھی بہترین فن پارہ خلق ہوتا ہے۔ قائم چاند پوری بھی اپنی دنیا سے خوش نہیں تھے یہ اس دور کے فنکاروں، شاعروں کی مجبوری تھی کیوں کہ وہ دور ایک پر آشوب دور تھا اور ویسے بھی جب تک دنیا کے برے پہلو سامنے نہیں آتے ہیں، دنیا کے اچھے پہلو یا اچھی باتوں کا علم نہیں ہو پاتا ہے، وہ پردۂ راز میں رہ جاتے ہیں۔ قائم چاند پوری کہتے ہیں:

کی وفا کس سے بھلا فاحشۂ دنیا نے
ہے تجھے شوق جو اس قحبہ کی دامادی کا

قائم چاند پوری کی شاعری بہت جامع اور ہمہ گیر ہے۔ آج بھی ان کی شاعری ہمارے دلوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ قائم چاند پوری کی شاعری میں جہاں ہم سنجیدگی دیکھتے ہیں وہیں انھوں نے اپنے کلام میں شوخی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کہیں کہیں

ظرافت سے بھی کام لیا ہے، یہ شعر دیکھیں:

دوش کیا دیجیے چور کو قائم
بند گھر کا میں آپ ورنہ کیا
شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر دانہ ہم
پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی
شیخ جی تم نے نہ سمجھی یہ کرامات کی راہ
کیا قیامت ہے نکلنے میں خرابات کی راہ

قائم نے اپنی شاعری میں روزمرہ استعمال ہونے والے الفاظ کا استعمال خوب کیا ہے۔ وہ اپنی بات کو سیدھے سادے اور عام فہم اور سہل ممتنع میں کہنے کو ترجیح دیتے تھے، قائم چاند پوری اپنی بات کو خوبصورتی دینے کے لیے خیالات کا برملا اظہار کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
روبرو میرے غیر سے تو ملے
یہ ستم تو سہا نہیں جاتا

قائم چاند پوری کی شاعرانہ صلاحیت اور عظمت کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم فرماتے ہیں:5؎

''قائم چاند پوری کی عظمت کا راز یہ بھی ہے کہ شعرگوئی کے میدان میں قائم کا ہاتھ، لفظ کی نبض پر رہتا ہے اور پھر اس سے وہ اپنے تخلیقی جوہر کے سہارے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی حقیقی شاعری میں بھی اور قصیدہ، مثنوی، قطعہ اور رباعی کی اس شاعری میں بھی جہاں قادرالکلامی آورد کی مدد سے بھی جادو جگاتی ہوئی چلتی ہے۔''

قائم چاند پوری اپنی شاعری میں تشبیہات واستعارات کا جلوہ بکھیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے اس طرح کے اشعار کو پڑھ کر بخوبی علم ہوتا ہے کہ قائم کو اپنے فن کے استعمال کا ہنر خوب اچھی طرح آتا تھا۔ آپ لکھتے ہیں:

اللہ رے آئینے میں تیرے حسن کا شکوہ
پانی میں ماہتاب کو جیسے جھلک پڑے
تجھ بن طلب خوشی کی ہے یوں دل سے جس طرح
لیلیٰ بغیر چاہے مجنوں سے انبساط

قائم نے اپنی غزلوں میں جس زبان کا استعمال کیا ہے وہ اس عہد کی معیاری زبان کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اپنے ہم عصروں میں قائم درد اور سودا سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔

قائم چاند پوری نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو دلّی میں خان آرزو، مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ حاتم جیسے بڑے شاعر اپنے فن کا مظاہر زبردست طریقے سے کر رہے تھے اور سارے شعرا استاد شاعر مانے جاتے تھے اوران کے علاوہ میر، سودا، درد اور یقین وغیرہ اردو شاعری پر چھائے ہوئے تھے۔ اکثر تذکرہ نگاروں کا ماننا ہے کہ قائم چاند پوری اپنے عہد کے صفِ اول کے شعرا میں شامل تھے، مگر اس بات پر اختلاف کرتے ہیں کہ قائم کا مرتبہ وہی تھا، جو میر تقی میر اور سودا جیسے عظیم استاد شاعر کا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد قائم چاند پوری کو فن شعر گوئی میں مکمل مانتے تھے اور ان کی شاعری کو میر کے مقابل رکھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:6؎

''یہ صاحب کمال چاند پور کے رہنے والے تھے مگر فن شعر گوئی میں کامل تھے۔ ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے، مگر کیا کیجیے کہ قبول عام کچھ اور شے ہے، شہرت نہ پائی۔''

قائم کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ان کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ مختلف تذکرہ نویسوں نے ان کے متعلق

> **اکثر شعرا اور فنکار اپنے عہد سے ناخوش رہتے ہیں، شاید یہی وہ چیز ہوتی ہے جو کسی ادیب، شاعریا فنکار کو تخلیق کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے ایک کامیاب افسانہ، ناول، ایک کامیاب غزل یا کوئی بھی بہترین فن پارہ خلق ہو تاہے۔ قائم چاند پوری بھی اپنی دنیا سے خوش نہیں تھے یہ اس دور کے فنکاروں، شاعروں کی مجبوری تھی کیوں کہ وہ دور ایک پر آشوب دور تھا اور ویسے بھی جب تک دنیا کے برے پہلو سامنے نہیں آتے ہیں۔**

اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بعض تذکروں میں ان کے اشعار بھی منتخب کیے گئے ہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر محمد امین اپنی کتاب قائم اور ان کا کلام میں رقم طراز ہیں:7؎

''مرزا سودا ان کو اپنے دور کے اہم شعرا میں شمار کرتے ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے قائم کا نام درد سے بھی پہلے لکھا ہے:

داغ ہوں ان سے اب زمانے میں
بزم شعرا کے جو ہیں بزم نشیں
یعنی سودا و میر وقائم و درد
لے ہدایت سے تا کلیم وحزیں

ممکن ہے قائم کا نام پہلے رکھنا شعری وزن کی پابندی کے باعث ممکن ہوا ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سودا جیسا بڑا شاعر بھی اس زمانے کے بڑے شعرا کا ذکر کرتے وقت قائم کو نظرانداز نہیں کرسکا۔

ڈاکٹر محمد امین کے اس بیان کو مصدقہ کرنے کے لیے میں یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس اقتباس کو بھی نقل کرنا چاہوں گا، وہ لکھتے ہیں:8؎

''قائم چاند پوری اس دور کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ادب میں ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جس پر میر وسودا چھا جاتے ہیں۔''

اور ڈاکٹر جمیل جالبی آگے یہ بھی لکھتے ہیں:

''قائم اس دور کے سب سے بڑے شاعر نظر آتے ہیں۔ لیکن تاریخ کا مطالعہ چونکہ کسی کو اس کے دور سے خارج کر کے نہیں کیا جاسکتا اس لیے ہم قائم کو اس دور کے پس منظر میں میر وسودا کے ساتھ ہی دیکھیں گے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر امین کے یہ اقتباس پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے دور میں قائم چاند پوری کے ساتھ ہرگز بھرپور انصاف نہیں ہوا ہے اور وہ ادبی مورخین کی بے اعتنائیوں کے مارے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اردو کے ممتاز شعرا سودا، میر اور درد سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ لیکن وہ اس مقبولیت سے محروم ہیں جو ان کے حصے میں آنی چاہیے تھی۔

آج قائم کے شعر ہم نے سنے
ہاں اک انداز کو نکلتا ہے

**حواشی:**


(1) ڈاکٹر محمد امین، قائم اور ان کا کلام، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1983، ص7

(2) ایضاً، ص8

(3) ڈاکٹر خالد علوی، قائم چاند پوری، اردو اکادمی، دہلی 2007، ص22

(4) ڈاکٹر محمد امین، قائم اور ان کا کلام، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1983، ص74

(5) شاہد ماہلی (مرتبہ)، قائم چاند پوری حیات وخدمات، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2007، ص18

(6) ایضاً، ص22

(7) ڈاکٹر محمد امین، قائم اور ان کا کلام، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1983، ص4

(8) ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2011، ص764


■

**Zakir Husain**, Room No.18, Jhelum Hostel, JNU, New Delhi-67

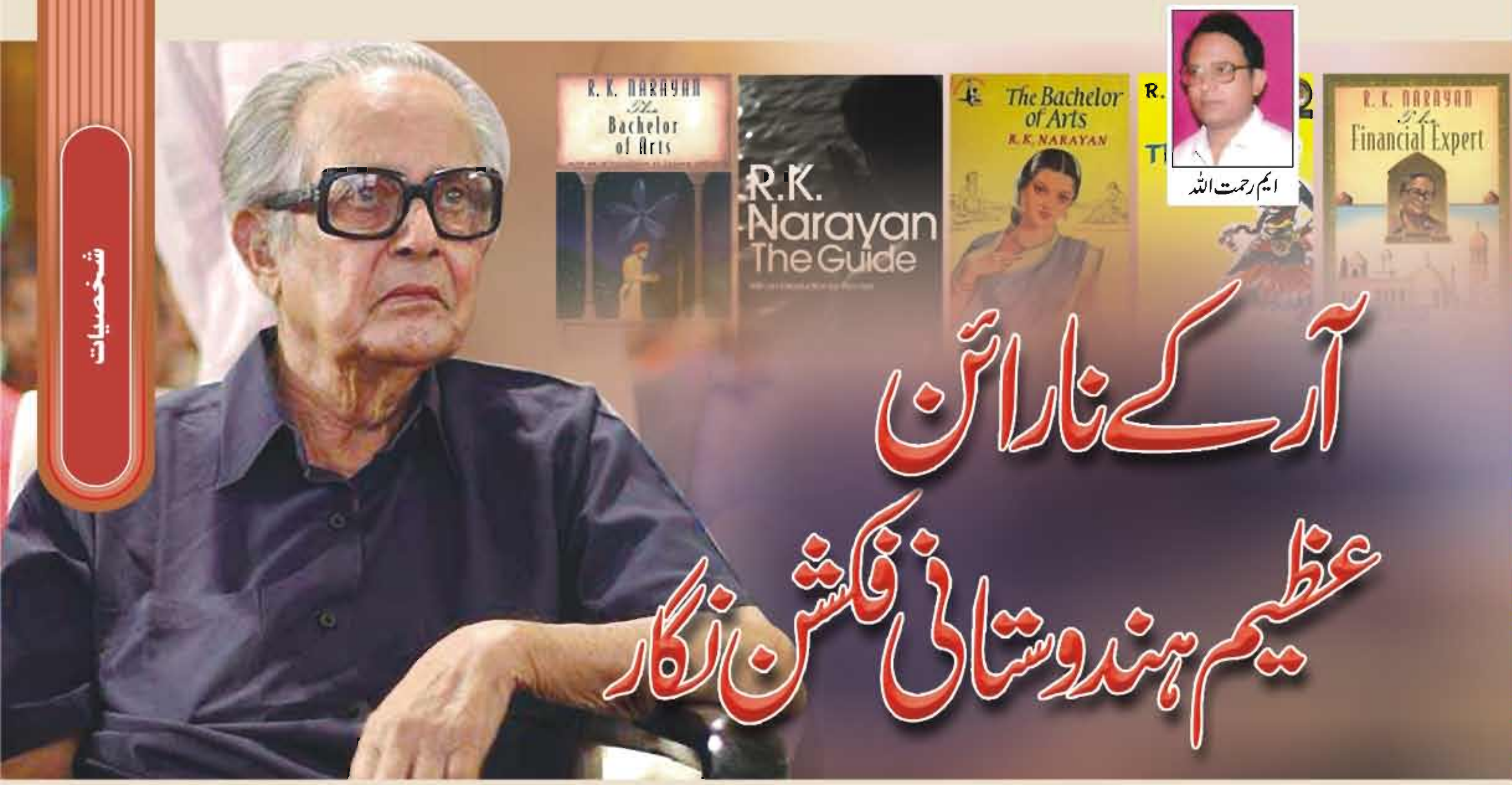

ایم رحمت اللہ

# آر کے نارائن
## عظیم ہندوستانی فکشن نگار

ہندوستانی انگریزی ناول اور افسانے کو دنیا کے ادبی منظر نامے پر ایک بلند مقام دلانے والوں میں مشہور و ممتاز اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب اور مالگوڈی کی مشہور کہانیوں کے خالق آر کے نارائن کا نام سر فہرست ہے۔ ہندوستانی انگریزی (Indo-Anglian) ادب سے مراد انگریزی زبان میں ہندوستانی ادیبوں کے طبع زاد تصانیف سے ہے۔ نارائن اور ان کے معاصرین ملک راج آنند اور راجہ راؤ نے انگریزی ادب میں نہ صرف یہ کہ اپنی شناخت بنائی بلکہ نئے لکھنے والوں کو متاثر کیا اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ انھوں نے اپنے جیسا بہتوں کو قابل، لائق و فائق بنایا اور متعدد ہندوستانی ادیبوں کو ادبی دنیا میں متعارف بھی کرایا۔ انگریزی میں لکھنے والے پرانے اور نئے ہندوستانی ادیبوں کی ایک لمبی قطار ہے جو بین الاقوامی سطح پر اپنی پختہ پہچان بنا چکے ہیں۔ ان میں خشونت سنگھ (جو حال ہی میں 20 مارچ 2014 کو دنیا سے رخصت ہو گئے)، سلمان رشدی، وکرم سیٹھ، کملا مارکنڈے، انیتا دیسائی، اروندھتی رائے قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں نے ہندوستانی تخلیقی حسیت کو انگریزی زبان کے ذریعہ عالمی ادب کے منظر نامہ پر پیش کیا اور دنیائے ادب سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ آر کے نارائن سے قبل ہندوستانی ادیبوں اور دانشوروں نے براہ راست انگریزی زبان میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اس زبان کو اپنے انداز میں برتا، اسے اپنی تخلیق اور فکری زبان بنایا۔ اظہار و ابلاغ کے کئی تجربے کیے۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن کو انگریزی زبان کے خوبصورت لباس سے سجایا، سنوارا اور پیش کیا، اور بین الاقوامی سطح پر انگریزی ادب کے قارئین سے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ ان دانشوروں میں ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اسمائے گرامی سر فہرست ہیں۔ ادیبوں میں رابندر ناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو، تارو دت، اروند گھوش جیسی ہستیوں نے بھی انھیں خوب سراہا تھا۔

آر کے نارائن کا پورا نام راشی پورم کرشنا سوامی ایئر نارائنا سوامی Rasipuram Krishnaswamy Ayyar Narayanaswamy تھا۔ وہ جنوبی ہند کی ریاست مدراس (موجودہ تمل ناڈو) میں پوراسوالکم Puraswalkam چینئی کے علاقہ ویلاٹا اسٹریٹ 1-Vellata Street میں 1906 اکتوبر کی دس تاریخ کو مڈل کلاس کے برہمن گھرانے میں ہوئے۔ آر کے نارائن، ان کا ادبی اور قلمی نام ہے۔ ان کی مادری زبان تامل تھی اور کنڈ علاقائی زبان۔ نارائن کی پرورش و پرداخت مدراس میں اپنے نانیہال میں نانی پاروتی زیر نگرانی ہوئی جو امانی Ammani کے نام سے معروف تھیں۔ ماموں ٹی این سیشا چلم TN Seshachalam تھے جن کی دیکھ ریکھ میں ان کی ابتدائی تعلیم مکمل ہوئی۔ قریب آٹھ سال تک وہ مدراس (موجودہ چینئی) میں انگلش میڈیم کے لتھرا مشن اسکول میں طالب علم رہے۔ پھر کچھ دنوں کے لیے مدراس کے سی آر سی ہائی اسکول میں داخلہ لیا جہاں ان کے والد آر ونکٹ رمن کرشنا سوامی ایئر Rasipuram Venkatraman Krishnaswami Iyer ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے۔ اسکول اور کالج کے دنوں میں ذہین اور کامیاب طالب علموں میں ان کا شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کے گریجویشن کے امتحان میں پہلی کوشش میں تاریخ کے پیپر میں فیل کر ہو گئے پھر اگلی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے 24 سال کی عمر میں یونیورسٹی آف میسور سے اپنی پہلی ڈگری حاصل کی۔ لیکن ان کا یہ مصمم ارادہ تھا کہ وہ ایک دن ہندوستان کے نامور ادیب، فکشن نگار اور ناول نویس ضرور بنیں گے۔

آر کے نارائن اپنے والد اور ماں گیانمبل Gnanambal کی آٹھ اولادوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ ان کے بھائی آر کے لکشمن، بھائی بہن میں سب سے چھوٹے تھے اور بعد میں اپنے عہد کے ایک مشہور و معروف کارٹونسٹ بن کر سامنے آئے۔ مشہور کارٹون کردار 'عام آدمی' Common Man کے خالق آر کے لکشمن ان دنوں کافی علیل ہیں۔ ان کے والد مہاراجہ کولجیٹ ہائی اسکول، چینئی میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ ایک اصول پسند انسان کی حیثیت سے مشہور تھے۔

آر کے نارائن نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کہانیاں لکھنے سے کی۔ وہ 'دی ہندو' The Hindu مدراس کے ہفت روزہ اڈیشن میں کہانی لکھنے لگے اور جلد ہی انھیں باقاعدہ طور پر اخبار کے دفتر میں ملازمت مل گئی۔ زمانۂ صحافت ہی میں انھیں اپنے فطری وسیلۂ اظہار یا ادبی صلاحیتوں کا علم ہو گیا تھا اور انھوں نے 'سوامی اینڈ فرینڈز' Swamy and Friends کے نام سے پہلا ناول لکھا جو 1935 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد 'بیچلرس آف آرٹس' Bachelor of Arts 1937 میں اور 'دی ڈارک

روم' The Dark Room 1938 میں جلدی جلدی شائع ہوئے اور ہر خاص و عام نے اسے پسند کیا۔ پہلے ناول کی اشاعت میں گراہم گرین Graham Greene نے ان کی بڑی مدد کی اور برطانیہ کے بہت ہی ممتاز اور معتبر اشاعتی ادارے ہائنامین Heinamann کی طرف سے یہ ناول شائع ہوا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان دنوں کسی اعلیٰ درجے کے انگریزی اشاعتی ادارے کی طرف سے ایک ہندوستانی ادیب کی تصنیف شائع ہونا بہت ہی مشکل امر تھا اور یہ ایک طرح سے ہندوستانی ادیب کے لیے بڑے اعزاز کی بات بھی تھی۔ اتفاق سے اس ناول کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور معیاری و مشہور رسالوں اور تبصرہ نگاروں نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ ادبی حلقوں میں بھی اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس کے بعد ان کا دوسرا ناول 'بیچلر آف آرٹس' 1937 میں سامنے آیا جس پر ہندوستان کے ادبی حلقوں میں تو کچھ خیال آرائیاں ہوئیں بھی لیکن مغربی ادیبوں نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا۔ یہ زمانہ یوروپ میں سخت سماجی اضطراب اور ذہنی کشمکش کا تھا۔ فسطائیت کے فروغ کے ساتھ ہی جلد ہی پورا یوروپ براعظم ایک دوسری جنگ عظیم کی بھٹی میں سلگنے لگا تھا۔ نرائن اس طرح 1937 سے 1945 تک ایک طرح کی گمنامی کا شکار رہے۔ لیکن جنگ کے فوراً بعد ہی ان کا تیسرا قابل ذکر ناول 'دی انگلش ٹیچر' The English Teacher، 1945 میں منظر عام پر آیا۔

ہندوستان میں مدتوں تک آر کے نارائن کی اہمیت محسوس ہی نہیں کی گئی۔ آزادیٔ وطن کے بعد ہندی ادیبوں میں ایک طرح کی لسانی سامراجیت سرایت کر گئی۔ اس وقت کے ہندی حلقوں کی شدت پسندی نے دوسری زبانوں کے قلم کاروں کو ردّعمل پر مجبور کر دیا اور سبھی اپنے لسانی وراثت کی حفاظت کی دھن میں لگ گئے۔ ان حالات میں انگریزی زبان میں لکھنے والے آر کے نارائن جیسے بلند پایہ ادیب کی طرف کون توجہ کرتا۔ نارائن کے شروع کے ناول تو بالکل ہی نظر انداز کر دیے گئے۔ پہلے ناول 'سوامی اینڈ فرینڈس' کی اشاعت سے لے کر 'دی انگلش ٹیچر' تک پورے دس برسوں میں کسی بھی قابل ذکر ادیب و نقاد نے نارائن کی طرف توجہ نہیں کی۔ انھوں نے اپنی بیوی رجم Rajam کے انتقال (6 جون 1939) کے بعد جب 'دی انگلش ٹیچر' لکھا تو اس ناول میں ان کا اضطراب اور درد لفظوں کے پیکر میں اس طرح ڈھل گیا کہ گونگے الفاظ کی آواز دور دور تک سنائی دینے لگی۔ امریکی ادبی حلقوں میں اس ناول کی بہت پذیرائی ہوئی۔ گراہم گرین نے بھی جا بجا اس پر متاثر انداز میں تبصرے کیے۔ اس کا اثر تھوڑی مدت کے بعد ہندوستان کے پڑھے لکھے حلقوں پر بھی پڑا۔ چار سال بعد جب ان کا ایک بہت ہی اہم اور قابل ذکر ناول 'مسٹر سمپتھ اے۔ پنٹر آف مالگوڈی' منظر عام پر آیا تو ہندوستان کی عام زبانوں کے ادیبوں نے اس کا خوب استقبال کیا۔ اس ناول کی قابل لحاظ خوبی اس کی نفسیاتی گہرائی، جذبہ اظہار کی بے باکی، بیان کی ندرت اور ان کے دل کے درد کی آواز تھی، جو ہر حساس دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

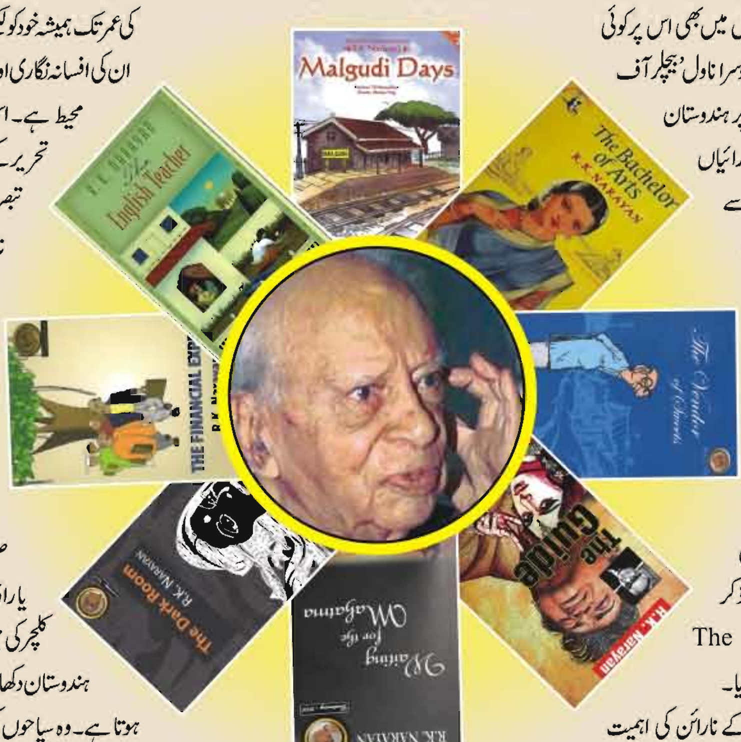


اس ناول کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس میں پہلی بار آر کے نارائن نے اپنی خیالی اور افسانوی بستی مالگوڈی Malgudi کا ذکر بہت ہی مؤثر انداز میں کیا ہے۔ مالگوڈی بستی اصل میں میسور اور بنگلور کا سنگم ہے۔ نارائن نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ ان ہی دو ریاستوں میں بسر کیا ہے۔ یہاں کی مٹی کے خمیر سے ان کے کرداروں کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے۔ اس دیار کی خوشبو ذہن میں ایسی بسی کہ شعوری طور پر اس کا اظہار ان کے ناول اور افسانوں میں ہوا ہے۔ یہ سب کردار بہت چلتی رقم قسم کے دھوکا دھڑی میں ماہر شیطانیت آمیز ذہانتوں کے حامل اور طرح طرح کی اچھائیوں برائیوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ نارائن کا کوئی بھی کردار نہ تو کوئی فرشتہ ہوتا ہے اور نہ ہی مکمل شیطان۔

مالگوڈی کے متعلق آر کے نارائن کا آخری ناول دی ورلڈ آف ناگراج The World of Nagraj ہے جو 1990 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کی تین کہانیاں اور ایک مجموعے کی شکل میں دی گرینڈ مدرس ٹیل The Grand mother's Tale کے نام سے 1993 میں چھپا۔ اس کے بعد انھوں نے تبصرے، شذرے اور مراسلے اکا دکا تو ضرور لکھے مگر کسی باقاعدہ تصنیف کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ انھوں نے کوئی ناول نامکمل چھوڑا ہو۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ ان کی فکر و تخلیق کے سوتے زندگی کے آخر وقت تک خشک نہیں ہوئے تھے اور انھوں نے 9 برس کی عمر تک ہمیشہ خود کو لکھنے، پڑھنے کے عمل میں مصروف رکھا۔ ان کی افسانہ نگاری اور ناول نویسی کی مدّت کوئی ساٹھ برس پر محیط ہے۔ اس عرصے میں نارائن نے پندرہ ناول تحریر کیے اور بے شمار کہانیاں اور متعدد تنقیدی تبصرے بھی لکھے۔

نارائن کی طرح ملک راج آنند اور راجہ راؤ بھی پہلے انگلستان میں متعارف ہوئے۔ مگر راؤ اور آنند کی تحریروں میں جا بجا انگریزی زبان سے وابستہ اس کی تہذیبی، تاریخی و ادبی تلمیحات اور مغربی مزاج اور فضا کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ آر کے نارائن کے ناولوں میں صرف زبان انگریزی ہے۔ اس پر آنند یا راؤ کی طرح مغربی مزاج یا انگلستان کے کلچر کی چھاپ کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ وہ جو ہندوستان دکھاتے ہیں وہ صرف مالگوڈی کا ہندوستان ہوتا ہے۔ وہ سیاحوں کی دلچسپی والا ہندوستان نہیں۔ مالگوڈی اس طرح خود مکتفی ہے کہ اسے ایک پورا ملک خیال کرنا بھی زیادہ غلط نہ ہوگا۔ آنند اور راؤ کے ناولوں میں مختلف علاقوں کے علاوہ مختلف فرقوں اور مذہبوں کے دکھ سکھ، اسکول، کرکٹ، شادی بیاہ کے جھگڑوں اور رقابتوں وغیرہ کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ دونوں ہندوستان کے تنوع میں وحدت کی طرف اشارہ کرتے نظر آتے ہیں، لیکن نارائن کا مالگوڈی اس وسیع و عریض اور مختلف الجہات ہندوستان میں اپنے میں مگن، سب سے الگ اور سب سے جدا ایک جزیرہ لگتا ہے۔ ملک راج آنند اور راجہ راؤ کی کہانیوں میں جس طرح کے مناظر کی عکاسی کی گئی ہے وہ کچھ حد تک قابل اعتراض بھی ہیں۔ مگر نارائن کے مالگوڈی میں گندے مناظر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ نہ تو اپنے ملک کی سرزمین اور کھلے آسمان سے کسی

طرح کی حقارت ونفرت کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ہی مغرب کی نظر میں شرمندہ ہونے کا کوئی تاثر ہی پیش کرتے ہیں۔ مالگوڈی میں ہندو، مسلم، سکھ عیسائی اور دوسرے قوموں کے لوگ بستے ہیں۔ لیکن نارائن کی اپنی خیالی بستی مالگوڈی کے ناولوں میں صرف ہندو بستے ہیں۔ وہاں والوں کو اور خود نارائن کو یہ علم ہی نہیں ہے کہ اتنے عظیم ملک میں جس کا حصہ مالگوڈی ہے سبھی قومیں ہیں۔ نارائن کے استعارے، تشبیہیں، تلمیحات اور تہذیبی اشارے خالص ہندوستانی، ہندو اور 'مالگوڈی' ہیں، اس دنیا میں مسیحی اور مسلم اثرات کا کوئی شائبہ بھی نہیں ملتا ہے۔ یہاں تک کہ 1947 کے فرقہ وارانہ ہنگاموں کا بھی کوئی حوالہ یا ذکر نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں، وہ یوروپ اور امریکا میں لمبے عرصے تک رہے لیکن ان کے ناولوں کی عام فضا یا کرداروں پر اس کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑا ہے۔

نارائن کسی آئیڈیالوجی یا نظریے کے ادیب نہیں تھے۔ ان کے ہم عصر ملک راج آنند اور راجا راؤ ایک مخصوص سماجی اور سیاسی نظریے میں یقین رکھتے تھے اور اس نظریے کو انھوں نے اپنے فن کے معرفت قارئین کے سامنے رکھا۔ لیکن آر کے نارائن کسی بلند آہنگ فلسفہ کی ترجمانی نہیں کرتے۔ ان کی کہانیوں اور افسانوں میں معمولی انسانوں اور ان کی زندگی کا ذکر پایا گیا ہے۔ وہ عام کرداروں میں روزمرہ کی زندگی کی بلندی تلاش کرتے ہیں۔ ان کے پندرہ ناول اور بے شمار کہانیاں ہندوستان کے کلچر کا بے حد حسین، خوبصورت اور پرکشش نظارہ پیش کرتی ہیں۔ جس سے ہزاروں ہندوستانی اور غیر ملکی قارئین کو ذہنی اور قلبی سکون کا احساس ہوتا ہے۔

آر کے نارائن کسی نظریہ سے متاثر ہوکر یا دوسروں کو اس سے متاثر کرنے کے لیے نہیں لکھتے۔ وہ صرف تخلیق کرتے ہیں اور تخلیق کے اس عمل میں ان کا قلم زندگی کے بے شمار پہلوؤں کا احاطہ کرتا جاتا ہے۔ ان کا تخلیقی عمل وجودی ہے جو ہمیشہ سفر پر گامزن ہے اور ڈیزائن در ڈیزائن بدلتا جاتا ہے ۔اس عمل میں باہر سے کوئی ڈیزائن دخل انداز نہیں ہوتا۔ وہ کسی اخلاقی نظریے کے مبلغ بھی نہیں ہیں۔ وہ کسی رُوحانی خیال کے پرستار بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف اور صرف کہانی کار اور تخلیق کار ہیں۔ ان کے ناولوں اور افسانوں نے اپنے تخلیقی عمل کے ذریعہ کئی موضوعات کو جنم لینے کا موقع فراہم کرایا ہے۔ اسکولی بچوں کی روزمرہ اور نفسیاتی زندگی 'سوامی اینڈ فرینڈس'؛ کالج کے طالب علموں کا عنفوان شباب کا زمانہ اور نوجوانوں کی ناہموار زندگی 'دی بیچلر آف آرٹس'؛ ناہموار انسانی رشتوں کی داستاں 'دی ڈارک روم'؛ ہجر کا روحانی صدمہ؛ 'دی انگلش ٹیچر'؛ عام زندگی کی مجبوریاں اور مایوسیاں 'مسٹر سمپت: دی پنٹر آف مالگوڈی' دولت اور دنیاوی عیش وعشرت کی صعوبتیں 'دی فنا نشیل اکسپرٹ'؛ سیاسی پس منظر میں انسانی زندگی کی ستم ظریفیوں کی کہانی 'دی ویٹنگ فار مہاتما'؛ زندگی کی بے بسی کی کہانی اور ضابطے کا فقدان 'دی گائیڈ'۔ یہ سب کہانیاں ہیں موضوع نہیں۔ یہ سب کچھ کہانی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ موضوع کہانیاں نہیں لکھتے بلکہ یہ کہانیوں کے دوران خود بخود جنم لینے لگتے ہیں۔ ان کے بیش تر ناولوں کا ترجمہ عبرانی سمیت تقریباً سبھی یوروپی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ نارائن کے لیے قابل فخر بات ہے۔

نارائن کا سب سے بلیغ اور مشہور زمانہ ناول دی گائیڈ (The Guide) ہے جو 1956 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں ایک جعل ساز، جو گاندھی واد سے متاثر ہوکر بالکل دھرماتما

---

**آر کے نارائن نے تحریر و تصنیف کو ہی اپنا کیریر بنائے رکھا۔ وہ شائد پہلے ہندوستانی ادیب تھے جس نے تخلیقی ادب کو اپنا پیشہ بنایا اور پوری طرح اسی کی آمدنی پر گزر بسر کیا۔ سادہ و سلیس انداز بیاں اور طنز و مزاح کی چاشنی، بیان کی ندرت ، دلچسپ اظہار سے آراستہ اسلوب کے پروردہ ان کے کرداروں نے ہمارے ادب کے منظر نامے پر ایسے لافانی نقوش چھوڑے ہیں جن کی اپیل آفاقی ہے۔**

---

اور سادھو بن جاتا ہے۔ اصلاح نفس وذات کا یہ طریقہ نارائن کے علاوہ دوسرے ہندوستانی 'اصلاح پسند' ادیبوں کی تخلیقات میں بھی بطور 'راہ نجات' استعمال ہوا ہے جسے ہندی فکریات کے تناظر میں مکتی یا شاید موکش کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہی مکتی افراد کو سکون قلب ونظر کی دولت سے مالا مال کرتی ہے اور اپنے معنوں میں ایک بہتر رجحان ادب کی غماز بن جاتی ہے۔ نارائن کو اسی ناول پر 1958 میں ہندوستان کی ساہتیہ اکادمی نے ادب کے قومی انعام سے نوازا تھا۔ اس مشہور زمانہ ناول کو پردۂ سیمیں پر بے حد کامیاب فلم 'گائیڈ' کی صورت میں 1964 پیش کیا جا چکا ہے جس کے ہیرو دیوانند تھے۔ 'مسٹر سمپت' کے نام سے بھی ایک فلم بنی جس کا مرکزی کردار بے مثل اداکار موتی لال نے ادا کیا تھا۔

آر کے نارائن کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں ان کی مناسب قدر دانی نہیں ہوئی جس کے وہ واقعی حقدار تھے۔ موصوف برصغیر کے سب سے بڑے ادیب اور کامیاب فنکار تھے جنہیں یوروپ اور امریکا نے مناسب اور قرار واقعی اعزاز ومراتب عطا کیے۔ نارائن جس طرح انگلستان اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں اس طرح انھیں ہندوستان اور پاکستان میں جاننے والے کم ہیں۔ 1970 کی دہائی میں جب پورے برطانیہ پر راج کی سہانی یادوں کا طلسم طاری تھا تو 'دی بیچلر آف آرٹس' کا ایک نیا ایڈیشن شائع ہوا۔ اسی کے ساتھ نارائن کے کئی اور کمیاب ناولوں کو اکٹھا کر کے دوبارہ، سہ بارہ شائع کیا گیا۔ گراہم گرین نے ان کے 'کلیات' کی اشاعت پر ایک تفصیلی مضمون لکھا جس میں انہوں نے نارائن کو ٹالسٹائے، ہنری جیمس، ترگنیف، چیخوف اور کانراڈ سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ "مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل نہیں ہے کہ نارائن اپنے فن کے اعتبار سے ان عظیم ناول نگاروں کے ساتھ بلکہ ان کے ہم پلہ ہیں۔"

ہندوستان میں انھیں ان کی زندگی میں ہی 1964 میں 'پدم بھوشن' کا اعزاز دیا گیا۔ 1987 میں انھیں 'سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ' ملا۔ 1986 میں آنجہانی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے آر کے نارائن کو راجیہ سبھا کی چھ سالہ مدّت کار کے لیے نامزد کرایا۔ 1992 میں چھ برس کی مدت کار پوری ہونے کے بعد انھوں نے اپنی طویل عمر کی بنا پر دوسری بار رکنیت لینے سے منع کر دیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر 86 برس ہو چکی تھی۔ آر کے نارائن کو دلّی یونیورسیٹی، میسور یونیورسیٹی اور ہندوستان کی دیگر یونیورسیٹیوں نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسیٹیوں میں ان کی کئی ناول انگریزی میں ایم۔اے کرنے والے طالب علموں کے نصاب میں شامل ہیں۔ سال 2000 میں انھیں 'پدم وبھوشن' سے نوازا گیا جو ہندوستان کا دوسرا بڑا اسیویلین ایوارڈ ہے۔

آر کے نارائن نے تحریر وتصنیف کو ہی اپنا کیریر بنائے رکھا۔ وہ شائد پہلے ہندوستانی ادیب تھے جس نے تخلیقی ادب کو اپنا پیشہ بنایا اور پوری طرح اسی کی آمدنی پر گزر بسر کیا۔ سادہ وسلیس انداز بیاں اور طنز و مزاح کی چاشنی، بیان کی ندرت ، دلچسپ اظہار سے آراستہ اسلوب کے پروردہ ان کے کرداروں نے ہمارے ادب کے منظر نامے پر ایسے لافانی نقوش چھوڑے ہیں جن کی اپیل آفاقی ہے۔ نارائن کو تین بار نوبل انعام کے لیے نامزد کیا گیا لیکن اپنے عظیم رفیق گراہم گرین کی طرح ہی وہ اس ایوارڈ کو حاصل نہ کر سکے۔

ہندوستانی انگریزی ادب کے بے لوث خادم آر کے نارائن نے جب 13 مئی 2001 کو 94 برس کی عمر میں انتقال کیا تو وہ ہندوستانی انگریزی ناول اور افسانوی صنفِ ادب کے لیجینڈ بن چکے تھے۔

■

**Dr. M Rahmatullah**, A1 / 115, New Kondli, Mayur Vihar, Phase-3, Delhi - 110096.

روز۔ایم۔اصبر

# المعتمد ابن عباد
## سیول کا شاعر بادشاہ

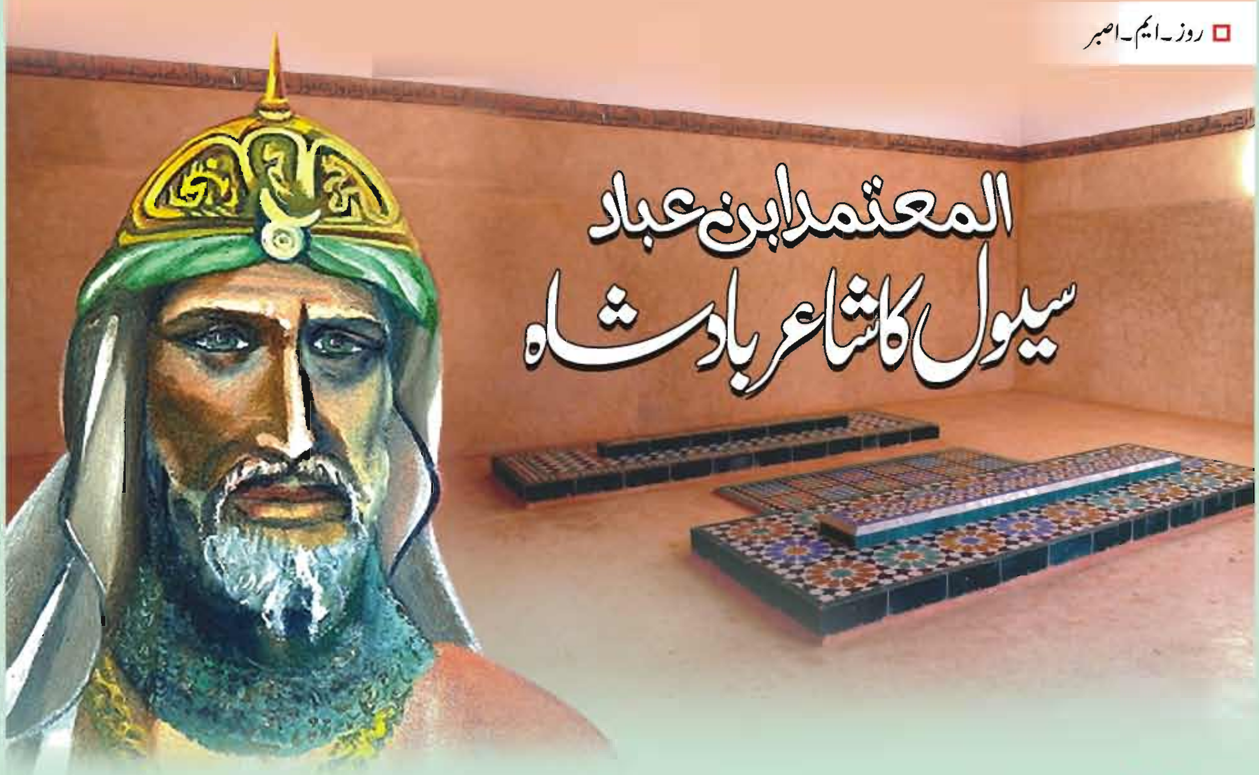

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اردو شاعری اور خاص طور پر صنف غزل صدیوں کے بعد مکمل ہوئی فارسی غزل کی ہیئت سے ماخوذ ہے۔ فارسی قصیدے کے مختلف اجزا تشبیہ، استعارے، ایہام اور خاص طور سے تشبیب سے اردو غزل میں مستعار ہیں۔

فارسی میں یہ صنف عربی شاعری سے درآمد ہوئی۔ ظہور اسلام کے بعد عربوں نے غزل کو تقریبا ترک کردیا لیکن فارسی میں اس کو توسیع اور فروغ ملا۔ اردو غزل میں استعارات ایہام و ابہام گوئی اور دیگر شعری آہنگ و عروض کا سراغ ہمیں غزل کے قبل اسلام کے شعرا میں ملتا ہے۔

یہاں ہم عربی کے پہلے صاحب دیوان شاعر المعتمد ابن عبّاد اسپین یعنی ہسپانیہ کے علاقہ سیول (Seville) کا بادشاہ بھی تھا جو عربی میں اندلس کہلاتا ہے، مختصر سوانح اور چند غزلوں کا ترجمہ پیش کررہے ہیں۔ (انگریزی سے ترجمہ کمال عبدالناصر)

---

محمد ابن عبّاد المعتمد ((1040-1095 کا دور حکومت 1069 سے 1091 تک رہا۔ وہ سیول کا تیسرا اور آخری حکمراں تھا۔ 1069 میں اپنے والد عباد دوئم المعتمد کے انتقال کے بعد اس کو سیول وراثت میں ملی۔ 1071 میں اس نے پڑوسی شہر قرطبہ پر فتح حاصل کی 1075 میں قرطبہ سے شکست کا سامنا ہوا تھا لیکن اس نے 1078 میں دوبارہ فتح حاصل کی۔ 1086 میں المعتمد نے المواریدی حکمراں یوسف ابن تاشفین کی حمایت میں بادشاہ الفونسو ششم کاسٹیل سے ساگرا جس کی جنگ میں حصہ لیا۔ 1091 میں المواریدنے ہی اس کو بے دخل کرکے جلاوطن کردیا۔

المعتمد کو شاعر کے طور پر اندلسی شعرا میں عظیم ترین درجہ حاصل ہے۔ سسلی کا عربی شاعر ابن حمدیس اس کا اچھا دوست بھی تھا۔ جب المعتمد 13 سال کا تھا اس کے والد نے انھیں سیول کا امیر مقرر کیا اور اندلسی عربی شاعر کو اس کا وزیر۔ نوعمر المعتمد کو ابن عمّار سے محبت ہوگئی۔ ایک رات شراب کے نشے میں مدہوش المعتمد نے ابن عمّار کو ہم بستری کی دعوت دی۔ جب المعتمد کے والد کو ان کی دوستی کا پتہ چلا تو اس نے ناراض ہوکر ابن عمار کو جلاوطنی کا حکم دیے دیا۔ جب المعتمد کی تاجپوشی ہوگئی تو اس نے ابن عمار کو بلوایا اور اس کو سیاسی اور فوجی اختیارات کی ذمے داری دی۔ ایک رات جب وہ دونوں خوابگاہ میں سورہے تھے تو المعتمد نے خواب میں دیکھا کہ ابن عمّار اس کا قتل کررہا ہے۔ وہ خوفزدہ ہوکر بھاگنے لگا حالانکہ ابن عمّار نے اپنے دوست کو کافی تسلی تشفی دی کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا لیکن المعتمد کو اچانک غصہ آیا اور اس نے ابن عمّار کا سر قلم کردیا۔ ابن عمار کی موت کے بعد المعتمد کو بہت افسوس ہوا، بہت گریہ وزاری کی اور اس کی شاہی طریقے سے تدفین کرائی۔

المعتمد اور ابن عمّار دونوں ہی جوکھم بھرے مہم جو تھے دونوں اکثر بھیس بدل کر الوادی الکبیر کے ساحلوں پر تفریح کرتے، ایسی ہی ایک شام کو المعتمد اپنی مستقبل میں ہونے والی منکوحہ سے ملا۔ ساحل پر جس جگہ کچھ عورتیں کپڑے دھورہی تھیں، راوی کے مطابق، المعتمد نے ایک مصرعہ باآواز بلند پڑھا اور ابن عمّار سے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ کہنے کی فرمائش کی:

سناژ ربو من / المازرد

(ہوانے پانی کو سینہ بکتر بنادیا ہے)

ابنِ عمّار بھی اپنے دوست کے اس محبوب مشغلے میں حاضر جواب تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوسرا مصرعہ باندھتا، ایک عورت کی آواز آئی:

ابو دیرین لی قتدلن حمله

(جنگ کے لیے کیسا ہے وہ ہتھیار جو سرد پڑ جائے)

اس حسین دوشیزہ کی ذہانت اور حاضر جوابی پر فریفتہ المعتمد نے اس شاعرہ کو محل میں بلوایا۔ اس کا نام اعتماد تھا اور سب اس کو رمیکیہ کے نام سے پکارتے تھے چونکہ وہ رمیک نامی کسی شخص کی باندی تھی اور اس کے لیے گدھے ہنکاتی تھی۔ المعتمد نے اعتماد کو خرید کر آزاد کرکے اس سے شادی کرلی۔ ایسا کہا جاتا

ہے کہ اپنی محبوبہ اور بیگم کے نام پر اس نے بھی اپنا نام المعتمد الا اللہ رکھ لیا۔ یہاں اس دور کی شاعری کے نمونے پیش ہیں۔

**طبیب**

طلوع سحر کی نیم خوابیدہ مائل بہ زرد انگلیوں نے
پیراہن شب کو تار تار کردیا ہے اور میری محبوبہ
تم نے اپنی طلوع سحر میں بھیگی شبنم آلود انگلیوں سے
میرے بے چین دل کے مضمحل خس وخاشاک کو
پارہ پارہ کردیا ہے
تیرے لبوں کی شبنم اور تیرے رخسار کے گلابوں کو حل کر کے
میں نے ایک تریاق بنایا ہے اپنے مالیخولیا کی شفا کے لیے

**جنگ کے میدان سے سلمیٰ کے لیے**

سلمیٰ، سلمیٰ، کیا میں نے تم کو بھلادیا
عجلت سے روانگی کی اس شب کی روشنی میں
مجھے یاد ہے
اس لمحۂ جدائی میں
(تیشہ تلوار پر: تلوار عصا پر)
ہم ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے
دو پرسوز دل!
نیزوں کے جنگل کے درمیاں، مجھ کو منتشر کرتا
تمھارا تصور، تمھارا پیکر ابھر رہا ہے
جب جنگ کے تازیانے خوفزدہ کرتے ہیں
سلمیٰ تمھاری بانہیں میری بانہوں میں ہوتی ہیں
سلمیٰ، سلمیٰ
میں تمھیں یاد کرتا رہتا ہوں

**موشحہ** Acrostic

(کوئی کلام یا شعر جس میں پہلا یا پہلا اور آخری یا مصرعوں کے بعض اور حروف ترتیب وار جوڑنے سے کوئی نام، مقولہ یا کوئی اور لفظ یا جملہ بن جاتا ہے۔ (توشیحی نظم)

تو ہمیشہ میرے دل میں موجود ہے اور جدا بھی
معتمد دعا کرتا ہے کہ
اس کی آنسوؤں سے بھیگی رات لامتناہی سہی
تیرے ہاتھ
بندش سے آزاد
کسی خوشگوار دن
میری رہنمائی کریں گے
میری خواہش ہے
صرف ایک تمنا، جب تک میں تجھ کو
اپنے ساتھ کھڑا ہوا نہ دیکھ لوں
ابن عباد کو بھولنا نہیں
میں تمھارے، بہت ہی عزیز نام کا ورد
دل ہی دل میں کرتا رہتا ہوں

المعتمد کی دوسرے دور کی شاعری بادشاہت، جنگ، ملک کی توسیع اور ترقی کے موضوعات سے عبارت ہے۔ اپنی بیگم سے محبت اور محل میں دونوں کی زندگی کے بارے میں المعتمد نے اپنے جذبات کا اظہار ایک توشیحی نغمے میں کیا ہے:

میری آنکھوں سے اوجھل تو ہمیشہ میرے دل میں موجود ہے
تیری دائمی خوشی کی تمنا ہمیشہ میرے دل میں موجود ہے
ایسے دائم جیسے میری آہ، میرے آنسو اور بے خواب راتیں
مجھ کو بس تیری چاہت، میں تیرا ہی مطیع
اور دوشیزائیں بھی مجھ کو لگام دینا چاہتی ہیں
پر میری آرزو ہے کہ ہر لحجہ تیرے پاس رہوں
بہت جلد ہو جائے گی یہ دعا قبول، آرزو دل میں موجود ہے

میری محبوبہ میرے بارے میں سوچ
شب ہجر میں نہ فراموش کر
محبوب ترین ہے مجھ کو ترا نام، بہت فرحت بخش
میں نے اس لفظ کا نقش تحریر کردیا ہے

**اعتماد**

اعتماد کے ناز و ادا اور نخروں کے قصے مشہور تھے لیکن المعتمد اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا اور اس نے زندگی بھر اس کی دلجوئی کی اور سچا عشق کیا۔ فروری میں جاڑے کے دنوں کی بات ہے جب قرطبہ میں برف کے گالے پڑ رہے تھے۔ اپنے محل کی کھڑکی سے اس نظارے کو دیکھ کر اعتماد اشکبار ہو اٹھی۔ سسکیاں بھرتے ہوئے اس نے اپنے شوہر سے فرمائش کی کہ ایسا پر لطف نظارہ ہر موسم میں کیوں ممکن نہیں۔ اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے المعتمد نے قرطبہ میں بادام کے پیڑ لگانے کا حکم دیا جس کے برف کے گالوں کے مانند نازک سفید پھول موسم بہار میں بھی برفباری جیسا منظر پیش کرتے اور اعتماد لطف اندوز ہوتی۔

حالانکہ ملک کے کاموں میں المعتمد کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن اپنی تاجپوشی کے دوسرے ہی سال اس نے قرطبہ فتح کیا، یہ وہ کام تھا جس کا قصد اس کے نانا نے کیا تھا۔ اپنی تسخیر پر المعتمد نے یہ نظم لکھی:

اپنی پہلی ہی کوشش میں فاتح رہا ہوں میں
خوشنما قرطبہ کا ہاتھ پانے میں
وہ بہادر جنگجو دیونی، جس نے تلوار سے
اپنے شادی خواہوں کو نامنظور کردیا
اب اس کے محل میں ہماری سہاگ رات ہے
جبکہ اور بادشاہ، میرے رقیب
غصے کے آنسو روتے ہیں، خوف سے کانپتے ہیں
تمھارا کانپنا بجا ہے، قابل نفرت دشمنوں چونکہ
بہت جلد شیر یک لخت اٹھ کر تم پر زقند لگائے گا

قرطبہ کی فتح کے بعد المعتمد اور اس کے اہل خانہ کے چار پانچ سال نہایت آرام اور چین سے گزرے۔ اسی دوران الفونسو ششم لیون کے بادشاہ نے پورے خطے کو فتح کرنے کی ٹھان لی۔ ڈچ تاریخ داں رین ہارٹ ڈوزی نے لکھا ہے: 'اس نے مسلمان بادشاہوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایسے رنگوروں کی طرح کچل دیں کہ اس میں سے سونا نکلنے لگا۔''

25 مئی 1085 کو الفونسو نے ٹولیڈو کو فتح کرلیا جو کہ اسلامی دانش گاہ تھی، گھبراہٹ میں اندلسی باشندوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے پاس دو ہی راستے ہیں: عیسائی بادشاہ کے محکوم ہوجائیں یا ہجرت کریں۔ ابو محمد الاسال نے اپنی شاعری سے آگاہ کیا:

اندلس کے لوگو اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگاؤ
ایسے وقت میں
تاخیر کرنا بہت بڑی بے وقوفی ہے

عیسائی اقتدار سے ان کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ اندلسی بادشاہوں نے المواریدیس سے فوج طلب کی

جب المعتمد کے فرزند رشید نے المواریدیس کو اسپین میں نہ بلانے کا مشورہ دیا تو المعتمد نے کہا: ''میں نہیں چاہتا کہ میرے وارثین مجھے ایسے آدمی کی طرح یاد کریں جس نے اسلامی اندلس کافروں کے حوالے کردیا۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ ہر اسلامی منبر سے مجھ پر لعنت و ملامت ہو۔ میں کاسٹیل میں خنزیر کے جھنڈ میں رہنے کے بجائے افریقہ میں سار بان بننا پسند کروں گا۔''

المواریدیس کے بادشاہ یوسف ابن تاشفین نے

الفونسو کو شکست دی لیکن کچھ عرصے بعد جب خانہ جنگی اور عوام کی بیزاری کی خبریں ابن تاشفین کے گوش گزار ہوئیں تو اس نے پہلے گراناڈہ اور مالگا پر قبضہ کیا۔ المعتمد کو جب تاشفین کے ارادے کا پتہ چلا تو اس نے الفونسو ششم سے مدد مانگی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جب سیول پر حملہ ہوا تو المعتمد نے بہادری سے مقابلہ کیا لیکن ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہ صرف اپنے افراد خانہ کو بچا سکا۔ اس نے غم سے نڈھال ہو کر لکھا:

جب میرے آنسو تھم جاتے ہیں
اور چپکے سے دل میں سکون چلّا تا ہے
مجھ کو صدائیں آتی ہیں
''پیچھے ہٹ جاؤ، اس میں ہی عقلمندی ہے''
لیکن میں جواب دیتا ہوں:
زہر کا گھونٹ میرے لیے زیادہ شیریں ہے
بہ نسبت اس رسوائی کے جام سے
حالانکہ بربری میری حکومت پر قابض ہیں
اور میرے فوجی میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں
میری ہمت اور عزم مستحکم ہے
جب میں نے دشمن پر وار کیا
میں نے سینہ بکتر کو بھی حقیر سمجھا
اور نہتّے مقابلہ کیا
موت کی امید میں، میں نے ہلّہ بول دیا
لیکن افسوس
میرا وقت ابھی آیا نہیں ہے''

بہت سے اندلسی بادشاہ تخت و تاج گنوا کر قتل کر دیے گئے۔ المعتمد کو تاشفین نے حکم ہجرت صادر فرمایا۔ ایک ہجوم بیکراں شاہی خاندان کو الوداع کہنے کے لیے ساحل پر جمع ہوا۔ کالے بادبانوں والے جہاز جلاوطنوں کو اندلس پار افریقہ میں اسٹریٹ آف جبرالٹر لے گئے۔ جب المعتمد کا جہاز ٹینجیرز پہنچا تو وہاں کے شعرا آئے، المعتمد نے خون سے لتھڑے آخری سکّے ان کو دے دیے۔

اس طرح المعتمد کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوا۔ طاقت اور خوشی کی انتہا سے غربت اور ذلت کی انتہا۔ المعتمد نے اپنے غم کو شاعری میں سمو دیا جو عربی شاعری میں لاثانی ہے۔

میکس جاتے ہوئے اس نے ایک جلوس دیکھا جو بارش کی دعا کے لیے مسجد جا رہا تھا تو اس نے کہا:

جب بارش کی دعا کرنے والے لوگ مجھے ملے
میں نے پوچھا
'بارش کی جگہ میرے آنسو لے لو'
'تم صحیح کہتے ہو' انھوں نے کہا
'تمہارے آنسو ہی کافی ہوں گے

لیکن
وہ خون میں رُلے ہوئے ہیں'

شاعر بادشاہ کو مراقش کے قریب ریگستان کے گاؤں اغمنت میں جلاوطن کر دیا گیا وہاں المعتمد نے اپنی بیگم اور بیٹی کے ساتھ کم اجرت پر روٹی پکاتے پکاتے قابل رحم زندگی گزاری۔ اب شاعری ہی اس کے لیے واحد فرحت کا ذریعہ تھی۔ اغمنت میں لکھی گئی نظموں میں اس کے شاندار عظمت رفتہ کی بازگشت ہے۔

المعتمد نے اقرار کیا کہ اس نے تاشفین کو بلا کر غلطی کی اور اعتراف کیا ''ایسا کر کے میں نے اپنی قبر آپ کھود لی۔''

جلاوطنی میں اپنی پہلی عید کے دن المعتمد نے انتہائی بے بسی کے عالم میں مندرجہ ذیل نظم تحریر کی:

گزرے زمانے میں تو جشن سے لطف اندوز ہوا
لیکن یہ جشن غمگین ہے جس میں تو شہر اغمنت میں ہے
تو اپنی بیٹیوں کو چیتھڑے پہنے بھوک سے مرتے دیکھتا ہے
مفلوک، بے بس، ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج

**"شاعر بادشاہ کو مراقش کے قریب ریگستان کے گائوں اغمنت میں جلاوطن کردیا گیا وہاں المعتمد نے اپنی بیگم اور بیٹی کے ساتھ کم اجرت پر روٹی پکاتے پکاتے قابل رحم زندگی گزاری۔ اب شاعری ہی اس کے لیے واحد فرحت کا ذریعہ تھی۔ اغمنت میں لکھی گئی نظموں میں اس کے شاندار عظمت رفتہ کی بازگشت ہے۔"**

تھکن سے چور نیچی نظریں کیے تجھ سے ملنے آئے ہیں
کبھی کافور اور مشک پر چلے تھے
وہ سڑکوں کی کیچڑ میں ننگے پاؤں گھومتے ہیں
اشک آلود، جن کے مجوف عارض
ان کی غربت کے غماز ہیں
بالکل اس مغموم عید کی طرح
خدا کرے ایسی عید پھر نہ دیکھو
تم نے روزہ کھول لیا ہے
تمھارا دیرینہ ضبط پاش پاش ہو گیا ہے
کل تک تم نے جو بھی بات کہی
سب نے مانی
اب تم دوسروں کے اشاروں پر ناچتے ہو
جو بادشاہ اپنی عظمت کے گن گاتے ہیں
ایک سادہ لوح، لاتعبیر خواب کے فریب خوردہ ہیں۔
سب کچھ فانی ہے
موت بھی فانی ہے
قسمت گرگٹ کی مانند
اس کا تغیّر ہی اس کی حقیقت ہے
اس کے ہاتھوں میں ہم
شطرنج کی بساط ہیں گویا جس میں
بادشاہ بھی پیادے کی طرح مارا جا سکتا ہے
تو اس دنیا کو ترک کرو اور سکون تلاش کرو
چونکہ
لوگ مر جاتے ہیں، زمین بنجر صحرا بن جاتی ہے
ہیچ دنیا سے کہہ دو:
''دنیا کی حقیقت کا راز
اغمنت میں پوشیدہ
سویا ہوا ہے۔''

زنجیروں میں اسیر بیمار المعتمد نے 1095 میں اپنی محبوبہ اعتماد کی موت سے دل گرفتہ اغمنت میں ہی جلاوطنی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وہ آخری اندلسی نژاد بادشاہ تھا اور ایک پرشکوہ تہذیب کا نمائندہ بھی۔ اس کی بہادری، سخاوت اور حوصلے کی صفات نے اس کو آنے والی نسلوں کا محبوب بنا دیا۔

ایک صدی کے بعد تاریخ داں ابن الابارّہ نے کہا:

''المعتمد کے سب عاشق ہیں، سب اس پر رحم کھاتے ہیں اور اس کا ماتم اب بھی کیا جاتا ہے۔''

(سعودی آرامکو (Aramco) کے ویب سائٹ پر شائع مضمون کا ترجمہ)

■

**Rose M. Asbar,** Freelance Writer, Washington, D.C

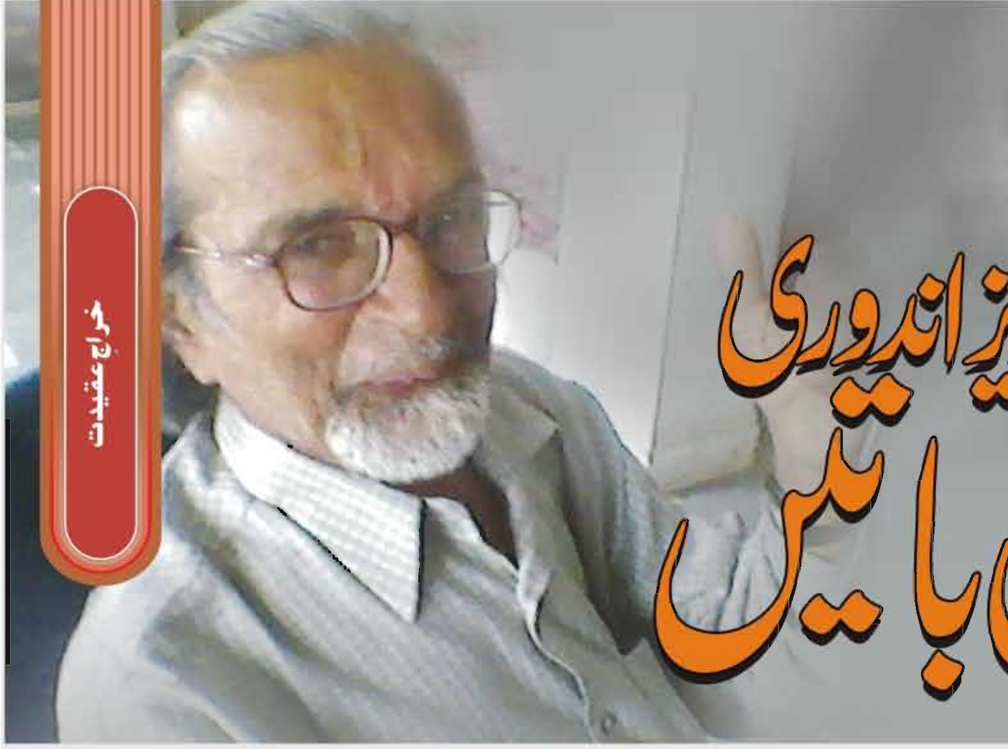

مناظر عاشق ہرگانوی

# عزیزِ اندوری
# یادیں باتیں

عزیز اندوری کی شخصیت، تہذیب اور شائستگی کا نمونہ تھی، وہ شاعر تھے، تنقید نگار تھے اور استاد تھے۔ درس و تدریس سے وابستہ رہنے کی وجہ سے حالات کے نئے تقاضوں کو پیش نگاہ رکھتے تھے۔

اس کارگہ شیشہ گری میں، خاص کر ادبی کساد بازاری میں کون کس کو یاد رکھتا ہے۔ اس کی پہچان اخلاقی ذہنیت سے ہوتی ہے۔ میں اور عزیز اندوری ایک دوسرے کو کتاب اور رسائل سے پہچانتے تھے، تخلیقات سے پہچانتے تھے اور خطوں کے ذریعے سے پہچانتے تھے جس کی عمر طویل تھی۔ میں ان کے مجموعہ ہائے شعر و نثر پڑھ چکا تھا۔ 'کہرا'، 'ترنگ'، 'تنقیدی تحریریں'، 'دھنک'، 'نگیٹو سے پازیٹو تک'، 'لہریں' اور چند تراجم سے ذہن روشن کر چکا تھا۔

ہماری یہ آدھی ملاقات نہ جانے کتنے سال اور مہینے لیتی کہ انھوں نے باضابطہ اور بالمشافہ ملاقات کی صورت نکالی۔ اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ایک تھیسس بھجوا دی۔ سیدہ سعدیہ ان کی نگرانی میں دیوی اہلیہ یونیورسٹی، اندور سے پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹر بننے والی تھیں۔ ممتحن کی حیثیت سے میں نے اپنی رپورٹ جلد سے پیشتر بھیج دی اور عزیز صاحب نے بھی اتنی ہی جلدی پروانہ بھجوا دیا کہ میں وائیوا لینے کے لیے اندور پہنچوں۔

ریلوے اسٹیشن پر عزیز صاحب اپنے چند شاگردوں کے ساتھ ہار لیے موجود تھے۔ ہم گلے ملے۔ اپنائیت کی سرشاری محسوس کی اور اس ہوٹل پہنچے جہاں میرے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ اسی شام پریس والوں کو بھی انھوں نے بلوا لیا کہ اردو کی پیش رفت پر میرا انٹرویو لے سکیں۔

اس شام اور اس رات ہم دیر تک باتیں ہی کرتے رہے اور خیالات کی بلندی پر پہنچتے رہے۔ کتنے ہی موضوعات کو ہم نے گرفت میں لیا اور لطیف تر پہلوؤں کی بھی رنگ آمیزی کرتے رہے۔ لیکن مجھے اندور میں شعر و ادب کی پیش رفت کی جانکاری ان سے لینی تھی۔ کیونکہ میں پڑھتا آیا تھا کہ صبحِ بنارس اور شامِ اودھ کی طرح شبِ مالوہ کی بھی اہمیت ہے۔ مدھیہ پردیش میں سرزمین مالوہ کا قدیم اور تاریخی شہر اندور بھی ہے۔ جہاں کے میوزیم میں دسویں، گیارہویں اور بارہویں صدی کی اشیا سے اس کی قدامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میرے دریافت کرنے پر عزیز صاحب نے مختصراً بتایا کہ مغل بادشاہوں کے دور میں مراٹھا راجاؤں اور سرداروں نے شجاعت دکھائی تھی اور پیشوا دربار کے فوجیوں نے 1680 سے مغل سلطنت پر حملے شروع کر دیے تھے۔ پیشوا بالاجی راؤ اول کے صوبے داروں نے 1730 تک مغل صوبے داروں کو شکست دے کر تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس میں ملہار راؤ ہولکر پیش پیش تھا۔ اسی نے اندور کے وسط میں کاہتا ندی کی اونچی ٹیکری پر راجواڑا بنایا تھا۔ اس نے ہولکر خاندان کو کافی شہرت دلائی۔ اہلیہ بائی 1775 میں اس کی بہو بنی تھیں۔ وہ مذہبی ذہن رکھتی تھیں لیکن تعصب سے پاک تھیں۔ مندروں اور تیرتھ گاہوں کو دان پُن کرتی ہی تھیں۔ مساجد اور درگاہوں سے بھی غافل نہیں تھیں۔ 1780 میں اندور کے مشرقی علاقے میں حضرت ناہر شاہ بابا کی درگاہ کے لیے 15 بگہ زمین دان میں دی تھی اور نماڑ کے گاؤں کا تریہ کے میر حسن فقیر کے لیے بہت کچھ دیا تھا۔ یہ روایت مثال ہے۔ بعد میں ہولکروں اور انگریزوں میں جنگ ہوئی اور ہولکروں کو شکست ہوئی اندور راجدھانی بنی۔ اس کے لیے 'مندسور معاہدہ' ہوا۔ اہلیہ بائی نے اسے تجارت کا مرکز بنایا۔

میں نے عزیز صاحب سے پوچھا تھا کہ یہاں کون کون سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لسانیات کی کتابوں میں مالوی زبان کا ذکر ملتا ہے۔ گریرسن اور سنیتی کمار چٹرجی نے مالوی زبان کے اثرات کا تذکرہ کیا ہے۔

جواب میں عزیز صاحب نے بتایا تھا کہ برٹش حکومت جب اثر انداز ہوئی تو مالوی زبان براہِ راست متاثر ہوئی۔ اس کا چلن کم ہوتا چلا گیا اور اردو اور ہندی عوام کی زبان ہو گئی۔ گجراتی، راجستھانی اور مراٹھی زبانوں کا بھی چلن ہوا۔ راجواڑہ کے پاس 1804 میں پبلک لائبریری قائم کی گئی۔ اندور مدرسہ قائم کیا اور 'لیتھوگرافک پریس' شروع کی گئی۔ جہاں سے 'مالوہ اخبار' اردو اور ہندی میں شائع ہوا تھا۔ شعر و ادب، موسیقی، کھیل اور دیگر فنون لطیفہ میں یہاں کی ہستیوں نے مقام بنایا ہے۔ ان میں ایم ایف حسان، گرو پنچالکر، سی کے نائڈو، کپتان سید مشتاق علی، استاد رحیم الدین ڈاگر وغیرہ اسی سرزمین کے ہیں۔ یہاں گرونانک، گاندھی جی، سوامی دیانند سرسوتی، سوامی وویکانند، چندر شیکھر آزاد وغیرہ آچکے ہیں۔ بعد میں مدن موہن مالویہ، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری، راجندر پرساد، رادھا کرشنن، مرارجی ڈیسائی، جے پرکاش نرائن، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، سونیا گاندھی، اٹل بہاری باجپائی بھی آتے رہے ہیں۔

اردو کی تعلیم اور شعر و ادب سے وابستگی کے بارے میں دریافت کرنے پر عزیز صاحب نے بتایا کہ مدارس سے لے کر یونیورسٹی سطح تک یہاں اردو کی پڑھائی ہوتی ہے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کی ڈگری دی جاتی ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو باندہ کے نواب علی بہادر نے اندور میں ہی قیام کیا۔ یہاں

'علی منزل' کی تاریخی حیثیت ہے۔ شعر و ادب سے ان کے ذوق کا عالم یہ تھا کہ غالب تک ان کے مہمان رہے تھے۔ غالب کا ایک دعائیہ مقطع اس طرح ہے:

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

اندور میں ہی مضطر خیر آبادی منصف کے عہدے پر تھے۔ شاداں اندوری، منظر غریقی اور تاباں اندوری کا اپنا دور تھا۔ بعد میں وقار واثقی، جیون لال گوہر، عمیق حنفی وغیرہ نے یہاں کی شعری فضا کو مالا مال کیا۔

اگلے دن صبح سویرے عزیز صاحب ہوٹل آگئے۔ وائیوا کے سلسلے میں باتیں ہوئیں۔ کنڈیڈیٹ گھبرائی ہوئی تھیں۔ انھیں میں نے دلاسہ دیا۔ شاداں اندوری پر ان کا مقالہ تھا۔ محنت سے اور تفصیل سے لکھا گیا تھا۔ عزیز صاحب نے بتایا کہ شام میں ایک نشست رکھ دی ہے۔ شہر کے بیشتر شاعر و ادیب آئیں گے۔ وائس چانسلر صدارت کریں گے۔

پھر ایسا ہوا ملنے والوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جاوید عرشی، طارق شاہین، صابر گوالیاری، احمد کمال پروازی، عزیز عرفان، حدیث انصاری، ای ٹی وی کے مہتاب عالم (بھوپال سے)، ابراہیم اشک (ممبئی سے) اور بہتوں سے ملاقات بات ہوئی۔ السفیان چیریٹیبل ٹرسٹ کی طرف سے میرے اعزاز میں بڑا پروگرام ہوا۔ میری دو کتابوں 'مشاہیر ادب سے مصاحبہ' (اردو) اور 'بہار کی بھاشائیں' (ہندی) کا اجرا ہوا۔ عزیز عرفان نے تعارفی مقالہ پڑھا۔ عزیز اندوری صاحب ہر جگہ، ہر لمحہ پیش پیش تھے۔ اس عمر میں اتنے فعال، میں حیران تھا۔ ان کی پیدائش 1932 میں ہوئی تھی اور 1995 میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ 30 اکتوبر 2014 کو ان کا انتقال ہوا تو ان کی اٹھارہ مطبوعہ کتابیں نظر کے سامنے آگئیں اور وہ باتیں بھی یاد آئیں جب اگلے دن اندور گھومنے کے دوران اردو شاعری میں تحریکات و رجحانات پر ان کے خیالات سے آگہی ملی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر زبان کا ادیب اور شاعر دو مختلف کیفیتوں سے گزرتا ہے۔ پہلی کیفیت وہ ہوتی ہے جو اسے زمین پر چلنے والے عام انسان کی شکل میں پیش کرتی ہے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے ماحول کا تجزیہ کرتا ہے۔ دوسری کیفیت وہ ہوتی ہے جب وہ عام حالات سے ہٹ کر اپنے دل میں جذبات کی ایک نئی دنیا بسا کر اپنی ذات کے لیے سکون کے ذرائع تلاش کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے بیدار شعور کے سہارے حیات و کائنات کے مسائل کا پارکھ بن کر ان تحریکات سے متعلق نظریات کی تمام پابندیوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

اردو شاعری کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ اردو شاعروں نے اپنے ذہنی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں اردگرد اور اپنے عہد کے حالات کو پرکھنے کی جب بھی کوشش کی انھیں کسی خاص نظریے یا کسی خاص تحرکات کو اختیار کرنا پڑا۔ جس کے باعث ان کی فکر کو ارتقا کی وہ پابندی نصیب ہوسکی جہاں سے انھوں نے حیات و کائنات کو بھی نگاہِ حق شناس سے بھی دیکھنا شروع کردیا۔

ذات کی تنہائی کے بارے میں پوچھنے پر انھوں نے مدلل جواب دیا کہ یہ صحیح ہے کہ انسان کی زندگی میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جب وہ حیات و کائنات کے متحرک ہونے سے گریز کرنے لگتا ہے اور صرف اپنی ذات کے اندر جھانک کر اپنے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے۔ وہ اس عمل کو اختیار کرنے کا مرتکب اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اکثر ہنگامۂ حیات و کائنات سے نجات پانے کے لیے اپنی ذات ہی کو 'گوشۂ تنہائی' سمجھ کر اپنے احساسات و جذبات کے سہارے اپنے دن گزارنے لگتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور اس کی اندرونی کیفیت کے علاوہ کسی دوسرے مسائل میں کسی قسم کی دلچسپی نظر نہیں آتی۔ وہ دماغ سے زیادہ دل اور شعور سے زیادہ جذبے پر اعتماد کرکے اپنے لیے سکون اور اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسے یہی جذبہ کچھ اس قدر عزیز ہو جاتا ہے کہ وہ اس میں فرط انبساط کے پہلوؤں کو تلاش کرکے ان کی جانب ہمیشہ متوجہ رہتا ہے۔ اس کی یہ توجہ عام طور پر 'رجحان' کہلاتی ہے جو اول تو اس کے ذاتی عمل تک محدود رہتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے یہ رجحان عام ہوتا جاتا ہے عام لوگوں کی تقلید کے باعث تحریک کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اردو شاعری میں کئی ایسے رجحانات رہے ہیں جو بعد میں تحریک کی شکل اختیار کر گئے۔ لکھنوی غزل کی ابتدائی شکل اور پھر اس کی تقلید کے بعد کی شکل اس کی بہترین مثال ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری میں رجحان خود بخود پیدا ہوتا ہے جب کہ تحریک مسلسل کوششوں کے بعد پیدا کی جاتی ہے۔

اگلے دن اندور سے مجھ کھنڈوہ جانا تھا، قاضی حسن رضا صاحب نے میرے اعزاز میں ایک اسکول کے ہال میں پروگرام رکھا تھا۔ ڈاکٹر محبوب راہی بھی آگئے تھے۔ مجھے لینے کے لیے قاضی سفیان آگئے۔ اندور کے بس اسٹینڈ تک عزیز صاحب ساتھ رہے۔ کھنڈوہ کے لیے بس آنے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت گزرا۔ ہم دونوں کھڑے کھڑے وہ باتیں بھی کرتے رہے جو ابھی تک نہیں کرسکے تھے۔ میں نے ان کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ ان کا اصل نام عبدالعزیز خاں ہے۔ 23 جولائی 1932 کو پیدا ہوئے۔ ایم اے، پی ایچ ڈی تک تعلیم حاصل کی اور یونیورسٹی سطح تک درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ شاعری، تنقید، انشائیہ، خاکہ، طنز و مزاح، ریڈیائی فیچر سب کچھ لکھا۔ ترجمے بھی کیے۔ ابھی تک اٹھارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

30 اکتوبر 2014 کو ان کا انتقال ہوا!!

**اردو شاعری کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ اردو شاعروں نے اپنے ذہنی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں اردگرد اور اپنے عہد کے حالات کو پرکھنے کی جب بھی کوشش کی انہیں کسی خاص نظریے یا کسی خاص تحرکات کو اختیار کرنا پڑا۔ جس کے باعث ان کی فکر کو ارتقا کی وہ پابندی نصیب ہوسکی جہاں سے انہوں نے حیات و کائنات کو بھی نگاہِ حق شناس سے بھی دیکھنا شروع کردیا۔**

■
**Dr. Manazir Ashiq Harganvi**, 'Kohsaar"
Bhikanpur-3, Bhagalpur - 812001 (Bihar)

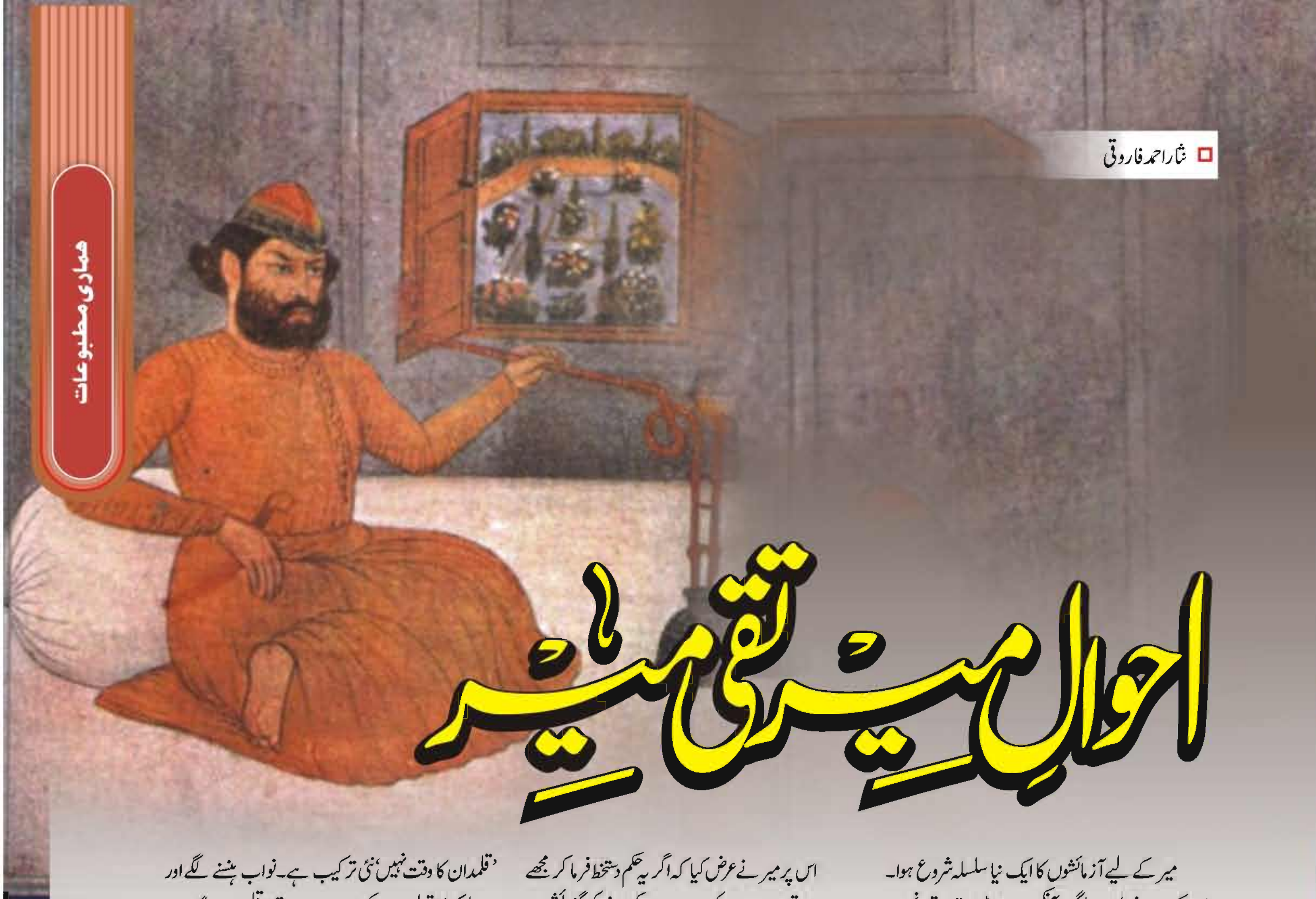

# احوالِ میر تقی میرؔ

نثار احمد فاروقی

میر کے لیے آزمائشوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ والد کے زمانے میں جو لوگ آنکھوں پر بٹھاتے تھے انھوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ سب سے بڑا مسئلہ معاش کا تھا۔ میر 12-11 برس کے تھے دوسرا بھائی محمد رضی ان سے دو ڈھائی سال چھوٹا ہی ہوگا اسے گھر پر چھوڑ کر یہ روزگار کی تلاش میں گھوما کیے لیکن وہاں کوئی صورت نہ نکلی تو آگرے سے پہلی بار دہلی کا رخ کیا۔ یہاں بھی اتنے بڑے شہر میں ایک یتیم بچے کو کون پہچانتا؟ آخر میر کی ملاقات خواجہ محمد باسط سے ہوگئی یہ امیر الامراء نواب صمصام الدولہ خان دوراں خاں کے بھتیجے تھے۔ ان کی حویلی موجودہ ترکمان گیٹ اور دہلی دروازے کے درمیان تھی۔ ان کے والد خواجہ محمد عاصم عہد فرخ سیر میں میر آتش تھے۔ امیر الامرا حسین علی خاں کے دکن جانے کے بعد میر بخشی بنائے گئے تھے۔ خواجہ محمد باسط شاعر بھی تھے، باسطی تخلص تھا۔ صوفی منش اور علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے 1168ھ/1754 میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

غرض خواجہ محمد باسط نے میر پر یہ کرم کیا کہ انھیں اپنے چچا نواب صمصام الدولہ کی خدمت میں لے گئے۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ کس کا لڑکا ہے تو بتایا گیا کہ میر محمد علی کا۔ فرمانے لگے کہ اس کے یہاں آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے گزر چکے ہیں۔ ان کی وفات پر افسوس کیا اور کہا کہ ان کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں ایک روپیہ روز میری سرکار سے اس بچے کو دیا جائے۔

اس پر میر نے عرض کیا کہ اگر یہ حکم دستخط فرما کر مجھے دے دیں تو متصدیوں کو چون و چرا کرنے کی گنجائش نہ رہے۔ یہ کہہ کر میر نے پہلے سے لکھی ہوئی درخواست جیب سے نکالی اور دستخط کے لیے پیش کی۔ اس پر خواجہ محمد باسط نے کہا کہ یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے یہ سن کر میر نے ایک ٹھٹھا مارا۔ نواب نے ہنسی کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ قلمدان ایک بے جان شئے ہے وقت اور غیر وقت نہیں جانتا، جب بھی حکم دیا جائے پیش ہوسکتا ہے۔ انھیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ قلمدان بردار حاضر نہیں، یا یہ نواب کے دستخط کرنے کا وقت نہیں۔

'قلمدان کا وقت نہیں' نئی ترکیب ہے۔ نواب ہنسنے لگے اور بولے کہ معقول بات کہتا ہے۔ اسی وقت قلمدان منگایا اور درخواست پر دستخط کردیے۔

بعض ناقدوں نے اس پر شبہ کیا ہے کہ اتنے بڑے امیر کے دربار میں ایک 12-11 سال کا لڑکا قہقہہ مار کر ہنسنے اور اپنے ایک بزرگ کی لفظی گرفت کرے۔ ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ کی اصلیت کچھ نہ ہو۔ اس لطیفے کے پردے میں میر نے یہ اشارہ کیا ہے کہ نواب صمصام الدولہ بہت معمولی پڑھے لکھے تھے بلکہ بعض مورخوں کا کہنا ہے کہ لکھنا جانتے ہی نہ تھے۔ فارسی کی معمولی شُد بُد رکھتے تھے۔ مگر اپنے زمانے میں بڑے بارسوخ اور دبدبہ والے امیر تھے۔

## نادر شاہ کا حملہ

یہ وظیفہ 5-4 سال ملا ہوگا کہ ہندوستان پر نادر شاہ نے چڑھائی کردی۔ (1739) محمد شاہ اپنی فوج لے کر مقابلہ کرنے کے لیے کرنال تک گیا۔ صمصام الدولہ پیچھے کمک لے کر روانہ ہوئے۔ 13 فروری 1739 کو گھمسان کا رن پڑا، اس میں صمصام الدولہ بری طرح زخمی ہوئے انھیں زخموں نے 17 فروری 1739 کو 68 سال کی عمر میں ان کی جان لے لی۔ وہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے شمال مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد میں مدفون ہیں۔ 9 مارچ 1739 کو نادر شاہ فتح و

ظفر کے نقارے بجاتا ہوا دلی میں داخل ہوا۔ 11,12,13 مارچ کو یہاں قتلِ عام کیا، جس میں تیس ہزار سے زائد انسان قتل ہوئے۔ 5 مئی کو 58 دن دلی میں قیام کرنے کے بعد اس حالت میں رخصت ہوا کہ آٹھ مغل تاجداروں کے جمع کیے ہوئے خزانے اس کی مٹھی میں تھے۔ ایک اندازے کے مطابق 80-70 کروڑ کی مالیت کا سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات اور زرنقد وہ اپنے ساتھ لے گیا جو دس ہزار اونٹوں، دس ہزار گھوڑوں اور تین ہزار جنگی ہاتھیوں پر لادا گیا تھا۔ اس حملہ نے فوجی اور معاشی اعتبار سے مغل حکومت کی کمر توڑ دی۔

## دوبارہ دلی میں

صمصام الدولہ کی شہادت سے میر کا وظیفہ بھی بند ہوگیا۔ آگرے میں کوئی پُرسان حال نہیں تھا مجبوراً دوبارہ دلی کا رخ کیا۔ یہاں فارسی کے مشہور شاعر اور ماہر علم اللغۃ سراج الدین علی خان آرزو (1689-1755) محلہ وکیل پورہ میں رہتے تھے۔ یہ میر کی سوتیلی ماں کے بھائی تھے۔ میر کا قیام انھیں کے گھر پر رہا۔ یہاں انھوں نے خان آرزو سے فارسی سیکھی اگرچہ اس کا کھلے لفظوں میں اقرار کہیں نہیں کیا صرف ایک موقعے پر 'استاد و پیرو مرشد بندہ' لکھا ہے لیکن ان کے معاصرین بھی اس کی گواہی دیتے ہیں کہ میر کی فارسی دانی خان آرزو کی مرہونِ منت ہے۔

## میر کی تعلیم

میر کا بیان ہے کہ جب انھوں نے چند کتابیں 'یارانِ شہر' سے پڑھ لیں اور کسی قابل ہوئے تو آگرہ سے حافظ محمد حسن نے اپنے ماموں خان آرزو کو خط لکھا کہ ''میر محمد تقی فتنہ روزگار ہے اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیے بلکہ دوستی کے پردے میں کام تمام کردینا چاہیے۔''

خان آرزو اپنے بھانجے کے بہکانے میں آگئے اور میر سے دشمنی کا برتاؤ شروع کردیا۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹتے پھٹکارتے اور ہمہ وقت کڑی نگرانی رکھتے تھے۔

## جنون کا حملہ

اسی زمانے میں میر کو شدید گھٹن اور ذہنی پریشانی کے باعث جنون ہوگیا۔ اپنی کوٹھری کا دروازہ بند کیے پڑے رہتے تھے۔ شاید کچھ جارحیت بھی پیدا ہوگئی تھی اس لیے گھر والے ان کے قریب نہ آتے تھے۔ رات کو جب چاند نکلتا تو جنون زیادہ ہوجاتا تھا۔ خود ان کا بیان ہے:

''چاندنی رات میں ایک حسین پیکر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کرۂ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بے خود کردیتا تھا

جدھر بھی آنکھ اٹھتی اُسی رشک پری پر پڑتی تھی جس طرف دیکھتا اُسی غیرتِ حور کا تماشا کرتا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورق تصویر ہوگئے تھے۔ یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا چہرہ نظر آتا۔ کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے۔ کبھی سیر گاہ دل میں محوِ خرام۔ اگر گلِ مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بے قرار ہوجاتی۔ ہر رات اس پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اس کی جدائی میں وحشت، جب سفیدۂ سحر نمودار ہوتا دل سے ٹھنڈی آہیں نکلنے لگتیں۔ یعنی دل مچلتا اور چاند کی طرف لپکتا۔ تمام دن یہی جنون سوار رہتا اور دل اس شکل مہتابی کی یاد میں خون ہوتا۔ میں دیوانہ و مست کے مانند منھ میں کف بھرے ہوئے، ہاتھوں میں پتھر لیے گرتا پڑتا اور لوگ مجھے دیکھ کر بھاگتے۔'' (آپ بیتی، 95)

یہ کیفیت چار مہینے تک رہی۔ فخر الدین خان (جن کے گھر پر علی متقی نے لاہور سے واپسی میں قیام کیا تھا) کی بیوی نے جو علی متقی کی مرید تھیں اور قریبی رشتہ بھی رکھتی تھیں۔ میر کے علاج پر بہت روپیہ خرچ کیا۔ اس سے طبیعت رو بہ اصلاح ہوگئی۔ پریشاں گوئی موقوف ہوئی۔ دماغ کی تری کے لیے دوائیں استعمال کیں تو نیند بھی آنے لگی اور کچھ دنوں میں بالکل تندرست ہوگئے۔ میرا خیال ہے یہ جنونی کیفیت کسی عشق کا ثمرہ تھی اور جس شکل مہتابی کا میر نے تذکرہ کیا ہے وہ خان آرزو کے خاندان کی کوئی لڑکی رہی ہوگی جس کا نام چاندنی، مہتاب یا قمر ہوسکتا ہے۔ اسی کا نام لے کر میر راتوں کو پکارتے تھے اور اسی کیفیت کی صدائے بازگشت ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے:

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا؟

میر نے اس جنون کی کیفیت کو اپنی مثنوی 'خواب و خیال' میں نظم کیا ہے۔

## میر جعفر عظیم آبادی

عالم جنون خدا خدا کرکے گزرا تو اب انھوں نے ترسّلات (یعنی فارسی انشا پردازی) کی کتابیں پڑھنی شروع کردیں۔ اسی زمانے میں ایک دن کسی کتاب کے متفرق اوراق ہاتھ میں لیے ہوئے بازار میں بیٹھے تھے کہ اُدھر سے میر جعفر عظیم آبادی کا گزر ہوا انھوں نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے تمھیں پڑھنے کا شوق ہے۔ میں بھی کتاب کا کیڑا ہوں اگر تم چاہو تو کبھی کبھی آکر تمھیں پڑھا دیا کروں گا۔ میر نے کہا کہ اس سے اچھی کیا بات ہے مگر میری مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ آپ کی کچھ خدمت کرسکوں اگر محض خدا واسطے یہ زحمت گوارا کریں تو عین بندہ نوازی ہوگی۔'' میر جعفر نے کہا کہ مجھے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ تھوڑا سا ناشتہ مل جایا کرے۔ میر کے پاس اتنا بھی انتظام نہیں تھا۔ مگر انھوں نے وعدہ کرلیا کہ اہل مالک ہے میر جعفر آتے رہے اور انھوں نے بڑی تن دہی سے میر کو فارسی پڑھائی۔ پھر اچانک اُن کے وطن عظیم آباد (پٹنہ) سے بلاوا آگیا اور وہ اُدھر چلے گئے۔

## سید سعادت علی

اب اتنا ہوگیا تھا کہ میر کو فارسی زبان میں لکھنے کی قدرت حاصل ہوگئی۔ طبیعت حساس اور درّاک تھی۔ ماحول میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اُنھوں نے بھی فارسی میں شعر لکھنا شروع کردیے اور خاصی مشق بہم پہنچالی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی ملاقات سید سعادت علی سعادت امروہوی سے ہوگئی جنھوں نے میر کی فنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کرکے انھیں ضائع ہونے سے بچالیا اور ٹھیک راستے پر لگا دیا۔ جس طرح سعد اللہ گلشن نے ولی دکھنی کو ریختہ میں شعر کہنے کا مشورہ دیا تھا، اسی طرح سعادت امروہوی نے میر سے کہا کہ وہ کیوں فارسی میں اپنی صلاحیت برباد کررہے ہیں۔ ایرانی انھیں مستند ماننے سے رہے، نہ اُن کی شاعری کو خاطر میں لائیں گے۔ پھر فارسی کا رابطہ عوام سے بھی نہیں ہے۔ یہ خواص کی زبان ہے۔ اس لیے انھیں چاہیے کہ اردوئے معلّی کی زبان میں شاعری کریں تاکہ اُن کی شاعری کو قبولیت عامہ حاصل ہو۔ میر نے اس مشورے کو گرہ میں باندھ لیا اور اردو میں شعر کہنا شروع کردیا، اس کو قبول کرنے کے لیے سارا ماحول پہلے ہی سے تیار تھا، تھوڑے ہی دنوں میں ان کے اشعار بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئے اور گلی کوچوں میں پڑھے جانے لگے۔ وہ

خود لکھتے ہیں:

"کچھ دنوں بعد سعادت علی نام کے ایک سید سے میری ملاقات ہوئی جو امروہہ کے رہنے والے تھے اور انھوں نے مجھے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی جو شعر فارسی کی طرح قلعہ شاہی کی زبان میں شاعری ہے اور اس وقت بہت رواج پا رہی تھی۔ میں نے بھی بہت محنت کی اور اپنی مشق اتنی کر لی کہ شہر کے شاعروں میں مستند سمجھا جانے لگا۔ میرے اشعار گلی کوچوں میں پڑھے جانے لگے اور ادنیٰ و اعلا کے کانوں تک پہنچ گئے۔" (میر کی آپ بیتی، 98)

یہاں سید سعادت علی کا تھوڑا سا تعارف کرا دیا جائے۔ یہ امروہہ کے محلہ حقانی میں رہتے تھے۔ دلّی آ کر قلعہ شاہی میں ملازم ہوئے۔ حضرت شاہ شرف الدین سہروردیؒ ولادت غالباً 663ھ/ 1264ء کی اولاد میں تھے جو 'شاہ ولایت' کہلاتے ہیں جب مشہور سیاح ابن بطوطہ امروہہ پہنچا ہے تو ان کا آخری زمانہ تھا۔ امروہہ کے بیشتر سادات نقوی اِنھیں کی اولاد میں ہیں۔ عہد اکبری کے میر عدل سید محمد بھی ان کے اخلاف میں سے تھے۔ سعادت اپنے زمانے میں نہایت ممتاز شاعر تھے اور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنا دیوان ریختہ بھی مرتب کیا تھا جس کا پہلا شعر یہ تھا:

واللہ جو سر لوح ترا نام نہ ہوتا
ہرگز کسی آغاز کو انجام نہ ہوتا

ان کے مراثی اور مناقب و سلام بھی اُس زمانے میں مقبول تھے۔ ایک داستانِ عشق بھی سیلیٰ مجنوں (بروزن لیلیٰ و مجنوں) لکھی تھی۔ اب ان کے صرف 17 اردو اشعار دستیاب ہوتے ہیں۔ تقریباً چالیس سال کی عمر میں تپ محرقہ کے آزار میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔

## نواب رعایت خاں کی ملازمت

1160ھ (1747) میں ایک دن خان آرزو نے میر کو کھانے پر بلایا اور کسی بات پر بہت بری طرح ڈانٹا۔ یہ بہت کڑھے اور کھانا کھائے بغیر اٹھ گئے۔ باہر نکل کر یونہی جدھر کو منہ اٹھ گیا چل دیے اور حوض قاضی پر آ نکلے جو نواب قمرالدین خاں وزیر کی حویلی کے پاس تھی اور اس نام سے دلی کا ایک محلہ آج بھی موجود ہے۔ یہاں میر پانی پی رہے تھے کہ ایک شخص علیم اللہ سامنے آئے اور کہنے لگے کیا تم میر تقی ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ مگر آپ نے کیسے پہچانا؟ وہ بولے کہ تمھاری سودائیانہ وضع تو سارے شہر میں مشہور ہے۔ نواب قمرالدین خاں کے داماد نواب رعایت خاں نے جب سے تمھارے اشعار سنے ہیں وہ تم سے ملنے کا مشتاق ہے۔ اگر تم میرے ساتھ نواب کے دربار میں چلو تو میرے لیے بھی ملاقات کا ایک بہانہ ہو جائے گا۔ میر آمادہ ہو گئے اور علیم اللہ کے ساتھ وہاں پہنچے۔ نواب بڑے اخلاق سے پیش آیا اور میر کو اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا۔ اس طرح میر کی پہلی ملازمت کا آغاز ہوا۔

## میر کا سفر ہند

ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ احمد شاہ درانی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ وہ 8 جنوری 1748 کو لاہور پہنچا۔ 11 جنوری کو اس نے لاہور پر قبضہ کر کے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ محمد شاہ ان دنوں بیمار تھا اس نے شہزادہ احمد شاہ کو دو لاکھ لشکر کے ساتھ احمد شاہ درّانی کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ نواب قمرالدین خاں وزیر، اور جے پور کے مہاراجہ جے سنگھ سوائی کا بیٹا ایشر سنگھ اور نواب رعایت خاں وغیرہ امراء بھی اس لشکر میں گئے جو 25 فروری 1748 کو سرہند پہنچا تھا۔ میر اس سفر میں رعایت خاں کے ساتھ تھے اور خدمات بجا لا رہے تھے۔ اس سفر میں انھوں نے انعام اللہ خاں یقین کے دادا محمد تقی سے ملاقات بھی کی تھی۔ 2 مارچ کو ابدالی نے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ ابھی مغل فوجیں مقابلہ کر ہی رہی تھیں کہ اچانک ایک حادثہ رونما ہوا۔ نواب قمرالدین خاں وزیر اپنے خیمے میں چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے کہ توپ کا ایک گولا اُن کی پیٹھ پر آ کر گرا اور وہ اُسی وقت مر گئے۔ لیکن ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ایک گولا احمد شاہ ابدالی کے بارود خانے میں بھی جا پڑا اور اس سے اتنا زبردست دھما کا ہوا کہ ہاتھی گھوڑے سب بھاگ گئے اور تقریباً ایک ہزار سپاہی جل کر بھسم ہو گئے مجبوراً ابدالی کو میدان چھوڑنا پڑا اور مغل فوج کو فتح نصیب ہوئی اس کی تاریخ کسی نے 'فتح خداساز' (1161ھ) کہی ہے۔ نواب کی لاش کو لا کر دہلی میں دفن کیا گیا وہ دلی کالج، اجمیری گیٹ (بعد کو ذاکر حسین کالج) کے احاطے میں گرلز کامن روم کے صحن میں مدفون ہیں۔ یہ ان کا خاندانی قبرستان تھا۔

احمد شاہ درّانی

## احمد شاہ کی تخت نشینی

جب یہ لاؤ لشکر دلی کی طرف واپس آ رہا تھا تو پانی پت کے قریب یہ خبر ملی کہ محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ (16 اپریل 1748) صفدر جنگ نے فوراً چتر اور تخت شاہی شہزادہ احمد شاہ کے سامنے پیش کیا اور اُسے بادشاہ بنا کر نذریں گزاریں (21 اپریل 1748) احمد شاہ نے اسے وزیر مقرر کر دیا۔ اس طرح جب میر اس قافلے کے ساتھ دلی میں داخل ہوئے تو احمد شاہ بادشاہ ہو چکا تھا۔ اس نے جاوید خاں خواجہ سرا کو نواب بہادر خطاب دے کر امرا کی صفت میں شامل کر لیا۔ تخت نشینی کے وقت احمد شاہ کی عمر 23 سال تھی۔ اس کی ماں اودھم بائی مان خاں قوال کی بہن تھی جسے بعد میں نواب قدسیہ صاحب الزماں بیگم کا خطاب عطا ہوا۔ جاوید خاں ہفت ہزاری منصب تک پہنچا۔ مغل دور میں یہ پہلا خواجہ سرا تھا جسے اتنا بڑا اعزاز نصیب ہوا۔ اس زمانے میں طبقۂ شرفا سخت ناراض تھا اور گانے بجانے والوں کی بن آئی تھی۔ 27 اگست 1752 کو نواب صفدر جنگ نے جاوید خاں کا کام تمام کرا دیا (27 شوال 1165ھ) احمد شاہ کو عماد الملک نے اندھا کر کے تخت سے اتار دیا تھا۔ (سہ شنبہ، 10 شعبان 1167ھ/ 2 جون 1754) عیسوی حساب سے اس کی عمر 48 سال 3 ماہ 16 دن۔

## اجمیر کا سفر

صفدر جنگ نے وزیر ہونے کے بعد میر بخشی کا عہدہ سادات خاں ذوالفقار جنگ کو پیش کیا۔ وہ بڑے کرّ و فر کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے ریاست جودھپور کے مہاراجہ ابھے سنگھ کے چھوٹے بھائی بخت سنگھ کو فوجی امداد دے کر ابھے سنگھ سے لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ بخت سنگھ نے اپنی فوج کی کمان رعایت خاں کے سپرد کی اور اس طرح میر بھی اس فوج کے ساتھ سانبھر (راجستھان) کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں ابھے سنگھ اور بخت سنگھ کی فوجوں کا مقابلہ ہوا، ابھے سنگھ کی فوج بددل ہو رہی تھی اُس نے پانسا پلٹتے دیکھا تو ملہار راؤ ہولکر کو درمیان میں ڈال کر صلح کر لی۔ اس مہم کے بعد میر اجمیر کی طرف گئے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ کے آستانے پر حاضری دی پھر اجمیر کے قابل دید مقامات کی سیر کی۔ وہاں سے پشکر آئے جو مشہور تیرتھ استھان ہے اور جہاں برہما کا مندر بھی ہے۔

غالباً پُشکر ہی میں بخت سنگھ اور رعایت خاں کے درمیان کسی بات پر تو تو میں میں ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ دونوں میں باقاعدہ صف آرائی ہو جائے۔ رعایت خاں کے ایک مصاحب ستار قلی خاں کشمیری نے بخت سنگھ کو گالیاں دی تھیں جس کی وجہ سے وہ بھرا بیٹھا تھا۔ اس موقعے پر میر نے سفارت کے فرائض انجام دیے وہ بخت سنگھ سے جا کر ملے تو رعایت خاں کی طرف سے قسمیں کھا کر یہ قول و قرار کیے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مگر راجا نے رعایت خاں کے رسالے کی بقایا تنخواہ ادا کر کے انھیں رخصت کر دیا اور میر دلّی واپس آ گئے۔

## ملازمت ترک کر دی

اس زمانے میں ایک چاندنی رات کو رعایت خاں اپنی ڈیوڑھی میں مہتابی پر بیٹھا کسی ڈوم سے گانا سن رہا تھا۔ اس نے میر سے کہا کہ اپنی کسی غزل کے چار پانچ شعر اس لڑکے کو یاد کرا دو تو یہ اپنے طور پر دھن بنا کر گا لے گا۔ میر نے اس سے معذرت کر لی تو اس نے اپنے سر کی قسم دے کر ان سے اصرار کیا۔ مجبوراً انھوں نے اُس ڈوم کو اپنے شعر یاد تو کرا دیے مگر یہ بات اتنی ناگوار ہوئی کہ رعایت خاں کی ملازمت چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور پھر اس کے دربار میں نہیں گئے۔

رعایت خاں نے میر کے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا دے کر ملازمت میں رکھ لیا۔ بہت دنوں بعد میر سے ملاقات ہوئی تو اس نے بہت معذرت کی۔

## جاوید خاں کی ملازمت

تھوڑا زمانہ بے روزگاری کا گزرا تھا کہ نواب جاوید خاں خواجہ سرا کی فوج کے بخشی اسد یار خاں نے میر کی سفارش کر کے انھیں جاوید خاں کے ملازموں میں بھرتی کرا دیا۔ گھوڑے اور نوکری کی شرط بھی معاف کرا دی۔ مطلب یہ کہ بس تنخواہ لیتے رہو۔ میر کہتے ہیں کہ ''وہ میرا بڑا لحاظ اور بہت امداد و اعانت کرتا تھا۔''

## فرخ آباد کا سفر

نواب صدر جنگ کو قائم خاں بنگش (نواب فرخ آباد) سے گہری عداوت تھی اور اس خاندان کو ملیامیٹ کرنے کے منصوبے بہت دنوں سے بنا رہا تھا۔ اس نے پہلے تو حافظ رحمت خاں اور نواب قائم خاں کے درمیان جنگ کا بیج بویا اور جب اس میں قائم خاں بنگش مارا گیا (نومبر 1749) تو قائم خاں کی والدہ کو دھوکے سے بلا کر گرفتار کر لیا اور راجا نول رائے کو وہاں کا حاکم بنا دیا۔ قائم خاں کے بھائی احمد خاں بنگش نے فوج جمع کر کے مقابلہ کیا اور راجا کو قتل کر دیا اور اس کی فوج کو لوٹ کھسوٹ کر مار بھگایا۔ اس خبر کے ملتے ہی صفدر جنگ نے ایک لشکر جرار تیار کیا جس میں سورج مل جاٹ، نجم الدولہ اسحاق خاں وغیرہ بھی شامل تھے۔ 23 جولائی 1750 کو یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا لشکر دلّی سے نکلا اور چٹونی (سہاور) کے مقام پر فرخ آباد سے چند کوس اِدھر میدان کارزار گرم ہوا۔ اس میں نواب اسحاق خاں مارا گیا اور صفدر جنگ زخمی ہوا۔ فوج پسپا ہو کر دلی آ گئی۔ میر بھی اس فوج میں نواب اسحاق خاں کے ساتھ گئے تھے اور ان کی موت کے بعد بڑی تکلیفیں جھیلتے ہوئے خوار و خستہ ہو کر دلی واپس آئے تھے۔ اگلے سال 1751 میں صفدر جنگ نے دوبارہ لشکر کشی کر کے احمد خاں کو شکست دی۔

## مہانراین دیوان کی ملازمت

اِدھر سادات خاں میر بخشی اور جاوید خاں خواجہ سرا میں سخت عداوت تھی۔ اس لیے سادات خاں معزول کر دیے گئے اور ان کی جگہ نظام الملک آصف جاہ (بانی ریاست حیدر آباد) کے بیٹے نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ (جنھوں نے شہر غازی آباد بسایا تھا) امیر الامراء ہوئے اور انھیں دکن کا صوبہ دیا گیا۔ مگر وہ دکن جاتے ہوئے راستے ہی میں ہیضہ سے مر گئے (1751) اُن کا منصب اُن کے بیٹے نواب عمادالملک کو ملا۔ اس زمانے میں میر کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے تھے اور مطوّل پڑھ رہے تھے۔ مگر ان کا وظیفہ جاری تھا۔ 28 اگست 1752 کو صفدر جنگ نے جاوید خاں خواجہ سرا کو مروا ڈالا تو یہ وظیفہ بند ہو گیا۔ صفدر جنگ کے دیوان مہانراین نے اپنے داروغہ دیوان خانہ یعنی شرف الدین پیام کے بیٹے میر نجم الدین علی سلام کے ہاتھ کچھ نقد روپیہ بطور امداد بھیجا اور بڑے اشتیاق سے میر کو طلب کیا۔ چند ماہ کے لیے میر نے مہانراین دیوان کی ملازمت اختیار کر لی اور یہ زمانہ فراغت کے ساتھ گزرا۔ تقریباً یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے شعرائے اردو کا تذکرہ 'نکات الشعرا' ترتیب دیا۔ ■

**ماخذ:** میر تقی میر، مصنف: نثار احمد فاروقی، سنہ اشاعت: 2014، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

عبداللہ امتیاز احمد

# عربوں کی کلاسیکی شاعری

عربوں کے یہاں زمانہ قدیم سے ہی شعروشاعری کی مستحکم روایت دیکھنے کو ملتی ہے۔ شاعروں کو معاشرے میں بہت اہمیت حاصل تھی۔ شاعر کو قبیلے کے لیے باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ جرجی زیدان نے قدیم عہد کے شعرا کی معاشرتی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''جب کسی قبیلے میں کوئی شاعر مہارت حاصل کر لیتا تھا تو دوسرے قبیلے والے اسے مبارک باد دینے آتے تھے۔ کھانے پکائے جاتے اور عورتیں جمع ہوکر رقص وسرود پیش کرتی تھیں جیسے شادی بیاہ میں پیش کیا جاتا تھا۔''

جرجی زیدان، آداب اللغۃ العربیہ، جلد اوّل، ص 96

عوام کو شعروشاعری سے صرف گہری دلچسپی ہی نہیں تھی بلکہ اس پر دسترس بھی رکھتے تھے۔ معاشرے کا ہر فرد شعرو شاعری کے پیچ وخم سے واقف تھا۔ دورانِ گفتگو شعری زبان کے استعمال کو ترجیح دیتا تھا۔ اہلِ عرب شعر کی اثر آفرینی سے پوری طرح واقف تھے اور انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ولولہ انگیز شاعری دلوں کو گرماتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میدانِ جنگ میں مقابلہ آرائی سے قبل وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو رجزیہ اشعار کی شکل میں پیش کرتے اور ان کی عورتیں بھی شعروشاعری سے اپنے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتی تھیں۔ غرض کہ عربوں کے یہاں جنگ وجدل کے موقع پر رجزیہ اشعار پڑھنے کی روایت پہلے سے موجود تھی۔ عربوں کے یہاں شاعری کا مقصد صرف وقت گزاری نہیں تھا بلکہ اسے زندگی سنوارنے کا وسیلہ بھی سمجھتے تھے۔ بحیثیت مجموعی عربوں کا شاعرانہ ذوق بہت بلند تھا اور وہ شاعری کے اخلاقی وافادی پہلو پر زیادہ زور دیتے تھے۔

عربی شاعری پر مفصل بحث کرنے سے قبل عربوں کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا حسب موقع اور مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کوئی بھی ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس میں اپنے ماحول، معاشرے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے۔ دورِ قدیم میں عرب معاشرہ مختلف قبیلوں پر مشتمل تھا۔ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ سے نہ تو مستقل طور پر زراعت کی جاسکتی تھی، نہ شہر آباد ہوسکتے تھے اور نہ ہی ذریعۂ معاش کا ہی کوئی معقول انتظام تھا، جس کی وجہ سے لوگ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے اور قبیلے والے ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہجرت کرنے کے لیے مجبور ہوتے تھے۔ ان تمام جغرافیائی ناہمواریوں کے باوجود ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر سبقت حاصل کرنے کے لیے برسرِ پیکار رہتا تھا۔ یہ مقابلہ آرائی صرف معاشرتی سطح پر ہی نہیں بلکہ ادبی سطح پر بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کو قبیلے میں بڑی قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انھیں اس بات کی خوشی ہوتی کہ اب ان کے قبیلے میں بھی اسلاف کے کارناموں اور ان کی عظمت کو بیان کرنے والا آ گیا ہے، جس سے معاشرے میں ان کے قبیلے کی قدرومنزلت بڑھ جائے گی اور لوگ انھیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں شعرا کی ایک بڑی تعداد دیکھنے کو ملتی ہے۔ زیادہ تر شعرا کا تعلق قبیلۂ قیس، مین اور قریش سے تھا۔ اس عہد کے تقریباً 125 شعرا کی فہرست دستیاب ہوتی ہے، جیسا کہ جرجی زیدان نے دورِ جاہلیت کے شعرا کے اعداد وشمار پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جاہلیت کے شعرا کا شمار ممکن نہیں لیکن خبروں کا، مثالوں کے طور پر استعمال ہوئے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد 125 تھی۔''

جرجی زیدان، آداب اللغۃ العربیہ، جلد اوّل، ص 96

اسی ماحول میں قصیدہ جیسی شاندار صنف کی ابتدا ہوئی جس کو عربی ادب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ عربی ادب میں قصیدے کا دائرہ بے حد وسیع اور آج کے قصیدوں سے اس کا تصور بالکل مختلف تھا۔ وہ ہر طرح کی شاعری کو قصیدہ کہتے اور قصیدے کی ہیئت میں ہر طرح کے موضوعات کو پیش کرتے تھے۔ اس وقت کی شاعری کے اہم موضوعات میں عربوں کی سخاوت وشجاعت، جواں مردی، مے نوشی، تکبر، سیر و شکار، جنگ و جدل، سچی داستانیں، عشق و عاشقی، قبائلی فضیلت، فخر وخودستائش، مہمان نوازی، دشمنوں کی ہجو اور ان کی بے مروتی، بزدلی، طنز وتمسخر اور گھوڑوں کے اوصاف وغیرہ شامل تھے۔ یہاں تک کہ عربی شاعری کے ابتدائی دور میں قصیدہ کے معنی ومفہوم مدح وذم کے نہیں تھے، بلکہ اس کی ابتدا بہت بعد میں ہوئی۔ اس عہد کی شاعری میں صداقت، سادگی اور حقیقت پسندی کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ شعرا نے جو محسوس کیا اسے اپنی شاعری میں پیش کر دیا، یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی شاعری میں تجربے ومشاہدے کی گہرائی وگیرائی

نظر آتی ہے اور ان کی شاعری کا بیشتر حصہ برجستہ اور آمد سے پر ہے جو کہ وجدانی اور قلبی احساسات وخیالات کا آئینہ خانہ ہے۔ دورِ جاہلیت کے شعرا بہت غیور تھے کسی کی مدح و ستائش ان کا شیوہ نہیں تھا۔ عربوں میں شعروشاعری کا ذوق اس قدر پروان چڑھ چکا تھا کہ شعرا کی قادرالکلامی اور شاعرانہ صلاحیت کو پرکھنے کے لیے باقاعدہ مقابلے منعقد ہوتے اور پھر ان کے کلام کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جاتا، جس کا اندازہ عکاظ کے میلے سے لگایا جاسکتا ہے۔

طائف شہر کے قریب منعقد ہونے والے عکاظ کے میلے میں دور دراز سے شعرا سفر کر کے شرکت کرتے اور اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد وتحسین حاصل کرتے تھے۔ ان شعرا کے کلام کو تنقید کے معیار ومیزان پر تولا جاتا اور ان میں سے منتخب قصیدے کو آب زر سے لکھ کر خانہ کعبہ کی دیواروں پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ عربی ادب میں ایسے سات قصیدے دستیاب ہوتے ہیں جنھیں 'سبع معلقہ'، 'سبع مذہبیات' یا 'السّموط' کہا جاتا ہے۔ سبع معلقہ میں شامل شاعروں میں امراؤالقیس، طرفہ، زہیر، لبید، عمرو بن کلثوم، عنترہ اور الحارث بن حلزہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ مگر کچھ عرب محققین عنترہ اور الحارث بن حلزہ کے بجائے نابغہ ذیبانی اور اعشیٰ کا نام سبع معلقہ کے شاعروں میں شامل کرتے ہیں۔

امراؤالقیس کا شمار سبع معلقہ کے عظیم واولین شعرا میں ہوتا ہے جس نے اپنی قادرالکلامی اور شاعرانہ صلاحیت کی وجہ سے پورے عرب میں شہرت حاصل کی۔ امراؤالقیس کے بعد آنے والے تمام شعرا اس کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے رہے اور آج تک عربی شاعری میں اس کا اثر جاری وساری ہے۔ اس کی شاعری میں پرشوکت الفاظ، ندرت خیال اور خوب صورت تشبیہ کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس نے زندگی کے تجربے اور مشاہدے کو شعری پیکر میں ڈھالا اور عربی شاعری کو سادگی اور صداقت کے راستے پر گامزن کر دیا۔ ان تمام چیزوں کے باوجود اس کی شاعری میں کہیں کہیں پیچیدگی، مشکل پسندی اور غرابت کا احساس ہوتا ہے مگر تخیل کی سادگی، اسلوب کی پرکاری اور جذبے کے گداز نے اسے ممتاز کر دیا ہے۔ اس عہد کے شعرا نے الفاظ کی تراش خراش، نوک پلک کی درستگی، تشبیہات واستعارات کی ندرت، الفاظ وقواعد کی تفتیش، تنقیح اور فصاحت وبلاغت کی عمیق جستجو وغیرہ پر بہت توجہ صرف کی جس سے ان کی شاعرانہ بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

امراؤالقیس کے بعد کے شعرا میں سب سے اہم نام زہیر ابن سلمیٰ کا آتا ہے جس نے عربی شاعری کو پند ونصیحت جیسے نئے موضوع سے روشناس کرایا۔ عنترہ بن شداد نے عربی شاعری میں رزمیہ عناصر کو شامل کر کے داد وتحسین حاصل کی۔ نابغہ ذیبانی نے عربی قصائد میں مدح سرائی، مبالغہ آرائی اور شراب کی تعریف وتوصیف کر کے ایک نئے موضوع کا آغاز کیا۔ عربی شاعری میں سب سے پہلے اسی نے قصیدے کو ذریعۂ معاش بنایا۔ مدح سرائی میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ نابغہ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے زبیداحمد لکھتے ہیں:

''مداحی کی وجہ سے گرچہ وہ اس قدر متمول ہو چکا تھا کہ سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھاتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی عرب میں اس کی کچھ وقعت نہیں رہی تھی اس لیے کہ ان کے یہاں شاعری کو ذریعہ معاش بنانا سخت عیب تھا۔''

زبیداحمد: آداب العرب، جلد اوّل، ص 140

نابغہ کا شمار اپنے عہد کے مقبول ومعروف شعرا میں ہوتا تھا۔ کچھ عرب محققین امراؤالقیس کے بعد اسے عربی ادب کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ احمد حسن زیات اس کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اپنے دونوں ساتھیوں سے جو چیز اسے ممتاز کرتی ہے وہ کنایہ، جدت وندرت، اشارے میں حسن ونزاکت، مضمون کی صفائی، فصاحت، تکلف اور تصنع کی قلت ہے۔''

احمد حسن احمد زیات: تاریخ ادب عربی، ص 199

نابغہ ذیبانی کی اس روایت کو آگے بڑھانے میں اعشیٰ نے اہم کردار ادا کیا۔ ان دونوں کے قصائد کا مقصد حصولِ دولت تھا مگر ان کی مدح حقیقت پر مبنی ہوتی تھی۔ اصحابِ سبع معلقات کے علاوہ بھی اس عہد میں بہت سے شعرا وشاعرات کا ذکر ملتا ہے جو اس صنف پر طبع آزمائی کر رہے تھے جس میں کچھ شعرا کا نام آج بھی عربی ادب میں عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان شعرا کے کلام کو اپنے ہم عصر دوسرے شعرا کے کلام سے کم تر سمجھنا قطعی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ان شعرا میں مہلہل بن ربیعہ، امیہ ابن ابی الصت، شنفری، تابط شرا، متلمس اور العفیفہ بن عبید وغیرہ کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ شاعرات میں خنسا، خرنق بنت بدر اور لیلیٰ المفیفہ وغیرہ کا نام اس دور کی شاعری میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

طلوع اسلام کے ساتھ ہی عرب معاشرے میں شعروشاعری کا بازار سرد پڑتا چلا گیا اور بہت سے شعرا نے قبولِ اسلام کے بعد شاعری ترک کردی لیکن یہاں ایک بات جو قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ ابھی تک اسلام نے شعروشاعری کی مخالفت نہیں کی تھی مگر اسلام کے عالم وجود میں آنے کے ساتھ ہی عرب معاشرے میں سماجی، سیاسی، مذہبی اور ذہنی سطح پر انقلاب آچکا تھا جس کا اثر اس دور کی شاعری پر واضح طور سے دیکھا جاسکتا ہے، جس کی وجہ سے اس عہد کے شعرا نے ظہور اسلام سے پہلے کی شاعری کی بہت سی خصوصیات کو ترک کر دیا اور اس کی جگہ شاعری میں پند وموعظت اور اخلاقی تعلیم کی پیش کش پر زور دیا جانے لگا جس سے حقانیت اور انسانیت کے فروغ میں بہت مدد ملی۔ اس دور کے بیشتر شعرا نے محمدؐ کی شان میں بہترین قصیدے کہے ہیں۔ جن شعرا نے ماقبلِ اسلام اور طلوع اسلام دونوں ادوار میں شاعری کی ہے انھیں عربی ادب میں 'شعرائے مخضرمین' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان شعرا میں حسان بن ثابتؓ، کعب بن زہیر، نابغہ جعدی، حطیہ اور عبداللہ بن روامہ وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے جنھوں نے اپنی شاعری سے عربی ادب کے معیار کو بلندی عطا کی اور اپنے بعد آنے والے شعرا کے لیے راستہ

**امراؤالقیس کا شمار سبع معلقہ کے عظیم واولین شعرا میں ہوتا ہے جس نے اپنی قادرالکلامی اور شاعرانہ صلاحیت کی وجہ سے پورے عرب میں شہرت حاصل کی۔ امراؤالقیس کے بعد آنے والے تمام شعرا اس کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے رہے اور آج تک عربی شاعری میں اس کا اثر جاری وساری ہے۔ اس کی شاعری میں پرشوکت الفاظ، ندرت خیال اور خوب صورت تشبیہ کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس نے زندگی کے تجربے اور مشاہدے کو شعری پیکر میں ڈھالا اور عربی شاعری کو سادگی اور صداقت کے راستے پر گامزن کر دیا۔**

ہموار کیا اور ان کے لیے مشعلِ راہ کا کام کرتے رہے۔ اس دور کی شاعری پر اسلامی تعلیمات ونظریات کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ شاعری میں صداقت پر زور دیا جاتا تھا اور انھیں واقعات کو شاعری کا موضوع بناتے جو حقیقت پر مبنی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حسان بن ثابتؓ نے اپنی شاعری میں اسلامی غزوات کا حال تفصیل سے پیش کیا ہے اور کفاروں کی ہجو کا جواب بھی دیا اور کہیں کہیں محمدؐ کی تعریف وتوصیف بھی بیان کی ہے۔ یہیں سے نعتیہ شاعری کا آغاز تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس عہد کے بیشتر شعرا کی تشبیہیں ناصحانہ اور اخلاقی ہوتی تھیں۔

عہدِ بنوامیہ میں عربی شاعری میں تین اہم قصیدہ گو شعرا کا ذکر ملتا ہے جس میں اخطل، جریر اور فرزق کا نام قابلِ ذکر ہے۔ خلفاءِ راشدین کے دور کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلمانوں میں رومی قیصریت اور عجمی کسرویت پیدا ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا کا مذاق بھی بدلنے لگا۔ اس بدلتے ہوئے درباری ماحول نے شعرا کے فکر وفن کو بے حد متاثر کیا جس نے ان کی شاعری پر دیرپا اثرات مرتب کیے اور اسلامی عہد کے دورِ اولیٰ کی نازک خیالی اور جدت طرازی میں اخطل کو جریر اور فرزق پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ اس نے اپنی شاعری میں مدح سرائی اور شراب کی تعریف وتوصیف میں کمالات دکھائے اور جریر نے حسن اسلوب، شیرینیِ تغزل اور تلخیِ ہجو کی وجہ سے اپنے ہمعصر شعرا میں بلند مقام حاصل کرلیا۔

دورِ عباسیہ میں ایک بار پھر اسلامی سلطنت سیاسی و سماجی انقلاب سے دوچار ہوئی جس نے عربی شاعری پر دوررس اثرات مرتب کیے اور اس دور میں رونما ہونے والی اہم تبدیلیوں کے نقوش اس عہد کی شاعری میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ سادگی کے بجائے دیدہ زیب لوازم زندگی میں شامل ہونے لگے۔ عیش ونشاط کی محفلیں، سماجی زندگی میں تبدیلی، مذہبی آزادی، معاشرتی بکھیڑوں کی قلت، مصنوعی شان وشوکت اور تہذیبی انتشار نے عربی شاعری کی پوری عمارت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس دور کی شاعری میں لفظ کو معنی پر ترجیح دی جانے لگی اور طرز ادا پر زیادہ توجہ صرف کی گئی جس کی وجہ سے اسلوب میں جدت اور نازک خیالی پیدا ہوئی۔ مدح سرائی پر ضرورت سے زیادہ توجہ دیا جانا فارسی شاعری کے اثرات کا نتیجہ تھی۔ طنز وظرافت بھی اس عہد کی شاعری کے اہم عنصر میں شامل ہے جس پر خاص توجہ دی جانے لگی۔ تشبیب میں منظر نگاری کو خاص مقام حاصل ہوگیا جو کہ اثر انگیزی اور حقیقت نگاری سے خالی نظر آتی ہے۔

اس عہد کے شعرا میں ابوالعتاہیہ، ابونواس اور متنبی نے قصیدہ گوئی میں بہت شہرت ومقبولیت حاصل کی، ابونواس نے طرزِ ادا اور جزئیات نگاری میں نئی نئی راہیں دریافت کیں۔ سب سے پہلے اسی نے 'توصیفِ غلمان' کے عنصر کو شاعری میں شامل کرکے تمام شعرا کی توجہ اپنی طرف مرکوز کی۔ ابوالعتاہیہ نے نزاکتِ خیال، سہولت الفاظ اور متنوع مضامین کے ذریعے اپنے قصائد میں نئی شان پیدا کرنے کی کوشش کی اور وہ ابونواس کی طرح الفاظ ومعنی کی تفتیش وتنقیح پر زیادہ توجہ صرف نہیں کرتا تھا۔ متنبی نے اپنے قصیدوں میں معنی آفرینی، علوئے خیال اور حکمت امثال کا التزام کیا۔ گریز میں اس نے نئے نئے تجربے کیے مگر محاوروں اور الفاظ کے غیر مناسب استعمال، بعید از قیاس واقعات اور استکرار لفظی کی وجہ سے اس کا فن بری طرح مجروح

ہوا۔ متنبی نے اپنی شاعری میں منظر نگاری، فطرت کی عکاسی، فلسفہ طرازی اور عشقیہ مضامین کو اپنی شاعری میں خاص طور پر اہمیت دی، اس نے ہجو نگاری کو تلخ بتایا اور اپنی شاعری میں بدوی تہذیب وتمدن اور طرزِ زندگی کا خوب صورت مرقع پیش کیا ہے۔ تشبیب اور گریز میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس عہد کے شاعروں میں ایک اہم نام ابوالعلا المعری کا بھی شامل ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں متقدمین شعرا کی پیروی کی اور انھیں کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے پرشوکت اور پرزور الفاظ میں، بدویانہ طرزِ ادا، مشکل پسندی اور بے جا پابندیوں کا التزام کیا۔ اس نے جانوروں کے مکالمے اور مناظرے کو تشبیب میں شامل کرکے اس کے ذریعے اخلاقی وعلمی درس دینے کی کوشش کی ہے۔ احمد حسن زیات نے ابوالعلا المعری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"متنبی کے بعد یہ سب سے بڑا حکیم شاعر ہے۔ لیکن دقتِ خیال نیز انواع فلسفہ، اجتماعی مسائل، اخلاقیات، نظام ہائے حکومت اور قوانین وادیان کو شاعری میں جگہ دینے کی وجہ سے وہ متنبی سے بھی ممتاز اور اس راہ میں اپنی قسم کا واحد شاعر ہے۔"

احمد حسن زیات، تاریخ ادب عربی، ص 465

عباسی حکومت کے زوال کے ساتھ ہی مصر، اندلس اور عراق میں فاطمین، اموی اور عباسیوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ رفتہ رفتہ اس عہد کے بیشتر شعرا ان درباروں سے منسلک ہونے لگے۔ اس کے بعد عثمانی ترکوں کے دور کا آغاز ہوا جس نے عربی شاعری پر دیرپا اثرات مرتب کیے مگر اس دور کی شاعری نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی۔ اس دور کے بیشتر شعرا اپنے متقدمین شعرا کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ اس دور کی شاعری میں تصنع وتکلف کی وجہ سے عربی شاعری کی صداقت اور سادگی خاک میں مل گئی اور آمد کی جگہ آورد نے لے لی۔ زبان تصنع وتکلف کی وجہ سے گراں بار ہوگئی اور اپنا فطری حسن کھوتی چلی گئی۔ اس دور کی شاعری پر عجمی نقوش واضح طور سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ الفاظ اور زبان و بیان پر غیر مانوسیت اور اجنبیت کا احساس ہونے لگا اور شعرا کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جسے ابنِ خلدون نے مستنجمہ (عربی کے عجمی شعرا) کے نام سے یاد کیا۔ ایسے شاعروں نے تیونس اور جزائر مراکش میں بہت شہرت حاصل کی۔ ان شعرا کے قصائد کو عربی ادب میں 'اصمعیات' کا نام دیا گیا۔ مصر وشام کے شعرا و ادبا اسے 'بدوی' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس عہد کے شعرا میں بوصیری اور صفی الدین حلّی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ بوصیری کے قصیدہ 'بردہ' نے بہت مقبولیت حاصل کی جس کی وجہ سے اسے عرب وعجم میں بہت شہرت حاصل ہوئی اور اس دور کا یہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے مدح سرائی، اخلاقی پستی اور عریانی وفحاشی سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔

دورِ جدید کے شعرا میں محمود پاشا بارودی، احمد شوقی بک اور حافظ ابراہیم نے قصیدے کو نئی تاب وتوانائی عطا کی جس سے قصیدوں میں صداقت، قلبی واردات اور سماجی زندگی کی خوب صورت تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ مگر دورِ جدید کے شعرا نے قصیدے پر بہت کم طبع آزمائی کی بلکہ انھوں نے عربی ادب کی جدید اصناف پر زیادہ توجہ صرف کی اور اس میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

عربوں کی کلاسیکی شاعری کا بیشتر حصہ قصائد پر مشتمل ہے۔ اگر عربی ادب سے قصائد کو نکال دیا جائے تو ان کی شاعری میں زبردست خلا پیدا ہوجائے گا۔ آج کل عرب میں بہت نئے طریقے کے قصیدے لکھے جارہے ہیں جو سادہ، سلیس، عام فہم اور زندگی کے حقائق سے لبریز ہیں۔ اس طرح عربی شاعری ایک بار پھر کلاسیکی شاعری کے اثرات سے دوچار ہوتی نظر آرہی ہے۔

■

**Dr. Abdullah Imteyaz**, Assist Prof. Dept of Urdu, Mumbai University - 400098 (MS)

صابر علی سیوانی

# ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی

ماہنامہ 'ساقی' کے مدیر شاہد احمد دہلوی ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور مولوی بشیر الدین احمد کے بیٹے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد قدیم دلی کالج کے ممتاز طالب علموں میں تھے۔ علمی و ادبی اعتبار سے وہ سرسید کے ساتھیوں میں ان کا اہم رتبہ تھا۔ اپنے لکچرز، مضامین اور خاص طور پر اپنے ناولوں کی وجہ سے اردو کی ادبی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ناقدین کی کثیر تعداد نے انھیں اردو کا اوّلین ناول نگار تسلیم کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے کئی اولادیں پیدا ہوئیں لیکن ان میں سے صرف تین ہی زندہ رہ سکیں۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا جو بشیر الدین احمد کے نام سے مشہور ہوا۔ بشیر الدین احمد نے ادبی اور اخلاقی کتابوں کے علاوہ تاریخ بیجانگر (دو جلدوں میں) اور 'واقعات دارالحکومت دہلی' تین ضخیم جلدوں میں تحریر کیں۔ ان تصانیف کا شمار بڑے علمی کارناموں میں ہوتا ہے۔ ایک مؤرخ کی حیثیت سے انھیں شناخت حاصل ہوئی لیکن وہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی تھے۔

بشیر الدین احمد کے نامور صاحبزادے شاہد احمد دہلوی کی پیدائش 22 مئی 1906 کو دلی میں ہوئی۔ بچپن میں ہی ان کی والدہ سید زمانی اور دادا نذیر احمد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ماں کی کمی کا احساس نہ ہو، اس کے لیے یورپین گورنس رکھی گئی جو انھیں انگریزی میں گفتگو کرنا سکھاتی تھی اور ان کے کھانے، پینے، لباس اور صحت و کھیل کود کا خیال رکھتی تھی۔ شاہد احمد دہلوی کے والد بشیر الدین احمد کا تبادلہ جب حیدرآباد سے رائچور ہوا تو وہاں ان کا داخلہ ایک کانونٹ اسکول میں کرا دیا گیا۔ جہاں زیادہ تر یورپین بچے ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ 1916 میں جب بشیر الدین دلی آئے تو ڈاکٹر ضیاء الدین کے مشورے پر انھیں علی گڑھ کے ایم اے او اسکول میں شریک کرایا گیا۔ لیکن علی گڑھ میں ان کا جی نہ لگا کیونکہ وہاں کا ماحول کانونٹ اسکول سے بالکل الگ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں انگریزی کے سوا دیگر مضامین میں ان کی کارکردگی بہتر نہیں رہی جس کے باعث کالج کے ایک طالب علم کو مقرر کیا گیا۔ بمشکل ایم اے او اسکول میں انھوں نے تین سال گزارے۔ جس وقت محمد علی جوہر نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور انگریزوں کے خلاف عدم تعاون تحریک شروع ہوئی تو شاہد احمد دہلوی کو علی گڑھ سے دہلی بلا لیا گیا اور یہاں ان کا داخلہ اینگلو عربک اسکول میں کرایا گیا۔ لیکن انھوں نے یہاں بھی تحصیل علم کے سلسلے میں کوئی خاص بہتر مظاہرہ نہیں کیا۔ یہاں انھوں نے چار سال تک تعلیم حاصل کی لیکن میٹرک میں فیل ہو گئے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

"دسویں جماعت میں کچھ تو پڑھا کم اور کچھ اس وجہ سے کہ امتحان سے تین ماہ پہلے ابا نے میری شادی کر دی۔ میٹرک فیل ہو گیا۔ اس سال ہمارے اسکول کا نتیجہ بہت برا رہا... ابا نے مجھے اور منجھلے بھائی کو عربک اسکول سے اٹھا کر مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔ اگلے سال 1923 میں، میں نے اچھے سکنڈ ڈویژن سے میٹرک پاس کر لیا۔"

(نقوش آپ بیتی نمبر، لاہور، جون 1964، ص 1118)

شاہد احمد دہلوی کے چچازاد بھائی ڈاکٹر اجمل حسین ان دنوں لاہور کے میڈیکل کالج میں ملازم تھے۔ انھیں کے مشورہ پر شاہد صاحب نے ایف، سی کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں ایف ایس سی (میڈیکل) میں ان کا داخلہ کرایا گیا لیکن شاہد احمد دہلوی کی آپ بیتی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ایف ایس سی پاس تو کر لیا لیکن میڈیکل کالج میں داخل ہونے کے بعد وہاں زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے:

"میں نے لاہور جا کر میڈیکل کالج میں داخلہ لے

لیا۔ ابا اور بیوی کی بیماری کی وجہ سے ویسے ہی طبیعت اچاٹ ہو رہی تھی کہ سڑے ہوئے مردوں پر کام کرنا پڑا۔ گوشت کھانا چھوٹ گیا۔ ہاتھوں میں سے دواؤں کی بو آتی رہتی تھی۔ کام سے اور اپنے آپ سے گھِن آنے لگی۔ انھوں نے (بشیرالدین) ہمیشہ ہمت دلائی مگر میں نے ابا کو لکھ دیا کہ آپ کی خواہش کی تکمیل میں میں نے ڈاکٹری پڑھنی شروع کی مگر یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ ابا کو اس کا افسوس ہوا مگر انھوں نے مجھ سے اصرار نہیں کیا۔ خط لکھوا دیا کہ نہیں پڑھ سکتے تو دلی چلے آؤ۔ میں نے کتابیں اور ہڈیوں کے ڈھانچے اونے پونے ہم جماعتوں کے ہاتھ بیچے اور گھر چلا آیا۔ ابا آدھے بھی نہیں رہے تھے۔ میں ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ابا نے پیار کیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ پوچھا ''اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا بی اے اور ایم اے کروں گا۔ بولے اچھا جیسی تمھاری مرضی۔''

(نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور، 1964، ص 1120)

شاہد صاحب نے دہلی آکر بی اے (آنرز) میں داخلہ لیا۔ لیکن اگست 1927 کو (شاہد صاحب کے لاہور سے دہلی آنے کے چند ماہ بعد) ان کے والد بشیرالدین احمد کا انتقال ہو گیا۔ شاہد صاحب کی تعلیم جاری رہی اور 1928 میں انھوں نے بی اے کی تعلیم مکمل کی اور بعد ازاں 1929 میں ایم اے (فارسی) میں داخلہ لیا۔ ان کے اساتذہ میں مولانا عبدالرحمن بجنوری بھی تھے جن کا مرزا غالب کے دیوان پر لکھا ہوا مقدمہ 'محاسنِ کلامِ غالب' کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ اخلاقِ جلالی کا درس شاہد صاحب نے انھیں سے حاصل کیا۔ اس طرح فارسی زبان وادب پر بھی شاہد احمد دہلوی کو زبردست عبور حاصل ہو گیا۔

شاہد احمد دہلوی ایک خوددار قسم کے انسان تھے۔ سادگی، متانت، بے نیازی، بے لوثی، اور خاکساری ان کی شخصیت کے اہم عناصر تھے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرنا، برے وقت میں لوگوں کے کام آنا، ادیبوں کی حتی المقدور مدد کرنا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ زندہ دلی، خوش طبعی، خوش گفتاری اور ملنساری ان کے خمیر میں شامل تھی۔ انھوں نے زندگی میں بہت سے نشیب وفراز دیکھے۔ غریب الوطنی میں مالی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنی خودداری سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ خوشامد کرنا انھیں قطعی پسند نہیں تھا جس کی وجہ سے انھیں بعض مواقع پر نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ شاہد صاحب کو صحافت سے بھی دلچسپی تھی لیکن اس سے زیادہ دلچسپی باپ دادا کے علمی کارناموں کی اشاعت

میں تھی۔ اس زمانے میں اردو صحافت کافی ترقی کر چکی تھی۔ ہندوستان کے متعدد شہروں سے متعدد رسائل شائع ہوا کرتے تھے لیکن دلّی سے ایسا کوئی رسالہ نہیں نکلتا تھا جو ادبی صحافت کے تقاضوں کو پورا کر سکے جس کا شاہد صاحب کو شدید احساس تھا۔ چنانچہ اس بات کا ذکر انھوں نے اپنی آپ بیتی میں کچھ اسی انداز سے کیا ہے:

میاں انصار ناصری (نبیرۂ میر ناصر علی) نے ایک دن کہا کہ لاہور سے اچھے اچھے رسالے نکل رہے ہیں۔ ہمایوں، نیرنگِ خیال، عالمگیر، اور ادبی دنیا، مگر دلی سے کوئی اچھا پرچہ نہیں نکلتا۔ یہ بات گھٹ میں اتر گئی اور اس پر آمادہ ہو گئے کہ رسالہ ہم نکالیں گے۔ فوراً جاننے اور نہ جاننے والوں کو خط لکھنے بیٹھ گئے کہ ہم ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ اس کے لیے مضمون بھیجو۔ نام بہت سوچے۔ میاں انصار ناصری نے کہا ''ساغر ہے، پیمانہ ہے، صہبا ہے مگر 'ساقی' نہیں ہے۔'' میں نے کہا تو بس 'ساقی' ہی نکالیں گے۔'' (نقوش آپ بیتی نمبر ص 1122)

اس طرح سے شاہد احمد دہلوی نے ماہنامہ 'ساقی' کا اجرا جنوری 1930 میں کیا جو نہایت طمطراق اور خوبصورت انداز میں منظر عام پر آیا۔ آج بھی شاہد احمد دہلوی کی شہرت کی اہم ترین وجہ ماہنامہ 'ساقی' کی مقبولیت ہے۔ مختصر سی مدت یعنی محض چار سال میں اس رسالے نے ادبی حلقوں میں اپنی منفرد جگہ بنالی۔ لیکن اس رسالے کو نکالنے میں مالی خسارہ بھی ہوا۔ لیکن اس رسالے کو پروان چڑھانے میں اپنوں کے بجائے بیگانوں نے شاہد صاحب کی خوب مدد کی اور قلمی تعاون سے اسے جاری رکھنے میں انھیں بہت سہارا دیا۔ اپنے اس پرچے کی مقبولیت اور ساقی کی وجہ سے مالی خسارے کے متعلق اپنے ہی خاکے میں شاہد احمد دہلوی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بغیر کسی تجربے یا مشورے کے جنوری 1930 میں ماہنامہ ساقی جاری کر دیا۔ کوئی چار پانچ سال کی الٹا پلٹی میں اس پرچے نے اپنی جگہ تو بنالی مگر میرے ماموں نے جو اس پرچے کا اہتمام کرتے تھے، مجھے بتایا کہ اس پرچے پر پچیس تیس ہزار روپیہ ضائع ہو چکا ہے اور اگر یہی روش رہی تو باقی روپیہ بھی یونہی نکل جائے گا۔ ادھر بھائیوں نے لعنت ملامت کی تو آنکھیں کھلیں۔ پرچے کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمعصر ادیبوں کی کتابیں چھاپنی شروع کیں۔ ڈوبتا ہوا کاروبار اتر گیا اور 1947 میں ساقی بک ڈپو کی مالی حیثیت دو لاکھ کی تھی اور پندرہ ہزار روپیہ ادیبوں اور شاعروں کی طرف پیشگی باقی تھا۔ محاسبۂ نفس بڑی مشکل چیز ہے اور میرے لیے خود ستائی اس سے بھی زیادہ مشکل۔''

(خاکہ، شاہد احمد دہلوی، مشمولہ ادبی شخصیتیں، شاہد احمد دہلوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی 1995، ص 263)

ساقی کی اشاعت سے قبل دلی سے متعدد ادبی رسائل شائع ہوتے تھے لیکن ان کا معیار بلند نہیں تھا۔ اسی معیار کی بلندی کو قائم رکھنے کے لیے شاہد احمد دہلوی نے اچھے لکھنے والوں سے معیاری ادبی مضامین لکھوا کر شائع کرنے لگے۔ ان کی خواہش تھی کہ رسالہ اس انداز سے شائع ہوتا کہ ہر شخص اس سے استفادہ کرے لیکن معیار کی بلندی قائم رہے۔ جس حوصلہ مندی اور استقلال کے ساتھ شاہد صاحب نے خالص ادبی رسالہ نکالا جو مالی اعتبار سے خسارے کا سودا ضرور تھا لیکن علمی وادبی لحاظ سے اس رسالے نے جو سنگ میل قائم کیا وہ تاریخ ادب اردو کا حصہ بن گیا۔ راشد الخیری کے حوالے سے صادق الخیری نے جو تبصرہ کیا ہے اور راشد الخیری کو 'مخزن' اور 'تمدن' نکالنے میں جو مشکلات پیش آئیں، اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''علامہ راشد الخیری کو 'مخزن' اور پھر 'تمدن' کی ادارت کے زمانے میں بلند پایہ ادب مہیا کرنے

ساقی کی اشاعت سے قبل دلی سے متعدد ادبی رسائل شائع ہوتے تھے لیکن ان کا معیار بلند نہیں تھا۔ اسی معیار کی بلندی کو قائم رکھنے کے لیے شاہد احمد دہلوی نے اچھے لکھنے والوں سے معیاری ادبی مضامین لکھوا کر شائع کرنے لگے۔ ان کی خواہش تھی کہ رسالہ اس انداز سے شائع ہوتا کہ ہر شخص اس سے استفادہ کرے لیکن معیار کی بلندی قائم رہے۔ جس حوصلہ مندی اور استقلال کے ساتھ شاہد صاحب نے خالص ادبی رسالہ نکالا جو مالی اعتبار سے خسارے کا سودا ضرور تھا لیکن علمی و ادبی لحاظ سے اس رسالے نے جو سنگ میل قائم کیا وہ تاریخ ادب اردو کا حصہ بن گیا۔

میں جو عرق ریزی کرنی پڑی اور صحافت کی اس دشوار گزار وادی کے جو تلخ تجربے ہوئے ان کی بنیاد پر وہ شاہد صاحب کے مداح تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ شاہد احمد نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ خالص ادبی رسالہ معاش کا ذریعہ نہیں بن سکتا 'ساقی' نکال بڑے حوصلے کا ثبوت دیا ہے۔'' (ساقی، کراچی نمبر،مضمون صادق الخیری،ص18-17)

شاہد احمد دہلوی کی طبیعت میں اختراعی صفت شامل تھی۔ انھوں نے اپنے قریبی دوستوں کے تعاون سے 'ساقی' کے لیے نہ صرف نئے نئے منصوبے بنائے اور اس کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی۔ تحقیقی مضامین کو اپنے رسالے میں جگہ دینے کی پہل کی۔ اپنے رسالے میں انھوں نے تازہ مطبوعات پر تنقید وتبصرے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ اہل علم وذوق نے ان کی اس پہل کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ یہ دور وہ تھا جس وقت شاہد صاحب جوان تھے۔ ان میں جوش وولولہ تھا۔ کسی بھی ادیب یا شاعر کے متعلق جو رائے قائم کر لیتے تھے اسے بلا جھجک اپنے رسالے میں لکھ کر ان کی خامیوں اور خوبیوں دونوں کو اجاگر کر دیا کرتے تھے۔ لیکن انسان کی فطرت میں عام طور پر یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی تعریف تو ضرور سننا چاہتا ہے لیکن وہ اپنی تنقید قطعی نہیں برداشت کرتا۔ چنانچہ شاہد صاحب کی اس صداقت بیانی اور عدم مصلحت پسندی کے باعث ادیبوں کی خاصی تعداد ان کی مخالف ہوگئی۔ جس کا اثر ان کے رسالے ساقی کی اشاعت پر بھی پڑا۔ اسی مخالفانہ روش کے متعلق اظہار کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی نے اپنے رسالہ 'ساقی' 1930 کے شمارے میں لکھا:

''ساقی کا خیر مقدم جس فراخ دلی سے کیا گیا ہے وہ ہمارے لیے نہایت حوصلہ افزا ہے۔ (اس سلسلے میں) جہاں مبارکباد کے سیکڑوں خطوط ملے ہیں، وہاں دو چار معترضین کے خطوط بھی آئے ہیں جس طرح انسان کے سو دوست اور سو دشمن ہوتے ہیں، اسی طرح ساقی کے موافقین اور مخالفین کی بھی ایک بڑی جماعت ہے۔'' ('ساقی' اپریل 1930، نگاہ اولین، شاہد احمد دہلوی)

ساقی کے ذریعے مدیر ساقی معیاری ادب اور وقت کے تقاضے سے متعلق پیش کرنا چاہتے تھے۔ رسالے میں انھی مضامین کو جگہ دی جاتی تھی جس میں کسی نہ کسی پہلو سے ادبی محاسن کا عنصر ضرور پایا جاتا ہو۔ دوسری زبانوں خصوصاً (انگریزی زبان کا ادب بھی اردو میں منتقل کرنے اور اسے اپنے رسالے میں شائع کرنے پر زور دیتے تھے۔ چونکہ وہ خود بھی انگریزی کے عالم تھے، اس لیے انھوں نے انگریزی ادب کے تراجم کو نہایت شوق کے ساتھ پیش کرتے تھے تاکہ قارئین ساقی کو انگریزی ادب سے بھی استفادے کا موقع مل سکے۔ اس دور میں جبکہ تمام اردو رسائل وجرائد روایتی نہج پر مضامین شائع کرتے تھے، شاہد صاحب کی یہ جدت پسندی اور ذہنی اُپج تھی کہ انھوں نے انگریزی ادب کے اردو تراجم اور رسائل وتازہ مطبوعات پر تنقیدی تبصرے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہی وہ خوبیاں تھیں جس کی وجہ سے 'ساقی' کو ادبی حلقوں میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج بھی جبکہ ساقی اور شاہد احمد دہلوی کو گزرے 46 سال کی مدت ہوگئی ہے لیکن لگاتار 37 برسوں تک ساقی کی اشاعت کو لوگ فراموش نہیں کر سکے ہیں۔ ان کی 1967 کو 61 سال کی عمر میں موت جو حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے کراچی میں ہوئی تھی، اس

وقت ہندوستان کے متعدد رسائل نے اظہار افسوس کیا تھا۔ ماہنامہ آجکل نے ان کے انتقال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا تھا:

''آخر شاہد احمد دہلوی بھی چل بسے۔ ادب کی خدمت کا ایک دور ختم ہوگیا۔ دلی کی تہذیب کا ایک پاسدار اٹھ گیا۔ ناصر نذیر فراق اور حسن نظامی کے بعد دلی کی ٹکسالی اور چٹخارہ دار زبان لکھنے والا ہم میں نہیں رہا۔''

(ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی، ستمبر 1967)

ساقی کے ذریعے شاہد احمد دہلوی نے بہت سے گمنام ادیبوں کو شہرت وناموری دلانے کا کام کیا۔ وہ ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے ایک سرپرست اور دوست کا کام بھی کرتے رہے۔ ان کی تخلیقات اپنے رسالے میں شائع کر کے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا۔ پروین الٰہی اپنی کتاب 'شاہد احمد دہلوی' میں لکھتی ہیں:

''شاہد صاحب ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی قبلہ گاہ تھے۔ انھوں نے ساقی اور ساقی بکڈپو کے ذریعے نہ جانے کتنے نئے اور پرانے لکھنے والوں کو گمنامی سے نکال کر شہرت کی بلندی پر پہنچایا۔ عصمت چغتائی نے 'ساقی' سے لکھنا شروع کیا تھا۔ کرشن چندر آج کرشن چندر نہ ہوتے اگر شاہد صاحب کا انھیں مالی تعاون اور سرپرستی حاصل نہ ہوتی۔ میر ناصر علی، میر ناصر نذیر فراق، علامہ راشد الخیری، صادق الخیری، سرفراز حسین، مولوی عنایت اللہ، مولوی احتشام الدین، اشرف صبوحی، فضل حق قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، سعادت حسن منٹو، میرا جی، راجہ مہدی علی خاں، قرۃ العین حیدر اور نہ جانے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے ساقی کی بدولت ادب میں مقام حاصل کیا اور یہ شاہد صاحب اور 'ساقی' کی وہ خدمت ہے جسے اردو ادب کی تاریخ نظر انداز نہیں کرسکتی۔''

(شاہد احمد دہلوی، پروین الٰہی، احاطہ کالے صاحب قاسم جان اسٹریٹ دہلی 1988، ص90)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ساقی میں لکھنے والے مشاہیر کا معیار کیسا ہوتا ہوگا کیونکہ جن مشاہیر نے ساقی کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا وہ اردو ادب کے آفتاب و ماہتاب تصور کیے جاتے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی کی شناخت ادبی دنیا میں ان کی خاکہ نگاری کی وجہ سے ہے۔ خاکہ نگاری میں انھوں نے اپنے معاصرین میں منفرد شناخت قائم کی۔ اپنے مخصوص لب ولہجے، طرزِ بیان اور دلی کی ٹکسالی زبان کی وجہ سے انھوں نے خاکہ نگاری کے میدان میں بڑی شہرت حاصل کی۔

ان کے خاکوں میں جابجا محاوروں کا استعمال، زبان کا چٹخارہ پن، واقعات کی خوبصورت ترتیب، اور خاکہ نگاری کی تمام صفات ان کی تحریروں میں نظر آتی ہیں ان کے خاکے صاحب خاکہ کی زندگی کی تمام جہتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں جس سے اس کی پوری اچھی بری دونوں شبیہ کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ وہ خاکہ نگاری کے وقت مصلحت کوشی سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ جس کا خاکہ لکھتے ہیں اس کے اوصاف کے ساتھ ساتھ اس کے نقائص، اور عیوب بھی گناتے چلے جاتے ہیں۔ خاکہ کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ خاکہ نگار جس شخصیت پر خاکہ تحریر کرے اس کی اچھائیوں، برائیوں، عظمتوں اور لغزشوں سے بخوبی واقف ہو۔ اس کے خلوت وجلوت میں گزارے گئے اوقات سے واقفیت رکھتا ہو۔ اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر اس کی نگاہ ہو (اور یہ تمام صفات شاہد احمد دہلوی کے لکھے گئے خاکوں میں نظر آتی ہیں۔ ان کے لکھے

گئے اہم خاکوں میں خواجہ حسن نظامی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، بے خود دہلوی، میر ناصر نذیر فراق، جوش ملیح آبادی اور جگر مرادآبادی پر لکھے گئے خاکے سرفہرست ہیں۔ ان کے خاکوں کے مجموعے 'چند ادبی شخصیتیں' میں 17 خاکے شامل ہیں، جس پر مقدمہ جمیل جالبی نے لکھا ہے جو خاکہ نگاری کی مختصر تاریخ اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری پر مشتمل ایک بھرپور مضمون ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''شاہد صاحب کے خاکوں کا ایک وصف، جو اردو میں خال خال نظر آتا ہے، یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان سمجھتے ہیں اسے فرشتہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس کی کمزوریوں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی اس کی خوبیوں کو۔ اسی لیے ان کے خاکوں میں ایک خاص قسم کی بے تکلفی پیدا ہوگئی ہے۔ بے تکلفی واقعات میں بھی ملتی ہے اور انداز بیان میں بھی۔ یہی وہ فنی خلوص ہے جوان کے خاکوں میں اثر و تاثر کا جادو جگا دیتا ہے۔ شاہد صاحب کے خاکوں کی اثر آفرینی، مقبولیت اور دلکشی کا ایک سبب ان کا اندازِ بیان اور طرزِ ادا ہے۔ ان کی نثر اس سایہ دار درخت کی سی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر تھکا ماندہ مسافر تھوڑی دیر آرام کرکے جس کے میٹھے پھلوں کا ذائقہ ایک طرف اس کی بھوک مٹا سکے اور دوسری طرف زبان کے چٹخاروں سے روحانی کیف حاصل کرسکے۔ ان کی نثر نہ صرف شگفتہ ہے بلکہ واقعات کے موتیوں کو بھی دل کے تار میں پروتی چلی جاتی ہے۔ ان کی عبارت میں نہ تو انگریزی الفاظ آتے ہیں اور نہ فارسی و عربی کے الفاظ شان و شوکت اور گھن گرج پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ محاوروں کا برمحل استعمال، روزمرہ کا صحیح تصرف اس طور پر ہوتا ہے کہ ہر لفظ زندہ اور جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے جو آپ سے بات کرتا ہے۔ آپ کو تھپکتا اور جھنجھوڑتا ہے اور الفاظ کے ذریعے خیال و احساس کی پوری تصویر پڑھنے والے کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔''

(مقدمہ، جمیل جالبی، کتاب چند ادبی شخصیتیں، شاہد احمد دہلوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی، 1995، ص 14-13)

زبان کا چٹخارہ، محاوروں کا برمحل استعمال، واقعات کی خوبصورت ترتیب، انداز بیان کی انفرادیت، ظرافت، شوخی اور دلی کی ٹکسالی زبان کا اندازہ لگانے کے لیے ان کے خاکوں کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے اور پھر ان کے خاکوں کی انفرادیت کو محسوس کیجیے۔ ان کے اہم خاکوں میں مولوی نذیر احمد دہلوی (شاہد احمد دہلوی کے دادا) کا بھی خاکہ ہے جو شاہد صاحب کی کتاب 'چند ادبی شخصیتیں' (خاکوں کا مجموعہ) میں شامل ہیں۔ شاہد صاحب نے اپنے دادا کی زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی ایمانداری اور دیانت داری سے ان کے خاکے میں پیش کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی تقریری صلاحیت اور چندہ جمع کرنے کے ان کے گر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے 'مولوی نذیر احمد دہلوی' کے خاکے میں شاہد دہلوی لکھتے ہیں:

''مولوی نذیر احمد صاحب علی گڑھ کے لیے چندہ اگانے کے سلسلے میں بہت کارآمد آدمی تھے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا سر سید انھیں اپنے دوروں میں ساتھ رکھتے اور ان سے تقریریں کراتے۔ نذیر احمد کی قوت تقریر کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انگلستان کا مشہور مقرر برک بھی ان سے زیادہ موثر تقریر نہیں کرسکتا تھا۔ اب بھی اگلے وقتوں کے لوگ جنھوں نے مولوی صاحب کے لکچر سنے ہیں کہتے ہیں کہ یا تو

**منٹو کے متعلق شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے اس خاکے میں منٹو کی پوری شخصیت کو نہایت بیباکی سے پیش کرکے شاہد صاحب نے خاکہ نگاری کا حق ادا کردیا ہے اور پھر دہلوی زبان کے چٹخارے کو بھی اس میں بہت اچھی طرح سمونے کی کوشش کی ہے۔ منٹو کی عادتیں، زبان دانی کا زعم اور مزاج کے خلاف کسی بھی چیز کو پسند نہ کرنے اور منہ پر صاف صاف بلکہ کھری کھری سنا دینے کی منٹو کی عادت کو بڑی خوبصورتی سے اس خاکے میں جگہ دی گئی ہے۔**

ہم نے ڈپٹی صاحب کو دیکھا یا اب اخیر میں بہادر یار جنگ مرحوم کو دیکھا کہ سامعین پر جادو سا کردیتے اور جو کام ان سے چاہتے لے لیتے۔ جب چاہا انھیں ہنسا دیا اور جب چاہا ان کی جیبیں خالی کرالیں اور عورتوں کے زیور تک اتروالیا کرتے تھے۔ مولوی نذیر احمد میں شوخی و ظرافت کا عنصر زیادہ تھا۔ پھبتی کسنے اور چوٹ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ خود مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ چندہ اگانے کے لیے سر سید نے ہمارا ایک طائفہ تیار کیا ہے۔ حالی روں روں روں روں روں سارنگی بجا رہے ہیں۔ شبلی مجیرے کھڑکھڑا رہے ہیں۔ ہم طبلہ بجا رہے ہیں اور سید صاحب ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہہ رہے ہیں ''لا چندہ! لا چندہ! غور سے دیکھیے یہ کس قدر مکمل تشبیہ ہے۔ کارکردگی کے اعتبار سے کس قدر مکمل۔''

(چند ادبی شخصیتیں، نئی دہلی 1995، ص 24-23)

ان جملوں میں زبان کی چاشنی، طنز، محاوروں کا استعمال اور دلی کی ٹکسالی زبان کی پوری جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ چندہ لگانا، روں روں سارنگی بجانا، مجیرے کھڑکھڑانا وغیرہ ایسی لفظیات ہیں جن کا تعلق دہلی کی خالص ٹکسالی زبان سے ہے جس میں طنز کے ساتھ ساتھ زبان کا روزمرہ اور اسلوب کی شگفتگی پوری طرح شاہد صاحب کے انداز بیان کی گواہی دے رہی ہے۔ انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کی خوبیوں خصوصاً ان کی تقریر کی لذت کا ذکر بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے طبلہ بجانے کی طرف اشارہ کرکے ان پر طنز بھی کیا ہے۔ اسی مضمون میں آگے چل کر ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت کے اس پہلو کو پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں زمانہ سازی (دنیاداری) بالکل نہیں آتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک غیور اور باضمیر انسان تھے۔ خوشامد پسندی ان کے خمیر میں شامل ہی نہیں تھی:

''مولوی نذیر احمد کو زمانہ سازی بالکل نہیں آتی تھی۔ سچی بات کہنے میں انھیں باک نہ ہوتا تھا۔ حیدرآباد دکن میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے مگر خوش کسی کو نہ کرسکے۔ اسی وجہ سے زیادہ عرصے تک وہاں نہ رہ سکے اور پنشن لے کر دلی چلے آئے۔ ان کے لیے 'غیور جنگ' کا خطاب تجویز ہوا تھا، مگر انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ (چند ادبی شخصیتیں، ص 18)

میر ناصر علی کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی نے ان کی شخصیت کے ظاہری خد و خال بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ لیکن جس انداز سے اپنی دہلوی ٹکسالی زبان کا استعمال کیا ہے اسے آپ بھی ملاحظہ کیجیے اور ان کی زبان پر قدرت اور خصوصاً طنز و ظرافت کی چاشنی سے لطف اندوزی کا سامان پیدا کیجیے:

''اللہ بخشے میر ناصر علی دلی کے ان وضع دار شرفا میں سے تھے جن پر دلی کو فخر تھا۔ عجب شان کے بزرگ تھے۔ 'بزرگ' میں نے انھیں اس لیے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا انھیں بزرگ ہی دیکھا۔ سوکھ کر چرخ ہوگئے تھے۔ خش خشی داڑھی، پہلے تل چاولی تھی، پھر سفید ہوگئی تھی۔ کتری ہوئی لبیں، پوپلا منہ، دہانہ پھیلا ہوا، بے قرار آنکھیں، ماتھا کھلا ہوا، بلکہ گدی تک ماتھا ہی ماتھا چلا گیا تھا۔ جوانی میں سروقد ہوں گے، بڑھاپے میں کمان کی طرح جھک گئے تھے۔ چلتے تھے تو پیچھے دونوں ہاتھ باندھ لیتے تھے۔ مستانہ وار جھوم کر چلتے تھے۔ مزاج شاہانہ، وضع قلندرانہ، ٹخنوں تک لمبا کرتا، گرمیوں میں موٹی ململ یا گاڑھے کا، اور جاڑوں میں فلالین یا وائلہ کا۔ اس میں چار جیبیں لگی ہوئی تھیں۔ جنھیں میر صاحب کہتے

تھے ''یہ میرے چار نوکر ہیں۔'' گلے میں پٹکا یا گلوبند، سر پر کبھی کپڑے پیچ گول ٹوپی اور کبھی صافہ، گھر میں روئی کا کنٹوپ بھی پہنتے تھے اور اس کے پاکھے الٹ کر کھڑے کر لیتے جب چغہ پہنتے تو عمامہ سر پر ہوتا۔ اک برا یا جامہ، ازار بند میں کنجیوں کا گچھا، پاؤں میں نری کی سلیم شاہی، کسی صاحب بہادر سے ملنے جاتے تو انگریزی جوتا پاؤں میں اڑا لیتے۔ آپ سمجھے بھی یہ میر ناصر علی کون ہیں؟ یہ وہی میر ناصر علی ہیں جو اپنی جوانی میں بوڑھے سرسید سے الجھتے سلجھتے رہتے تھے۔ جنھیں سرسید ازراہِ شفقت 'ناصحِ مشفق' لکھتے تھے۔'' (چند ادبی شخصیتیں صفحہ 30)

میر ناصر علی کے خاکے کے ابتدائی سطور سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خاکہ نگار کو زبان، محاوروں، ترکیبوں، تشبیہوں اور خصوصی دہلی کی ٹکسالی زبان کے استعمال پر کس قدر مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے جس انداز سے میر ناصر علی کے بڑھاپے اور ان کے جسمانی خدوخال کا خاکہ پیش کیا ہے، اس سے ان کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ یہی نہیں کہ انھوں نے صرف میر ناصر علی کی جسمانی ہیئت، ملبوسات اور چلنے کے انداز کو مخصوص بول چال کی لفظیات سے مرصع کر کے پیش کیا ہے بلکہ اپنے انداز بیان وشگفتہ تحریر سے طنز ومزاح بھی خوب پیدا کیا ہے۔ کچھ لفظیات اور ترکیبات لفظی کو اس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے کہ اگر ان تراکیب اور لفظوں کی جگہ خالص اردو یا فارسی آمیز اردو لفظوں کا استعمال کیا جاتا تو شاید وہ تاثر نہیں پیدا ہوتا جو روزمرہ اور محاوروں کے استعمال سے ہوا ہے۔ مثال کے طور پر کتری ہوئی لبیں، پوپلا منہ، چرخ ہوجانا، کپڑے کی پیچ، گول ٹوپی، پاکھے الٹ کر کھڑا کرنا، جوتا پاؤں میں اڑا لینا جیسی ترکیبیں اور الفاظ خالص دہلوی روزمرہ استعمال میں آنے والے ہیں جس سے شاہد صاحب نے میر ناصر علی کی جسمانی ساخت، ملبوسات، اور رنگ ڈھنگ کو نہایت خوبصورتی سے پیش کر کے خاکہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے لیکن دوسری جانب انھوں نے میر ناصر علی کی خودداری، اور ظرافت پسندی کو بھی پیش کیا ہے۔

''ایک دفعہ بہت کہنے سننے سے اپنے لڑکے کی سفارش کرنے ایک انگریز افسر کے پاس گئے۔ وہ میر صاحب کا بڑا پرانا قدردان تھا۔ میر صاحب سے مل کر بہت خوش ہوا اور بار بار کہتا رہا۔ ''بتاؤ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' اور میر صاحب یہی کہتے رہے کہ میں تو حضور کے سلام کو حاضر ہوا تھا۔'' غرض صحیح گئے اور سلامت آئے۔ گھر والوں نے جب شکوہ کیا تو بولے ''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے کسی کی سفارش نہیں ہوسکتی۔'' ایک دفعہ گھر والوں نے میر صاحب کو اس پر آمادہ کیا کہ آپ صرف اپنے لڑکے کو اپنے ساتھ لے جائیں، سعی سفارش کچھ نہ کریں۔ میر صاحب با دل ناخواستہ چلے تو گئے اور صاحب بہادر ان سے مل کر خوش بھی بہت ہوئے، مگر جب انھوں نے پوچھا ''یہ آپ کا لڑکا ہے؟'' تو میر صاحب کی رگِ ظرافت پھڑک گئی۔ بولے ''یہ تو اس کی ماں ہی بتا سکتی ہے۔'' بات قہقہوں میں اڑ گئی اور لڑکے کو بے نیل ومرام کے علاوہ پشیمان بھی لوٹنا پڑا۔'' (چند ادبی شخصیتیں، ص 37)

استاد بیخود دہلوی استاد شاعر تھے۔ دلی کے اردو بازار میں 'کتب خانہ و ادب' شاعروں اور ادیبوں کے لیے ایک خاص مرکز تھا جہاں شام کو تمام ادیب وشاعر بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ استاد بیخود دہلوی بھی انھی آنے والوں میں

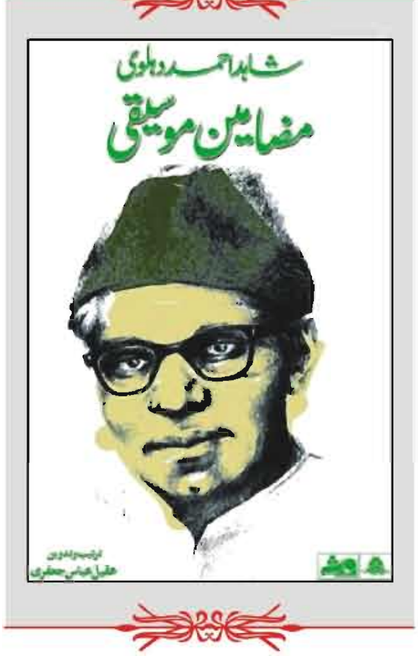


سے ایک تھے جو مغرب کے آس پاس ایڈورڈ پارک کی طرف سے جامع مسجد کے اردو بازار میں آتے تھے۔ انھیں کبوتر بازی کا بھی بہت شوق تھا۔ بیخود دہلوی کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''استاد (بیخود دہلوی) کو کبوتر اڑانے کا بہت شوق تھا۔ جال اور کابکیں اوپر چھت پر رہتی تھیں۔ چھتری چھپکا سب کچھ موجود تھا۔ اپنی ٹکڑی اڑاتے اور دوسرے کبوتر بازوں کی ٹکڑیوں سے لڑاتے۔ اس شغل میں اگر کوئی ملنے والا آکر حارج ہوتا تو مزاج برہم ہوجاتا۔ وہیں سے گالیاں بڑبڑاتے اترتے اور بڑے استکراہ سے ملاقات فرماتے۔ ایک مہربان اپنے صاحبزادے کو لے کر عین اس وقت پہنچے جب استاد کی جان کبوتروں میں لڑی ہوئی تھی۔ بہت مکدر ہوئے۔ برا بھلا کہتے نیچے آئے۔ مہربان نے مٹھائی کی ٹوکری پیش کی اور بولے یہ میرا لڑکا ہے، شعر کہتا ہے، اسے شاگردی میں قبول فرما لیجیے۔'' ٹوکری تو استاد کا پوتا لے کر فوراً اندر چلا گیا اور استاد نے فرمایا ''اپنے کچھ شعر سناؤ۔'' وہ شامت کا مارا نہ جانے کس سے لکھواتا تھا۔ لگانا موزوں شعر سنانے۔ بیخود صاحب ایک دم سے بکھر گئے۔ ''نکل میرے گھر سے باہر نکل۔'' اور گالیوں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ کھڑے کھڑے اسے اور مہربان کو گھر سے نکالا اور کنڈی لگا اوپر جا کر پھر کبوتر اڑانے لگے۔'' (خاکہ 'استاد بیخود دہلوی' چند ادبی شخصیتیں، ص 62-61)

سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔ لیکن منٹو کی شخصیت، عادات و اطوار اور مزاج سے کم ہی لوگ واقف ہوں گے۔ منٹو اپنے آگے کسی کو گردانتے نہیں تھے اور خاص طور پر زبان کے معاملے میں تو منٹو کو اس قدر زعم تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ منٹو چونکہ منہ پھٹ قسم کے انسان تھے، اس لیے ان کی بہتوں سے مزاجی ہم آہنگی نہیں ہو پاتی تھی۔ شاہد احمد دہلوی نے منٹو پر بھی ایک خاکہ لکھا جو ان کی کتاب چند ادبی شخصیتیں میں شامل ہے۔ شاہد صاحب نے اپنے ذاتی روابط اور منٹو کے ساتھ گزارے گئے اوقات کا اس خاکے میں بہت موثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ شاہد دہلوی لکھتے ہیں:

''منٹو کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ انھیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا لکھنے والا ہوں۔ اس لیے وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ ذرا کسی نے دون کی لی اور منٹو نے اڑنگا لگایا۔ خرابی صحت کی وجہ سے منٹو کی طبیعت کچھ چڑچڑی ہوگئی تھی۔ مزاج میں سہار بالکل نہیں رہی تھی۔ بات بات پر اڑنے اور لڑنے لگتے تھے۔ جو لوگ ان کے مزاج کو سمجھ گئے تھے وہ ان سے بات کرنے میں احتیاط برتا کرتے تھے۔'' (چند ادبی شخصیتیں ص 147) منٹو کو تصنع سے سخت نفرت تھی۔ وہ جو دل میں رکھتے تھے ظاہری طور پر بھی ویسا ہی پیش کرتے تھے۔ اس حوالے سے شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''دراصل منٹو کو بناوٹ سے چڑھ تھی۔ خود منٹو کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اس لیے لگی لپٹی نہ رکھتا تھا جو کچھ کہنا ہوتا صاف کہہ دیتا بلکہ منٹو بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ تھا۔ ایک دفعہ احمد شاہ بخاری نے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا ''دیکھو منٹو، میں تمھیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔'' منٹو نے جھلا کر کہا مگر میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا۔'' (ص 149) سعادت حسن منٹو کی زبان دانی کے حوالے سے منٹو کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''منٹو کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا اور واقع میں منٹو بہت صحیح اور عمدہ زبان لکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے کسی افسانے میں ایک عورت کا حلیہ لکھنے کے سلسلے میں یہ بھی لکھا تھا کہ بچہ ہونے کے بعد اس کے پیٹ پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ میں نے شکنیں بدل کر 'چرسیں' کر دیا۔ جب افسانہ 'ساقی' میں چھپ کر آیا تو منٹو

اس لفظ پر اچھل پڑے۔ بولے ''میں نے جس وقت شکنیں لکھا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ لفظ ٹھیک نہیں ہے، مگر میری سمجھ میں اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اصل لفظ یہی ہے۔ جو میں لکھنا چاہتا تھا۔'' اس کے بعد کھلے دل سے انھوں نے سب کے سامنے کہا کہ ''میں صرف دو ایڈیٹروں کی اصلاح قبول کرتا ہوں، ایک آپ اور دوسرے حامد علی خاں۔ آپ دونوں کے علاوہ کسی اور کو میرا ایک لفظ بھی بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔'' (ص 159)

منٹو کے متعلق شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے اس خاکے میں منٹو کی پوری شخصیت کو نہایت بیباکی سے پیش کر کے شاہد صاحب نے خاکہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے اور پھر دہلوی زبان کے چٹخارے کو بھی اس میں بہت اچھی طرح سمونے کی کوشش کی ہے۔ منٹو کی عادتیں، زباں دانی کا زعم اور مزاج کے خلاف کسی بھی چیز کو پسند نہ کرنے اور منہ پر صاف صاف بلکہ کھری کھری سنا دینے کی منٹو کی عادت کو بڑی خوبصورتی سے اس خاکے میں جگہ دی گئی ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے جگر مرادآبادی پر خاکہ لکھا تھا وہ بھی کافی مقبول ہوا۔ اس میں جگر کی زندگی کے جن پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے اور جس انداز سے ان کا خاکہ کھینچا گیا ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے ملاحظہ کیجیے اور شاہد احمد دہلوی کی دہلی کی ٹکسالی زبان پر مہارت کا اندازہ لگایئے:

''بعض چہرے بڑے دھوکہ باز ہوتے ہیں۔ کالا گھٹا ہوا رنگ، اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر الجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ، چہرہ کے رقبے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور منہ کسی قدر بڑا، کثرتِ پان خوری کے باعث منہ اگالدان، دانت شریفے کے بیج اور لب کلیجی کی دو بوٹیاں، بھرواں کالی داڑھی، ایڈورڈ فیشن کی، سر پر ترکی ٹوپی، بر میں اچکن، آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں، پاؤں میں پینٹ کی گرگابی، بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قد وقامت کا اٹاچی کیس، کوئی بتیس سال اُدھر کا ذکر ہے۔ جھانسی میں ایک صاحب سر جھکائے قدم بڑھائے اپنی دھن میں جھومتے چلے جا رہے تھے۔ میرے میزبان نے اشارے سے بتایا۔ ''یہ ہیں جگر صاحب''۔ میں نے سنی ان سنی کر دی۔ ہوں گے کوئی، میں نے کبھی ان کا نام نہیں سنا تھا۔ میرے میزبان نے کہا ''آج رات مشاعرہ ہے۔ آپ کو لے چلیں گے۔'' قہر درویش برجان درویش، میزبان کی خواہش کا احترام ضروری تھا۔ طوعاً وکرہاً رات کو مشاعرے میں چلنے کی حامی بھر لی۔ پنڈال کشادہ بنایا گیا تھا اور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اگلی صفوں میں ہمیں جگہ دی گئی۔ شعرا کی آمد آمد ہوئی۔ پہلے چھٹ بھیّوں نے لہک لہک کر اپنا کلام سنایا۔ پھر بیچ کی راس کے شاعروں نے، ان کے بعد جغادریوں نے اتنے میں شور برپا ہوا ''آ گئے جگر صاحب آ گئے۔'' انھیں ڈائس پر پہنچایا گیا اور وہ سلام کر کے جناب صدر کے پہلو میں جا بیٹھے۔ پڑھنے والوں کے چہرے اتر گئے اب جو پڑھنے آتا، گھبرا کر بولا یا آتا اور گھاس سی کاٹ کر چل دیتا۔ جب سب پڑھ چکے تو جناب صدر نے جگر صاحب سے درخواست کی اور سارا پنڈال تالیوں سے گونج گیا۔ جگر صاحب نے خندۂ دنداں نما کرتے آگے بڑھ آئے۔ جگر صاحب نے گنگنا کر سر قائم کیا اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سنانی شروع کی۔ مطلع سے مقطع تک غزل کا انداز ہی نیا تھا۔ اس پر خوش گلوئی! پنڈال اڑا کر رکھ دیا۔ کئی کئی دفعہ ایک شعر کو پڑھوایا گیا۔ میں نے جگر سے پہلے

منٹو کے متعلق شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے اس خاکے میں منٹو کی پوری شخصیت کو نہایت بیباکی سے پیش کرکے شاہد صاحب نے خاکہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے اور پھر دہلوی زبان کے چٹخارے کو بھی اس میں بہت اچھی طرح سمونے کی کوشش کی ہے۔ منٹو کی عادتیں، زبان دانی کا زعم اور مزاج کے خلاف کسی بھی چیز کو پسند نہ کرنے اور منہ پر صاف صاف بلکہ کھری کھری سنا دینے کی منٹو کی عادت کو بڑی خوبصورتی سے اس خاکے میں جگہ دی گئی ہے۔

اتنا سریلا شاعر اور کوئی نہیں سنایا، پھر گانے والے شاعر سنے تھے جو باقاعدہ تان پلٹے کرتے تھے مثلاً حفیظ، ساغر، روش صدیقی وغیرہ۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ جگر صاحب کا پڑھنا ترنم ہی رہتا تھا، گانا نہیں بنتا تھا۔ جگر صاحب کو اس مشاعرے میں سن کر میں بھی ان کے مداحوں میں شامل ہو گیا:

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

(چند ادبی شخصیتیں، ص 157-156)

جگر صاحب کے خاکے میں جو الفاظ متوجہ کرتے ہیں اور جو اپنی مخصوص معنویت کا احساس دلاتے ہیں، اگر ان کی جگہ دوسرے ہم معنی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہوتا تو وہ بات پیدا نہیں ہو پاتی مثال کے طور پر جگر صاحب کا جسمانی ہیولیٰ پیش کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی نے جو الفاظ منتخب کیے ہیں، ان کی معنویت کا اندازہ لگانے کے لیے ان الفاظ کی تکرار کی جا رہی ہے۔ کالا گھٹا ہوا رنگ، کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، کثرت پان خوری کے باعث منہ اگالدان، دانت شریفے کے بیج اور لب کلیجی کی دو بوٹیاں، بھرواں کالی داڑھی، ایڈورڈ فیشن کی، بر میں اچکن، آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ تشبیہات میں جو ندرت شاہد صاحب کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتی ہے، اس کی مثال بمشکل ہی مل پائے گی۔ مثلاً کوڑیوں کی چمک کو آنکھ سے تشبیہ دینا، منہ کو اگالدان، دانت کو شریفے کے بیج سے تشبیہ دینا اور لب کو کلیجی کی دو بوٹیاں بتانا کس قدر ندرت اور جدت ان الفاظ میں پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ایک طرح سے ان الفاظ کے استعمال کے ذریعے انھوں نے طنز و مزاح کی کیفیت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو شاہد احمد دہلوی کو ایک بڑا خاکہ نگار بناتی ہیں اور اسلوب بیان کی انفرادیت بھی خاکہ نگاروں کی صف میں انھیں بالکل مخصوص مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شاہد صاحب کی شناخت صحافی، ادیب، ترجمہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس، ماہر نفسیات، تذکرہ نگار کے علاوہ ایک بہترین خاکہ نگار کی حیثیت سے دنیائے ادب میں پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں انھیں موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ بلکہ انھوں نے موسیقی پر بھی مہارت حاصل کر لی۔ ریڈیو پر گانے بجانے کا سلسلہ انھوں نے 1936 سے شروع کیا۔ حالانکہ ان کے پروگرامس آکاش وانی دلّی سے شاہد احمد کے نام کی بجائے ایس۔ احمد کے نام سے نشر ہوا کرتے تھے جس کا اعتراف انھوں نے اپنے ہی خاکے مشمولہ 'چند ادبی شخصیتیں' میں کیا ہے۔ انھوں نے موسیقی کی تعلیم استاد چاند خان سے حاصل کی تھی۔ پروین الٰہی نے موسیقی سے ان کی دلچسپی اور چاند خان سے موسیقی کا علم حاصل کرنے کے متعلق لکھا ہے۔

رسالہ 'ساقی' کی مشغولیت اور تعلیمی مصروفیت کے باوصف روزانہ شام کو تقریباً دو گھنٹہ وہ موسیقی کا ریاض کرتے تھے۔ چاند خان اپنے گھر کے علاوہ اکثر شاہد صاحب کے مکان پر بھی انھیں درس دینے جایا کرتے تھے۔ ان کی ڈائری میں یہ بات کئی جگہ مذکور ہے۔''

(شاہد احمد دہلوی، پروین الٰہی، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی 1988، ص 63)

استاد بندو علی خاں پر انھوں نے جو خاکہ تحریر کیا ہے اس سے موسیقی میں ان کی دلچسپی اور موسیقی کی باریکیوں کی معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نگارشات پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی اس جانب توجہ کی ضرورت ہے۔

■

**Dr. Sabir Ali Seewani.**, H.No- 9-4-87/C/7, 1st Floor, Behind Moghal Residency Owaisi Colony, Tolichowki, Hyderabad - 500008 (A.P)

سید طلحہ نقشبندی القادری

# آکولہ کے قدیم اخبارات و رسائل پر ایک نظر

مہاراشٹر کا مراٹھی نژاد علاقہ برار، جو کبھی عماد شاہوں کا مسکن اور نوابان دکن کا مرجع رہا ہے، اردو کو اس علاقے میں مقبول اور عام زبان بنا دیا۔ جو شہروں سے گزر کر قصبات اور دیہات تک میں باوجود سرکاری و کاروباری زبان نہ ہونے کے مراٹھی کی طرح عام بول چال کی زبان ہے۔ یہاں کا اردو روزمرہ دوسرے ہر صوبے کے 'روزمرہ' کے مقابلے میں صحت زبان سے زیادہ قریب ہے۔ مغربی مستشرقین و ماہرین صوتیات کی رائے ہے کہ دولت آباد (دیوگری) اور چاندہ (چندر پورہ) کے درمیانی علاقے میں رہنے والے (جن میں برار واقع ہے) ہر زبان کو اس کی صوتی صحت کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہیں۔ برار کو اس پر فخر و مسرت حاصل ہے کہ عام پسماندگی بڑے بڑے علمی و ثقافتی مراکز سے دوری وسائل کی کمی علمی و ادبی ماحول کے فقدان طباعت و اشاعت کی مشکلات کے باوجود اس علاقے نے اردو زبان و ادب کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔

یہ آکولہ شہر ہے جو ممبئی، کلکتہ، نیشنل ہاوے و کلکتہ ممبئی ریلوے روٹ پر واقع ہے جو علاقے برار کا ایک اہم تاریخی تمدنی، صنعتی، تجارتی، اسلامی تہذیب و اخلاقی اقتدار جو معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے علمی و ادبی، مذہبی جلسے کانفرنسوں و سیمیناروں کے کارناموں کے لیے ہمیشہ معروف رہا ہے اور قدیم زمانے میں اردو زبان و ادب کا ایک اہم مرکز رہ چکا ہے۔ عالمی اردو ادب کا رشتہ ہمیشہ آکولہ شہر سے جڑا رہا۔ برار میں انیسویں صدی کے ہشتم دہے میں اردو صحافت کا آغاز ہوا اور سب سے پہلا اردو اخبار 1875 میں آکولہ شہر ہی سے جاری و ساری ہوا اس طرح علاقہ برار میں آکولہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اردو کا پہلا اخبار یہیں سے جاری ہوا۔ کتابت و طباعت کی دقتوں کی وجہ سے اکثر اخبار سہ ماہی و ماہوار رسائل بیرون برار طبع ہوتے اور ہر صحیفہ نگار کے لیے اجرائے جریدہ سے قبل کتابت و طباعت کے ساتھ ذاتی پریس کا انتظام نہایت ضروری تھا۔ یہ ایی وجہ اردو کتب و اخبارات کی طلب کے باوجود حسب ضرورت کتابوں کی اشاعت اور کوئی اچھا اخبار و رسالہ مستقل طور پر جاری نہ رہ سکا اور نہ یہاں کے شعرا ادبا و مورخین کی بھی وہ شہرت و حوصلہ افزائی نہ ہو پائی جو دوسرے مقامات کے ادبا و شعرا وغیرہ کو حاصل ہیں۔ ان مشکلات کے باوجود اکثر اخبارات نے طویل زندگی پائی اور ملک و ملت کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی بھی بیش بہا خدمت انجام دیتے رہے۔ آکولہ شہر سے جو قدیم اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہم یہاں ان کا مختصراً تعارف پیش کر رہے ہیں۔

(1) **اردو اخبار**: آج سے تقریباً ایک سو پینتیس سال قبل جنوری 1876 میں آکولہ سے جناب مرزا کریم بیگ صاحب مرحوم نے 'اردو اخبار' کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا۔ ابتدا میں ایک سال تک کتابی تختی پر شائع ہوتا رہا بعدہ 4/26x20 کے اخباری سائز کے آٹھ صفحات پر علاقائی اور دوسری اہم خبروں نیز حکومت آصفیہ کے فارسی اعلانات و احکامات کے علاوہ کبھی کبھار نظمیں، غزلیں بھی شائع ہوتیں۔ اس پرچے سے قبل کسی اور اردو اخبار کی علاقہ برار سے اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔ بلاشبہ یہ برار کا پہلا اردو اخبار ہے۔

(2) **موعظ حسنہ**: 1910 میں آکولہ سے ایک مذہبی رسالہ جاری ہوا جو آگرہ میں طبع ہوتا تھا لیکن چند ماہ سے زیادہ نہ چل سکا۔

(3) **البرہان**: جنوری 1910 میں جناب سید زوار حسین عالی سبزواری مرحوم نے برہانپور میں مطبع 'خورشید احمدی پریس' قائم کر کے ایک ہفتہ وار 4/22x18 کے چھ صفحات پر 'البرہان' برہانپور کی مناسبت سے نام رکھ کر جاری کیا۔ جو اواخر 1924 میں سید مبین الرحمن مرحوم (علیگ) وایم ایل سی جن کو مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے 'کامریڈ' کی ایڈیٹری کے لیے منتخب فرمایا تھا کی توجہ و کاوش سے آپ ہی کی سرپرستی و نگرانی میں مع پریس منتقل ہوا۔ جناب مبین الرحمن مرحوم کے بعد ایک صاحب علم و ذوق بزرگ ہستی نواب عبدالوحید خان صاحب، غازی مرحوم رئیس گیوور دھانے اس کی سرپرستی قبول فرمائی اور یہ اخبار عالی مرحوم کی رحلت 1949 تک مومن پورہ آکولہ سے ستائیس سال پابندی سے اردو زبان و ادب اور ملک و ملت کی خدمت انجام دیتا رہا۔

'**البرہان**' کا 'میلاد نمبر' خاص نمبر' سالنامے' دورہ نمبر وغیرہ، بہت مشہور ہوئے تھے۔ اس وقت اس کا 'میلاد نمبر' پیش نظر ہے۔ یہ میلاد نمبر مورخہ 18 اگست 1969 کو شائع تھا۔ اس نمبر میں سرور عالمؐ پر حافظ مختار احمد حسین تلمیذ حضرت امیر مینائی علیہ الرحمۃ کی نعتیں بہترین انداز میں چھاپی گئی ہیں۔ اور حضور پاک حضرت محمدؐ کے اخلاق حسنہ و کردار و اخلاق پر جناب مولانا انور حسین صاحب سالک کے بہترین مضامین شائع ہوئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سید مبین الرحمن مرحوم نے محمد حنیف صاحب بنیان ماسٹر شیخ احمد صاحب آکولوی وغیرہ فکر انگیز جامع مضامین اور قصیدہ نعتیہ در شان حضرت پیغمبر علیہ السلام حضرت مفتی منتجب الدین جنتی نقشبندی القادری بالاپور کا کلام جو صفحہ نمبر 15 پر شائع ہوا ہم قارئین کے لیے یہاں پیش کر رہے ہیں:

بہشت و دوزخ و ری ہدی دین شکیب و عدل و خیار آٹھوں
دیا ہے سب اے رسول یٰسین یہ سب تمھیں کردگار آٹھوں
جمال و صورت کمال و سیرت قد و خرام ادا نزاکت
یہ خوبیان سب بذات نزہت ہیں تیرے اے کامگار آٹھوں
ملائک و انس و جن و ولدان پری و دیوان و حور و علمان
یہ سب ترے حسن کے ہیں شیدا ہیں سب ترے دلفگار آٹھوں
ابا بکر اور عمر و عثمان علی و عباس حمزہ و حسنیان
ہیں میرے شاہان ہیں تیرے خویشاں و رہبر دیندار آٹھوں
سکندر و سروز ارد قیصر پشنگ و خاماں و کید و نودر

وہ اے شہنشاہ خوب منظر ہیں تیرے خدمت گزار آٹھوں
عد و مخالف کفور و حاسد شریر و شیطان نکیر و فاسد
تیرے سے کھاتے ہیں پیچ کاسد دلوں میں مانند مار آٹھوں
نہ عشق احمد ہو دل سے زائل یہ جنتی ہو اگرچہ عاصی
غریب و مفتوں فقیر وسائل ذلیل و مجنوں نزار آٹھوں

اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ایک ہی تنہا شخص اس کا مالک 'ایڈیٹر' کاتب، طابع و ناشر تھا اور اس کی فائلوں میں علاقہ برار کی ربع صدی سے زائد عرصے کی ادبی 'لسانی تعلیمی، سیاسی جدوجہد کی تاریخ پنہاں ہے۔

(4) **'ہم لوگ'** 1955 میں عبدالصمد جاوید صاحب نے آکولہ سے 17x27/4 پر 'ہم لوگ' جاری کیا اور اواخر 1960 کے بعد یہ اخبار جاری نہ رہ سکا۔ مورخہ 30 دسمبر 1985 کا 'ہم لوگ' ہمارے سامنے ہے۔ اس شمارے کا اداریہ 'لیڈروں کی پہچان' بے باک انداز میں لکھا گیا ہے اور قوم فروش لیڈروں پر ایک خاص قسم کی چوٹ تحریر ہے اور اس شمارے کی خاص بات ہے کہ یہ شمارہ قیصر بدنیروی کی شعری خدمات کا اعتراف اور قیصر بدنیروی صاحب مرحوم کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب 'طوفان وساحل' کے منظر عام پر آنے کے متعلق ہے۔

'طوفان وساحل' مجموعہ کلام پر پروفیسر خلیل شارق نیازی 'مردان علی خان، نشاط ایڈوکیٹ، مرحوم جناب بشیر احمد صاحب شہید اور جناب جہانگیر خان صاحب جوہر پاتوری کے مضامین وتبصرے شائع ہوتے ہیں۔ اور ٹھیٹ براری مگر مچھ بالاپوری طنزیات کے علاوہ رشید کیفی کے تاریخی قطعات اس میں شامل ہیں۔ ہم یہاں رشید کیفی کے تاریخی قطعات پیش کر رہے ہیں:

چھپ کے طوفان و ساحل آئی ہے
دل نشین جس کی دل ربائی ہے
کیا کہیں لطف بادہ افکار
دل ہے اس درجہ بے خود و سرشار
فکر جب سالِ عیسوی کی ہوئی
شوخیِ طبع نے کہا کیفی
وا ہوں اس طرح اب لب گفتار
کہہ دو 'گفتار قیصر ے خوار'
(1985)

(5) **منزل:** یوم آزادی 15 اگست 1960 کو یہ ہفت روزہ محترم قاضی محمد علی ایڈوکیٹ مرحوم اور جناب محمد ابراہیم صاحب 'بسمل ایڈوکیٹ' کے تعاون سے سائز 17x27/4 پر جاری کیا۔ 'منزل' جلد 1 مورخہ 22 اگست 1960 بروز پیر کا شمارہ زیر نظر ہے۔ جمعیۃ علما مہاراشٹر کے انتخاب پر قاضی محمد علی صاحب ایڈوکیٹ مرحوم کی بے ٹوک رائے اس شمارے کی جان ہے اور مہاراشٹر مسلم تعلیمی کانفرنس پر ایک اچھا اداریہ پیش کیا گیا ہے اور خطوط میں حضرت مولانا ہادی نقشبندی علیہ الرحمۃ، محمد نجیب الدین، محمد اسماعیل رضا نیازی کی آرا شامل ہیں۔

(6) **لیڈر** 12 جنوری 1957 کو محمد عطا افغانی صاحب مالک 'تاج آفسیٹ آکولہ نے ہفتہ وار 'لیڈر' جاری کیا جو 17x27/4 کی سائز اپنی صوری و معنوی حیثیت سے عطا افغانی صاحب مرحوم کی صلاحیتوں کا کامیاب مظہر تھا۔ لیکن چند اشاعتوں کے بعد یہ ہفتہ وار بند ہوگیا۔

(7) **جمعیت** قاضی سید غیاث الدین مرحوم کی سرپرستی اور برج لال بیانی کی مالی امداد سے 20 اکتوبر 1955 کو 'جمعیت' ہفتہ وار کا پہلا شمارہ جناب مردان علی خان صاحب نشاط ایڈوکیٹ مرحوم کی ادارت میں 17x27/4 کے چھ صفحات پر محمد عطا اللہ خان افغانی پرنٹر و پبلشر نے وکاس لیتھو میں دفتر 'جمعیت' ہاشم سیٹھ لائبریری آکولہ سے شائع کیا جملہ 35 شماروں کی اشاعت کے بعد یہ ہفت روزہ بند ہوگیا۔

اس کا مورخہ 19 جولائی 1956 شمارے دیکھیے تو اس میں عیدالاضحیٰ کے ذکر کے علاوہ، طالب آکولوی، شاہد انصاری، اختر جمیل نظمی جبلپوری، ساحر دہلی، ماہر آکولوی، ساحر ناگپوری، مظفر بالاپوری اور منظر طالبی آکولوی اور ڈاکٹر امام خان صاحب ایڈیٹر امن کی غزلیات شامل ہیں۔

(8) **امن** 1952 میں آکولہ سے ہفتہ وار 'امن' ڈاکٹر امام خان صابر نے 'نیشنل لیتھو پریس سے چھپوا کر لال بنگلہ آکولہ سے چارورقی سائز 17x27/4 شائع کیا۔ 'امن' شمارہ نمبر 22 جلد 10، 17 مارچ 1960 زیر نظر ہے۔ اس میں علاقہ برار کی مختلف سیاسی وثقافتی خبروں کے ساتھ۔ ''انجمن ترقی اردو برار'' کے سرپرست و سجادہ نشین دہم خانقاہ نقشبندیہ بالاپور، مولوی سید شاہ امام الاسلام نقشبندی بہشتی کی رحلت پر تعزیتی پیغامات شائع ہوئے اور خاص طور سے ڈاکٹر امام خان صاحب ایڈیٹر 'امن' کا لکھا ہوا تعزیت نامہ 'موت العالم موت العالم' ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

(9) **عفت** 1930 میں محترمہ قدیر النسا بیگم صاحبہ مرحومہ اہلیہ جناب قاضی سید کریم الدین صاحب ایڈوکیٹ (ایوت محل) نے آکولہ سے خواتین کے لیے ماہوار علمی ادبی، امور خانہ اصلاح نسواں ومعلوماتی مضامین سے مزین خوبصورت رنگین گیٹ اپ میں شائع کیا۔ تقریباً چار پانچ شماروں کے بعد یہ ماہ نامہ بند ہوگیا۔ ماہ ستمبر 1930 کے شمارے میں جناب محمد وزیر صاحب 'آغا' طوطی برار کا کلام بعنوان 'خیر مقدم رسالہ عفت' کے کچھ اشعار ہم پیش کر رہے ہیں:

چمکے جہاں میں ماہ چرخ عروج بن کر
ہو آسمان رفعت شان وقار 'عفت'
قوت تیرے علم کو اللہ اور بخشے
اے صاحب ادارت نگراں کار 'عفت'
ہو کامیاب مقصد ہر نبیؐ خدایا
مردہ تنوں کو کردے زندہ شعار 'عفت'
تحسین وآفرین ہے بہنوں کے حوصلے پر
یعنی کہ جس قدر ہیں مضمون نگار 'عفت'
کیونکر نہ ہو گل تر رنگینی مضامین
ہے سبز پوش عفت رنگ بہار 'عفت'
عبرت کی جائے آغا گر ہو نہ تم معاون
ہر طرح کا ہے دوش نسواں پہ بار 'عفت'

(10) **'محشر'** جناب محمد ابراہیم شرار صاحب محتاج تعارف نہیں۔ ایک عام جانی پہچانی شخصیت تھی۔ 1952 سے 18x22/8 کے چوبیس 24 صفحات پر مشتمل آگرہ اخبار پریس آگرہ میں طبع ہوکر ان کا یہ مذہبی رسالہ اولاً ایلچپور (اچلپور) سے بعدہ مسجد چاند خان آکولہ سے 'محشر پریس' کے قیام کے ساتھ 1959 تک شائع ہوتا رہا۔ اور تقریباً آٹھ سالہ خدمات کے بعد بند ہوگیا۔ شمارہ نمبر 11 جلد 5 ماہ نومبر 1956 کا شمارہ اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ محمد ابراہیم شرار صاحب کا ''پھر تم کدھر چلے ہو!'' تشریح سورۂ تکویر خاص اہمیت کا حامل ہے۔ شرار صاحب مرحوم نے مدلل تشریح فرمائی ہے۔ چونکہ آپ محراب ومنبر پر بہترین انداز میں وعظ وتلقین فرماتے اور ساتھ ہی ساتھ درس قرآن بھی دیتے تھے اور آپ کو عربی زبان پر مکمل دستگاہ حاصل تھی۔

(11) **تعبر** 1969، 10 ستمبر کو شیخ رمضان صاحب نے اسے چار صفحوں کے 18x22/4 سائز 'آج پریس' ممبئی میں طبع کروا کر آکولہ سے شائع کیا تھا۔

راقم نے کتب خانہ خانقاہ نقشبندیہ بالاپور ضلع آکولہ کی فائلوں سے استفادہ کیا۔ اگر اس تحقیقی مضمون میں کوئی قدیم اخبار یا رسالہ رہ گیا ہو یا پھر کہیں کوئی اندراج صحت کے خلاف ہو جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں اور جو کوئی اہل علم و ذوق اس کی نشاندہی فرمائے تو ان شاء اللہ بعد تشکر آئندہ موقع سے اصلاح کر لی جائے گی۔

■

**Syed Talha Naqshbandi Al-Qadri**, Balapur, Distt Akola - 444302 (MS)

ای آر محمد عادل

# اردو غزل اور سائنسی حقائق

جدید دور میں سماج کی ترقی سائنس کی ترقی پر منحصر ہے۔ سائنس کی ترقی انسان کو بلندی عطا کرتی ہے۔ انسان کے ذہن میں ایک شعور بیدار کرتی ہے جس سے تخلیقات و انکشافات کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے۔ سائنس کم وبیش زندگی کے ہر شعبے میں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے، حتیٰ کہ ادب بھی اس سے اچھوتا نہیں۔

اکثر وبیشتر جب ہم اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو جگہ جگہ ہم کو سائنسی رجحانات وسوالات کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر مرزا غالب کا یہ شعر :

سبزۂ گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

غالب اپنے اس شعر میں سوالیہ انداز میں سائنسی رجحانات کی ترجمانی کرتے ہے۔ اسی ضمن میں مشہور سائنس داں ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام سابق صدرِ جمہوریہ ہند نے یکم دسمبر 2002 میں کوسٹ گارڈ پبلک اسکول کے طلبا سے مخاطب ہوکر کہا تھا کہ:

''سائنس کو سوالات کے ذریعے ہی سیکھا جا سکتا ہے''۔

اگر ہم اردو غزلوں پر غور وفکر کریں تو ہم پائیں گے کہ دور جدید کی غزلیں ہوں یا دورِ قدیم کی غزلیں سب میں سائنسی رجحانات کسی نہ کسی طریقے سے موجود ہیں۔ بس ہمیں شعروں کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔

دیکھنے میں شاعر اور سائنسداں ایک دوسرے سے بہت مختلف لگتے ہیں لیکن دریافت کا ایک مشترکہ احساس، اور قدریں دونوں میں پائی جاتی ہیں:

جس طرح ایک ماہر سائنس داں اپنے غور وفکر اور تجزیے سے کسی شے کو دریافت کرتا ہے اس طرح ایک شاعر بھی اپنے تجربات وتجزیات کا اظہار اپنے اشعار میں کرتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ موجودہ دور کی سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی انسان کی جستجو، کاوشوں، اور اس کی ہزاروں برس کی تلاش کا ثمرہ ہے جو وہ قدیم دور سے کرتا رہا ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے اپنے تجسس سے پہیہ، ہل اور تیر کمان ایجاد کیے تھے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے لیے میل کا پتھر ثابت ہوئے۔ یہ سب انھیں عظیم لوگوں کی محنت کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اپنے اطراف میں نقل وحمل اور جدید رسل و رسائل کا ایک جال دیکھتے ہیں جس کے سبب آج کی دنیا سکڑ کر انسان کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ میڈیکل سائنس کی ترقیوں کے باعث ہم ایسے مہلک امراض کا علاج دریافت کر سکے ہیں جن کو لاعلاج تصوّر کیا جاتا تھا۔ مثلاً انفلوئنزا، ہیضہ، میعادی بخار (ٹائیفائڈ) وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ زراعت کے میدان میں بھی اہم ترقی رونما ہوئی ہیں پودوں کی جینے ٹک انجینئرنگ (Genetic Engineering) کے سبب سبز انقلاب وجود میں آیا۔ آج کے دور کا انسان ترقیوں کی ان راہ پر گامزن ہے جن کو قدیم دور کا انسان تصوّر میں بھی نہیں لاسکتا۔ وہ آج سمندروں کی گہرائی، اور خلاؤں کی بلندی پر جا پہنچا ہے اور چاند اور مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے، اور آج بھی اس کی جستجو خوب سے خوب تر چیزوں کی میں جاری ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کی نظر کہاں جا کر ٹھہرتی ہے۔ حالی کا یہ شعر اس بات کا عکاس ہے:

اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اب کچھ سائنسی حقائق اور شعروں میں ان کے بیان پر نظر ڈالتے ہیں۔

روشنی کا ہماری زندگی میں اہم رول ہے اگر سورج کی روشنی ہمیں دستیاب نہ ہو تو ہماری زندگی زیر وزبر ہو جائے گی۔

صبح کے وقت جب آفتاب آسمان میں نیچے اور کم بلندی پر ہوتا ہے تو ہماری پرچھائیں لمبی ہوتی ہے، جیسے جیسے یہ بلند ہوتا جاتا ہے اس کا زاویہ بدلتا جاتا ہے، زاویے کے ساتھ ساتھ چیزوں کا سائز بھی بدلتا ہے۔ مثلاً صبح کے وقت جو ہماری پرچھائیں لمبی تھی وہ دوپہر ہونے تک سکڑ کر چھوٹی ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت کی ترجمانی حمایت علی شاعر کا یہ شعر کرتا ہے:

روشنی کے زاویوں پر منحصر ہے زندگی
آپ کے بس میں نہیں ہے آپ کا سایہ یہاں

عنصر وہ خالص شے ہے جو صرف ایک ہی قسم کے ایٹموں سے مل کر بنی ہوتی ہے۔ ایٹم سے مراد عنصر کا وہ سب سے چھوٹا ذرہ ہے جو کسی عنصر کی تمام خصوصیات ظاہر کرتا ہے اور آزاد حالت میں نہیں رہ سکتا ہے۔ سائنسی علوم میں کیمیائی عناصر اپنی ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اب تک 118 عناصر کی دریافت ہو چکی ہے۔ تمام عناصر میں تین چوتھائی حصّہ دھاتیں (Metalic) اور ایک چوتھائی ادھاتیں (Non Methlic) ہیں۔ ہماری صحت کی حفاظت اور زندگی کے لیے بھی یہ بہت اہم ہیں۔ انسانی جسم میں 99% عناصر جو بڑی تعداد میں موجود ہوتے ہیں ان میں ''آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کیلشیم اور فاسفورس'' قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ ''پوٹاشیم، گندھک، سوڈیم، میگنیشیم، تانبے، زنک، سیلینیم، مولبڈینم، فلورین، کلورین، آئیوڈین، مینگیز (Manganese) کوبالٹ، آئرن'' جیسے عناصر بھی ہمارے انسانی جسم میں موجود ہوتے ہیں جو اس کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان عناصر کی کمی یا زیادتی کے سبب انسانی صحت متاثر ہو سکتی ہے اور ہمارے جسم میں بہت سی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ''ہڈیوں کا کمزور ہونا، اوسموٹک توازن کا بگڑنا، دانتوں کی بیماریاں، لیور کا متاثر ہونا، ہیموگلوبن کی کمی ہونا، گھیگھا (Goitre) کا بننا'' وغیرہ۔ برج نرائن چکبست نے زندگی اور موت میں ان کیمیائی عناصر کی افادیت کو کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

زندگی اور موت کی سائنسی تشریح اس سے زیادہ بہتر درست انداز میں ممکن نہیں۔

ماہرینِ فلکیات کے مطابق کائنات ایک بڑے

دھماکے (Big Bang) کے بعد وجود میں آئی۔ دھماکے کے بعد ایک زوردار ہلچل ہوئی اور خلا میں دور دور تک ملبہ پھیل گیا جس سے کہکشائیں وجود میں آئیں اور اب بھی یہ مسلسل گردش میں ہیں اور پھیل رہی ہیں۔ ہمارا نظامِ شمسی بھی اسی طرح بنا ہے۔ ماہرین کے مطابق سورج کے گرد چکر کاٹنے والے سیارے ''عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون، پلاٹو'' بھی سورج کے ہی ٹکڑے ہیں جو ایک طاقت ور ہلچل کے سبب ٹوٹ کر سورج سے نکلے ہیں۔ آج کے دور میں ماہرینِ فلکیات نے ان آسمانی ہلچل اور اجرامِ فلک کا مشاہدہ کرنے کے لیے بڑی بڑی دوربینوں (Telescopes) اور سیٹلائٹ ڈیزائن کیے ہیں تاکہ رات دن خلاؤں میں ہونے والی ہلچل پر ہر لمحہ نظر رکھی جاسکے۔ اس کے سبب ہم یہ دریافت کرسکے ہیں کہ ہماری زمین اپنے محور پر گھوم کر سورج کے گرد 365 دن میں اور کچھ گھنٹوں میں چکّر لگاتی ہے جس سے رات اور دن اور موسموں کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

لیکن ہمارے نظامِ شمسی میں دوسرے سیارے مختلف فاصلوں پر ہونے کے سبب مختلف وقت میں سورج کے گرد چکّر لگاتے ہیں۔ مثلاً یورینس کو 84 سال، نیپچون کو 165 سال، پلوٹو کو 248 سال ایک چکر لگانے کے لیے درکار ہیں۔ (پلوٹو کو اب شمسی نظام کا حصہ نہیں مانا جاتا)۔

مرزا غالب کو یہ علم تھا کہ خلاؤں میں اجرامِ فلکی مسلسل گردش کررہے ہیں۔ اس لیے ہم کو ان آسمانی گردش پر رات، دن نظر رکھنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم ہر لحظہ ہونے والی تبدیلیوں سے آشنا ہوسکیں۔ ان کا یقین تھا کہ خلاؤں میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں گی اس لیے ہم کو اس گردش سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس پر ہمارا زور نہیں چلتا ہے۔ غالب اس شعر اسی بات کو بیان کرتا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہورہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

رات کی تاریکی میں جب ہم آسمان کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمیں ستاروں سے منوّر ایک حسین منظر نظر آتا ہے۔ بے شمار ستاروں کی جھرمٹ دکھائی دیتی ہے جن کو ہم شمار میں بھی نہیں لا سکتے ہیں۔ اجرامِ فلکی کا یہ جھرمٹ کہکشاں (Milky way) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ستارے زمین سے کافی دور ہیں۔ کچھ ہمیں دکھائی دیتے ہیں اور کچھ نہیں دکھائی دیتے۔ غالب بھی اس حقیقت سے آشنا تھے کہ ستارے حقیقت میں ہوتے کچھ اور ہیں اور دکھائی کچھ اور دیتے ہیں اگرچہ یہ بہت بڑے ہیں لیکن دور ہونے کی وجہ سے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں مختلف رنگ کے ہوتے ہیں لیکن ایک جیسے رنگ کے نظر آتے ہیں، اس لیے غالب انھیں بازیگر کہتے ہیں کیونکہ ان کے ظاہر و باطن میں فرق ہوتا ہے :

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا — غالب

قوسِ قزح کا بنا ایک انوکھا اور حسین منظر ہوتا ہے۔ اس کا وجود آسمان میں اکثر بارش ہونے کے بعد عمل میں آتا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے قوسِ قزح آسمان میں اس وقت دکھائی دیتا ہے جب بارش ہونے کے بعد پانی کے قطرات ہوا میں ٹھہر جاتے ہیں، سورج کی کرنیں جب ان قطرات پر پڑتی ہیں تو قطرے منشور (Prism) کی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح منشور روشنی کی کرنوں کو مختلف رنگوں میں تقسیم کردیتا ہے بالکل اسی طرح یہ پانی کے قطرات سورج کی روشنی کو سات مختلف رنگوں کی شعاعوں میں تقسیم کردیتے ہیں۔ جس کے سبب ہماری آنکھوں کے سامنے ایک خوب صورت اور دلکش قوسِ قزح یا

**آج کے دور میں ماہرین فلکیات نے ان آسمانی ھلچل اور اجرام فلک کا مشاھدہ کرنے کے لیے بڑی بڑی دوربینوں (Telescopes) اور سیٹلائٹ ڈیزائن کیے ھیں تاکہ رات دن خلاؤں میں ھونے والی ھلچل پر ھر لمحہ نظر رکھی جاسکے۔ اس کے سبب ھم یہ دریافت کر سکے ھیں کہ ھماری زمین اپنے محور پرگھوم کرسورج کے گرد 365 دن میں اور کچھ گھنٹوں میں چکّر لگاتی ھے جس سے رات اور دن اور موسموں کاسلسلہ قائم رھتاھے۔**

دھنک (Rain Bow) ظاہر ہوتا ہے یہ ایک کمان کی شکل میں ہوتا ہے اس لیے اس کو 'اندردھنش' سے بھی پکارا جاتا ہے۔ غزل کا یہ شعر دھنک کے رنگوں کے وجود نیز سورج اور آسمان کے باہمی اور انوکھے رشتہ کو اس طرح بیان کرتا ہے:

میں اُفق ہوں مرا سورج سے ہے رشتہ گہرا
ایک دو رنگ نہیں ساری دھنک ہے مجھ میں — وفا نقوی

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار بھی سائنسی فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

مثلاً یہ شعر دیکھیے سورج میں بننے والے داغوں کی طرف اشارہ کرتا ہے:

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور — غالب

کچھ اشعار خلاؤں کی بلندی اور اس کی وسعت کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا — غالب

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں — علامہ اقبال

اک حقیقت،خیال سے برتر
اک جہاں چشمِ روزگار سے دور — جگر

نظر سے دور، مہ و کہکشاں سے آگے ہے
زمین اہلِ طلب آسماں سے آگے ہے — شمیم کرہانی

زیادہ روشنی میں ہماری آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہوتی ہیں، ایک حد تک ہی دکھائی دیتا ہے، کچھ چیزیں بہت دور ہوتی ہیں جن کو دیکھنے پر ان کی اصل شکل و صورت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہوتا شعرا کہتے ہیں:

نظر آئے نہ کچھ بھی روشنی میں
اجالے یوں بڑھائے جارہے ہیں — اظہر عنایتی

سب حُسنِ نظر کے دھوکے ہیں
کیا لالہ و گل کیا شمس و قمر — شمیم کرہانی

سائنس کے مطابق توانائی یعنی Energy کو ختم نہیں کیا جا سکتا، یہ ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بقول شاعر:

زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ!
موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں — جگر

ہمارے سانس لینے کے عمل میں آکسیجن بہت بڑا رول ادا کرتی ہے اگر آکسیجن ہم کو نہ ملے تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے، یہ ہماری زندگی کی علامت ہے:

ابھی سانسیں ہماری چل رہی ہیں
ابھی زندہ بتائے جارہے ہیں — اظہر عنایتی

آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے:

نہ جانے شور اٹھا کر کہاں سے لائی ہے
ہوا نے آج دُکھائے ہیں میرے کان بہت — وفا نقوی

غالب Theory of Relativity کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے — غالب

الغرض مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں ہم یہ واضح طور سے کہہ سکتے ہیں کہ سائنس اور ادب کا رشتہ نہایت مضبوط و مربوط ہے، ہر دور کی غزلوں میں شعرا نے شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے اشعار میں سائنس کی عکاسی کی ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ رواں دواں رہے گا۔ ■

**Er. Mohd Adil**, Hilal House, HNo 4/114, Jagjeevan Colony, Naglah Mallah Civil Line, Aligarh 202002 (UP)

عزت مآب نریندر مودی
وزیر اعظم

وزارت برائے خواتین وفروغ اطفال
حکومت ہند
www.wcd.nic.in

# والدین ہونے کی خوشی کا احساس کریں

# ایک بچے کو گود لیں

محترمہ مینکا گاندھی
مرکزی وزیر برائے خواتین وفروغ اطفال

وزارت برائے خواتین وفروغ اطفال
بچے کو گود لینے کے لیے اب ایک آسان
اور مناسب طریقہ فراہم کرتی ہے

www.adoptionindia.nic.in پر لاگ آن کریں
اور خواہش مند حضرات امکانی والدین کے طور پر خود کو اندراج کرائیں

سینٹرل اڈاپشن ریسورس اتھارٹی (CARA)
اس عمل کو آسان بنائے گا

آپ CARA ڈیسک carahdesk.wcd@nic.in
کو بھی لکھ سکتے ہیں

آپ ہیلپ ڈیسک سے 011-26180194
پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

davp 46101/13/0018/1415

## اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ

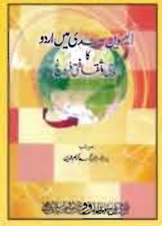

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 549، قیمت: 235 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اوران کے عملے نے ایک بے مثال اور تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے عالمی اردو کانفرنس گزشتہ دنوں (30 اکتوبر تا 1 نومبر 2014) بڑے تزک واحتشام سے منعقد کی۔ گزشتہ برس یہ کانفرنس ستمبر 2013 میں ہوئی اور ایک سال کے بعد سہ روز عالمی کانفرنس کا اہتمام کر کے ایک نئے دور میں قدم رکھ دیا۔ اس کانفرنس میں گزشتہ برس کی تمام روداد و مقالات کو کتابی شکل میں تو پیش کیا گیا ہی۔ مسرت اوراس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس عالمی کانفرنس میں پڑھے گئے تقریباً 52 باون مقالات کو پیشگی منگوا کر اسے کانفرنس سے قبل ہی شائع کر دیا اور اسے اسی کانفرنس میں ریلیز بھی کر دیا۔

اس کتاب کی اشاعت کا مقصد کیا تھا یہ خواجہ اکرام الدین کی زبانی سنیے:

’’دنیا کی سبھی زبانیں اپنی تہذیبی وراثت کی امین و محافظ مانی جاتی ہیں۔ مگر اردو دنیا کی ان قلیل ترین زبانوں میں سے ایک ہے جو تکثیری قومیت (Inclusive Nationalism) اور مختلف تہذیبی رویوں کے اشتراک سے عالم وجود میں آئی ہے اور جسے کسی ایک تہذیب، ایک مذہب، ایک ملک، ایک قوم یا ایک ثقافت سے جوڑ کر دیکھا نہیں جا سکتا اور جو مختلف تہذیبی و ثقافتی ورثوں، رویوں اور روایتوں کی حفاظت اور ترجمانی کرتی ہے۔‘‘

اسی لیے اس عالمی کانفرنس کا موضوع تھا ’اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ‘ خالص ادب کے لوگوں کے لیے یہ موضوع ایک چیلنج تھا۔ کانفرنس کا کلیدی خطبہ پروفیسر شمیم حنفی نے پیش کیا ان کا ایک جملہ دیکھیے:

’’زبانیں بھی انسانوں کی طرح سفر کرتی ہیں۔ اکیسویں صدی خلا میں نہیں پیدا ہوئی اسے بیسویں صدی نے جنم دیا۔‘‘

پروفیسر شمیم حنفی کا خطبہ مختصر اور ہندی کے شاعر سرویشور دیال سکسینہ کی نظم کے اس ٹکڑے پر ختم ہوتا ہے:

نڈر آگے بڑھو
تمھاری راہ میں چھوٹا سا
بانس کا پُل ہے
بانس کے اس پُل کا ایک نام اردو بھی ہے

تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات کی یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ’اردو کا سماجی و ثقافتی تناظر‘ جس میں نو مضامین ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر عتیق اللہ، امین حیدر، پروفیسر قدوس جاوید، سید فیصل علی، ڈاکٹر مختار شمیم، ڈاکٹر سیما صغیر اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی۔

دوسرا حصہ ’اردو زبان۔ ماضی حال اور مستقبل‘ ہے۔ اس میں بارہ مضامین ہیں۔ مضمون نگاروں میں محمد نعمان وحید بخاری، سید اقبال حیدر، پروفیسر خلیل طوق آر، ڈاکٹر احمد القاضی، ڈاکٹر محمد آصف اعوان، علیم صبا نویدی، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر محمد نعمان خاں، پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر مشتاق احمد، شاہد لطیف، نصرت ظہیر شامل ہیں۔ تیسرا عنوان ہے ’اردو زبان وادب کا قومی و بین الاقوامی منظر نامہ‘ مضمون نگاروں میں نصیر احمد خاں، ابوالکلام قاسمی، ناصر عباس نیر، جمیل اصغر، وفا یزدان منش، ناظم الدین مقبول، فرزانہ عظیم لطفی علی بیات، علی احمد فاطمی، سراج الدین، اسلم جمشید پوری، پروین شیر وغیرہ، اس حصے میں بیرون ملک کے قلم کار زیادہ شامل ہیں جن کی تحریروں سے اردو کا عالمی منظر ابھرتا ہے۔ چوتھے حصے کا تعلق اردو صحافت اور ترجمے سے ہے۔ شافع قدوائی کا مضمون حیرانی کو چھوتا ہے کہ اطلاعات کی بنیادوں پر ٹکا ادب انسانی معاشرہ کس قدر انسانی و اخلاقی قدریں کھوتا جا رہا ہے۔ مرزا حامد بیگ، سید سجاد حسین، معصوم کاظمی، ناصر ناکاگاوا، عنایت حسین عیدن، روبینہ فیصل، زماں آزردہ، رضا علی عابدی، صدف مرزا، ثوبان سعید، صغیر افراہیم، سہیل احمد فاروقی وغیرہ کے مضامین شعر وادب سے قطع نظر، ترجمے کی مشکلات و معیار، ادارہ نویسی، برقی میڈیا، آن لائن اردو میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، اطلاع اساس معاشرہ وغیرہ کے بارے میں متحیر و چشم کشا اطلاعات دیتے ہیں۔ آخری حصے میں صرف پانچ مضامین ہیں جن کا تعلق اردو تعلیم اور انفوٹمنٹ شعبوں سے ہے۔ یہاں ابن کنول، اطہر فاروقی، محمد احسن، مظفر شہہ میری، محمد کاظم کے مضامین سے اردو تعلیم کی موجودہ صورت حال، اعداد و شمار، سرشاری و بے چینی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بے اطمینانی اور بے چینی کا احساس ہی سفر کو جاری وساری کیے رہتا ہے۔

اس غیر معمولی کتاب میں مضامین یہ مژدہ سناتے ہیں کہ اردو روایتی تعلیم و تدریس سے اوپر اٹھ کر دنیا کی ضرورتوں، اطلاعات، برق رفتاری کے دوڑ میں کہیں پیچھے نہیں ہے بس اسے روایت کے خول سے نکالنے کی ضرورت ہے۔

ہم جدید کے نام پر جدید تھیوریز اور خالص و معیاری ادب کی تلاش میں رہتے ہیں اور سمٹے سکڑے رہتے ہیں۔ ایسا پہلی بار یا عرصے کے بعد ہوا کہ اردو کو سماجی اور ثقافتی فروغ کے حوالے سے عالمی تناظر میں جانچا پرکھا گیا اور وہ بھی اکیسویں صدی کے سیاق وسباق میں۔ بیشتر مضامین ادب پر کم زبان پر زیادہ باتیں کرتے ہیں۔ زبان کے سماجی اور ثقافتی مسائل اور فروغ۔ امریکہ، کنیڈا، جرمنی، برطانیہ، ڈنمارک، ایران، ازبکستان، پاکستان غرض کہ جہاں جہاں اردو ہے وہاں زبان کی حیثیت اس کی مقبولیت، وسعت اور مقصدیت کیا ہے۔ یہ سارے سوالات اس کتاب اور اس میں شامل مضامین میں جذب و پیوست ہیں اس لیے یہ کتاب اب صرف ایک کتاب نہیں بلکہ اکیسویں صدی میں اردو زبان کے فروغ کی سمت و

جہت کی انسائکلو پیڈیا بن گئی ہے۔ جسے کونسل نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اور کونسل ہی یہ کام کرسکتی تھی کہ یہ ادارہ ادب کے فروغ کے لیے کم زبان کے فروغ کے لیے زیادہ ہے۔

مرتب پروفیسر خواجہ اکرام الدین کا یہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے جو آسان نہیں تھا، لیکن منصوبہ، حوصلہ اور جدید طریقہ کار ہو تو ناممکن کام بھی ممکن ہو سکتے ہیں۔ یہ پیغام خواجہ اکرام کے اس عمل سے ملتا ہے، جس کے لیے انھیں جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔

ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل خوبصورت گٹ اپ، طباعت والی اس ضخیم کتاب کی قیمت محض -/235 روپے ہے۔ جیسا کہ عرض کیا یہ کتاب نہیں انسائکلو پیڈیا ہے جو یہ آج کی کتاب ہے۔ عہد حاضر کا مشینی کارنامہ اور اردو کا عالمی منظرنامہ جسے اردو زبان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ کونسل کا یہ عظیم کارنامہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

## علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات

مصنف: خوشتر نورانی

صفحات: 248، قیمت: 91، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: اسرائیل رضا، سابق صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

علامہ فضل حق خیرآبادی کا شمار انیسویں صدی عیسوی کے ان پیش رو مجاہدین آزادی اور ممتاز علما میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے وطن عزیز ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنی جان تک قربان کردی۔ علامہ کی ولادت 1797 میں اتر پردیش کے مردم خیز قصبہ خیرآباد ضلع سیتاپور (یوپی) میں ہوئی۔

پیش نظر کتاب 'علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات' خوشتر نورانی کی تصنیف ہے۔ سلسلۂ خیرآباد اور معرکۂ ستاون کے حوالے سے یہ کتاب ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ کتاب میں علامہ فضل حق خیرآبادی کے مجاہدانہ کارناموں کا تعلق بالخصوص معرکۂ ستاون میں علامہ کی شرکت، انگریزی سرکار کے خلاف ان کا فتاوی جہاد، مقدمہ میں علامہ پر عائد کردہ الزامات کی حقیقت، جرم بغاوت کی سزا کے بعد ان کی رہائی کا مسئلہ، معرکۂ ہنومان گڑھی میں مجاہدین کے خلاف فتاوی جہاد کا معاملہ، اسمٰعیل دہلوی سے علامہ کے نزاع کی نوعیت، جزیرہ انڈمان میں علامہ کی آخری آرام گاہ کا تعین، علامہ کے شخصی کردار وغیرہ سے ہے۔

علامہ فضل حق کے ناقدین میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، غلام رسول مہر، پروفیسر ایوب قادری، ڈاکٹر ثریا بتول ڈار اور شمیم طارق وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ مالک رام کا موقف ہے کہ معرکۂ ستاون میں مولانا فضل حق خیرآبادی کا سرے سے کوئی رول ہی نہیں رہا ہے چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''جب یہ ہنگامہ (معرکۂ ستاون) شروع ہوا تو وہ (مولانا فضل حق) عملاً اس سے الگ تھلگ رہے، نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے، نہ عملی لحاظ سے، انھوں نے کوئی فتویٰ لکھا، نہ تلوار اٹھائی۔'' (ص 69)

مصنف نے مختلف دستاویزات کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معرکۂ ستاون کا فتویٰ جہاد جنرل بخت کے مشورے پر علامہ کی طرف سے ہی صادر کیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس: ''فتویٰ جہاد: جنرل بخت کے مشورے سے علامہ نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی اور استعفا پیش کیا جس پر ممتاز علما نے دستخط کیے۔'' (مختلف دستاویزات، ص 52)

آخر میں ماحصل کے طور پر موصوف رقمطراز ہیں:

''یہ تمام شواہد اس بات کی علامت ہیں کہ علامہ اپنی پوری زندگی میں انگریزی حکام سے مخالفت و نفرت کرتے رہے اور ان سے استخلاص وطن کے لیے کوشاں رہے۔ جو لوگ محض علامہ کی انگریزی ملازمت کی وجہ سے انھیں انگریز نوازی کا طعنے دیتے ہیں، انھیں اپنے رویے پر نظرثانی کرنی چاہیے۔'' (ص 122)

اپنے مباحث کو تاریخی حقائق کا جامہ پہنانے کے لیے جناب خوشتر نورانی نے جن معاصر مآخذ کے حوالے دیے ہیں ان میں بالخصوص تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ (ذکاءاللہ)، حکیم احسن اللہ خاں کی یادداشت (معین الحق)، 1857 کے غداروں کے خطوط (عاشور کاظمی)، اخبار دہلی (چنی لال)، روزنامچہ معین الدین حسن خاں معروف بہ خدنگ غدر، روزنامچہ منشی جیون لال، 1857 کا تاریخی روزنامچہ (عبداللطیف)، غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط، مقالات سرسید حصہ شانزدہم، بہادر شاہ کا مقدمہ (خواجہ حسن نظامی)، غالب کا روزنامچہ غدر (خواجہ حسن نظامی)، ہمارے ہندوستانی مسلمان (ڈبلیو ہنٹر)، الثورۃ الہندیہ' (فضل حق خیرآبادی) وغیرہ شامل ہیں جن سے علامہ فضل خیرآبادی کی معرکۂ ستاون میں شرکت اور ان کے فتویٰ جہاد سے متعلق حقائق کا پختہ ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کے جامع پیش لفظ اور مصنف کے تمہیدی اظہاریہ کے ساتھ ہی پروفیسر معین الدین عقیل (پاکستان) کے مقدمہ، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، حکیم سید محمود احمد برکاتی، خواجہ رضی حیدر، پروفیسر اسد قادری احمد، ماہنامہ اردو دنیا، ماہنامہ اردو بک ریویو، اور پروفیسر سید حسین الحق کے وقیع تاثرات شامل ہیں۔ اس کے بعد تاریخی ادوار پر مشتمل 'توقیت فصل حق' کے عنوان سے علامہ فضل حق خیرآبادی کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب میں علامہ خیرآبادی کی زندگی کے گوشوں اور کارناموں پر مختلف عنوانات مثلاً توقیت فضل حق، تحقیق کے دو پیمانے، علامہ فضل حق خیرآبادی اور معرکۂ ستاون کا فتوی جہاد، فضل حق خیرآبادی اور سید فضل حق رام پوری، علامہ فضل حق خیرآبادی اور انگریزی ملازمت، ایک نایاب قصیدے (رائیہ) کی بازیافت، قصیدۂ نونیہ پر ایک نظر، قصیدۂ رائیہ اور نونیہ: چند نئے حقائق، مرکز علم وفن خیرآباد کی سیر، ضمیمہ نمبر 1 (شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ایک فتویٰ)، ضمیمہ نمبر 2 (انگریزی حکومت کی ملازمت سے وابستہ علما کا تعارف)، ضمیمہ نمبر 3 (قصیدہ رائیہ کا متن) اور ضمیمہ نمبر 4 (قصیدۂ نونیہ کا متن اور ترجمہ) کے تحت علیحدہ علیحدہ نگارشات ہیں۔ علامہ کے فتویٰ جہاد کے ثبوت میں ایک قصیدۂ نونیہ کا اردو ترجمہ اور 235 اشعار پر مشتمل قصیدۂ رائیہ کی بازیافت اور اس کا اردو میں خلاصہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خوشتر نورانی نے خانوادۂ خیرآباد کی علمی اور معاشرتی تاریخ سے متعلق اصل مصادر، قلمی نسخوں اور مخطوطات سے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔ امید ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں محترم خوشتر نورانی صاحب کی یہ تحقیقی تصنیف دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

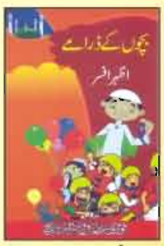


## بچوں کے ڈرامے

مصنف: اظہر افسر

صفحات: 124، قیمت: 22 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: قرۃ العین، P-112، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب، بچوں کے ڈرامے، اظہر افسر کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں کل بارہ ڈرامے ہیں جو مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ مذکورہ کتاب میں پہلا ڈرامہ، راکٹ کا نقشہ، ہے جس میں مصنف نے بچوں کی ذہانت اور اس کی بصیرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کس طرح ایک بچہ ماحول اور گھر کی تعلیم کو دیکھ کر خود بھی اس میں

ڈھلنے کی کوشش کرتا ہے اور سائنسی ایجادات کو دیکھ کر اس کا ذہن ان چیزوں کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اسی طرح ڈراما، محنت کا پھل، جس کا مرکزی کردار وکرم ہے جو آخری سانس تک اپنے سیٹھ کی خدمت کرتا ہے لیکن جب اپنے علاج کے لے ولایت چلا جاتا ہے اور اس کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کی وصیت کے مطابق وکرم کے گھر اس کی خدمت اور محنت کے عوض میں سیٹھ وکیل کے ذریعہ پانچ ہزار روپے بھجواتا ہے۔ اس طرح یہ ڈراما دلچسپ انداز میں اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ کتاب میں شامل ایک ڈراما، مچھلی کا شکار، اظہر افسر نے اس ڈرامے کے ذریعے جاندار اور بے زبان مخلوق کو مارنے سے روکنے کی طرف ترغیب دلائی ہے۔ چونکہ اظہر افسر کے تمام ڈرامے بچوں کی تربیت کے لیے لکھے گئے ہیں۔ جس میں لوگوں کی مدد بڑوں کی عزت اور بچوں کو تعلیم کی طرف رغبت دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ بھی ایک ایسا ہی ڈراما ہے جس میں بچوں کو کسی کی مدد کرنے کی طرف رغبت دلائی گئی ہے۔ لفظ چنانچہ کو مصنف نے کردار کے ذریعے بار بار استعمال کر کے مزاحیہ بنایا ہے۔ ڈراما ننھی سی لڑکی بھی ایک ایسا ڈراما ہے جس میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہے اور اس کے ذریعے یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ دوسروں کے دکھ درد بانٹنے اور مدد کرنے سے جو خوشی ملتی ہے اس کا کوئی مول نہیں۔ مثال کے طور پر اس ڈرامے کے کردار کا مکالمہ ملاحظہ ہو:

سلیم: آؤ آؤ میں بھی بہت خوش ہوں۔
مجھے دو روپے کا کوئی غم نہیں
میں کل طیبہ کے ساتھ نمائش دیکھنے نہیں جاؤں گا
نواب صاحب کے بچوں کے ساتھ بھی نہیں گھوموں گا۔
میں نے نمائش کی چیزوں سے کہیں زیادہ انمول چیز خرید لی ہے۔
بڑی انمول آج کی شام میری سب سے اچھی شام ہے۔
آؤ گھر چلیں۔ ابا ہماری راہ دیکھتے ہوں گے۔

زیر نظر کتاب میں ایک دیگر ڈراما بعنوان، دو دوست، ہے جس میں ہریش اور انور دو ایسے دوست ہیں جو ایک دوسرے کو جانتے اور سمجھتے ہی نہیں بلکہ سچی دوستی کا عملی ثبوت بھی پیش کرتے ہوئے ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ اسی طرح مجموعے میں شامل ڈرامے (شکریہ، ایک روپیہ فی مکان، بڑے دنوں بعد، موتی، اور بقلم خود) کو مصنف نے بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اردو ڈراموں کے حوالے سے اظہر افسر کا ایک اہم نام ہے ان کے کئی مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ بچوں کی تربیت کے لیے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر بھی لکھتے رہے ہیں جن کا مقصد بچوں کو نئے نئے علوم کی پہچان کرانا ہے اس لیے انھوں نے سائنسی ایجادات اور ان جیسے دیگر موضوعات کو اپنے ڈرامے کا موضوع بنایا ہے۔ کتاب میں شامل تمام ڈرامے اسٹیج کو نظر میں رکھ کر لکھے گئے ہیں کیوں کہ اسے آسانی سے اسٹیج پر پیش کیا جا سکے اور ان کے مکالمے بھی کرداروں کے موافق ہیں۔ پیش کش اور انداز بیان بھی بہتر ہے یہ کتاب 124 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت 22 روپے ہے۔ طباعت صاف اور دلکش ہے، بلاشبہ ڈراموں کا یہ مجموعہ بچوں کے لیے دلچسپ اور کارآمد ہے۔

## اکیسویں صدی میں اردو فروغ اور امکان

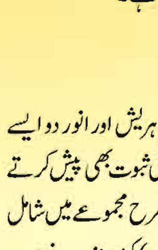

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 349، قیمت: 163 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: پروفیسر شہزاد انجم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

گذشتہ چند برسوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہوا ہے۔ تین اہم رسائل اردو دنیا، بچوں کی دنیا، فکر و تحقیق کی معیاری اشاعت، مسودات کی اشاعت، کمپیوٹر سینٹر کے قیام کتابوں کی خریداری، اردو کی ترقی کے لیے کوشاں تنظیموں کو مالی امداد کی فراہمی، کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن کے مراکز کا قیام وغیرہ ایسے اہم اور شاندار کارنامے ہیں جن کی شہرت تمام اردو دنیا کو محیط ہے۔ اردو زبان کے فروغ کے سلسلے کی اسی کڑی میں پہلی بار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام 4 سے 6 ستمبر 2013 ایک عظیم الشان سہ روزہ بین الاقوامی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس میں ہندوستان، پاکستان، امریکہ، برطانیہ، کناڈا، روس، ترکی، مصر، سعودی عرب، دبئی، دوحہ (قطر)، ماریشس اور ایران کے مندوبین نے بڑی تعداد میں شرکت کی تھی۔ کانفرنس میں اکیسویں صدی میں اردو کے فروغ کے امکانات پر غور و خوض کیا گیا تھا۔ بقول مرتب:

''یہ کانفرنس اردو کی دیگر تقریبات سے مختلف تھی۔ اس تین روزہ عالمی کانفرنس میں زبانی جمع خرچ کے بجائے اصل صورت حال، دستاویزات اور اعداد و شمار کی بنیاد پر کچھ ٹھوس نتائج نکالے گئے تھے اور ان سے حکومت کو باخبر کیا گیا تھا... یہ مجلہ گذشتہ کانفرنس کی روداد، تفصیلات اور مقالات کا مجموعہ ہے۔''

اس کتاب کو چھ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ اردو زبان: منظر و پس منظر، دوسرا فروغ اردو کے ادارے، تیسرا اردو اور میڈیا، چوتھا اردو اور انسان دوستی، پانچواں اردو کا عالمی افق، اور چھٹا قرارداد اور پاور پوائنٹ پریزنٹیشن پر محیط ہے۔ جس میں ڈاکٹر تحسین فراقی، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر لڈمیلا، ڈاکٹر خلیل طوقار، سید محمد اشرف، پروفیسر محمود الحسن، جناب شکیل حسن شمسی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، مشرف عالم ذوقی، سید تقی عابدی، پروفیسر انور پاشا، پروفیسر اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر اطہر فاروقی، پیغام آفاقی، پروفیسر صغیر افراہیم، جناب حسام الاسلام صدیقی، پروفیسر ناشر نقوی، پروفیسر ابن کنول، غلام نبی خیال جیسے مشاہیر علم و ادب کے مضامین اور تجاویز شامل ہیں ان ادبا نے اکیسویں صدی میں اردو کے فروغ، امکانات، قومی منظر نامے، فروغ اردو کے اداروں، اردو اور میڈیا کے رشتوں، اردو اور انسان دوستی اور عالمی سطح پر اردو زبان و ادب کے منظر ناموں پر روشنی ڈالی ہے جب کہ پروفیسر اختر الواسع کے ذریعے پیش کی گئی قرارداد اور پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین ڈائرکٹر 'قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان' کا پاور پائنٹ پریزینٹیشن بھی تحریری شکل میں شامل ہے۔ خواجہ محمد اکرام الدین نے پاور پوائنٹ پریزینٹیشن میں یہ تفصیل سے بیان کیا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو کے فروغ کے لیے وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند کے ایک نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کرتی ہے۔ جس کے اغراض و مقاصد میں اردو زبان کو فروغ دینا، اس کی ترویج و اشاعت، حکومت ہند کو اردو زبان اور اس کی تعلیم سے متعلق معاملات میں مشورے دینا، اردو، فارسی اور عربی زبان کے فروغ کے لیے مناسب اقدامات کرنا اور سائنسی اور تکنیکی ترقیوں اور جدید تناظر میں پیدا ہونے والے تصورات سے متعلق معلومات کو اردو میں مہیا کرنے کے لیے اقدامات کرنا ہے۔ اس پاور پوائنٹ پریزینٹیشن میں کونسل کی سرگرمیوں اردو میں کمپیوٹر کی تعلیم کے لیے ملک کے مختلف علاقوں میں قائم کمپیوٹر سینٹرس، کتابوں کی اشاعت، خریداری تین اہم رسائل اردو دنیا، بچوں کی دنیا اور فکر و تحقیق کی اشاعت، اردو کے فروغ کے لیے ٹکنالوجی کا استعمال وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے میں یہ واضح کیا تھا کہ فی الوقت قومی اردو کونسل، اردو کے فروغ کے لیے پوری دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ جس کے اشاعتی پروگرام کمپیوٹر ٹکنالوجی کے جانب پیش رفت، اردو کے فروغ کے لیے اس کی کوششیں و کاوشیں حد درجہ لائق تحسین ہیں، پھر بھی بہت سارے اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے جن سے اردو زبان کا فروغ ہو سکے۔ ابتدائی سطح پر ہر شہر میں تعلیم کا انتظام ان میں سے ایک ہے۔

اس کتاب میں شامل کئی مضامین خاصی اہمیت کے حامل ہیں بنیادی طور پر اس کتاب کے مطالعے سے ہندوستان میں اردو زبان کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں، اداروں اور الیکٹرانک میڈیا کی جانب سے اردو کے فروغ کے لیے اٹھائے گئے عملی اقدام کا مفصل جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ انسان دوستی اور وسیع المشربی اردو کی خمیر کا حصہ ہیں۔ ان نکات پر بھی مقالہ نگاروں نے روشنی ڈالی ہے۔ بیرون ملک کے ادبا نے عالمی سطح پر اور ان ممالک میں اردو زبان کے ماضی، حال اور مستقبل پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کے آغاز میں جناب ڈاکٹر ایم ایم پلّم راجو، جناب سلمان خورشید، جناب جتن پرشاد اور پروفیسر وسیم بریلوی کے کانفرنس میں پیش کیے گئے خیالات بھی شامل ہیں جس سے ان افراد کی اردو دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ کلچر کی امین ہے۔ پوری دنیا میں اس زبان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ حکومت ہند کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ یہ زبان ہندوستان میں پھلے پھولے اور اس کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کی جاتی رہی ہے۔ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کی وہ نوڈل ایجنسی ہے جو عوام اور سرکار کے درمیان پل کا کام کرتی ہے اور اردو زبان کے فروغ کے لیے ادیبوں، دانشوروں، سماجی، سیاسی کارکنوں، میڈیا کے افراد، مدارس، اسکولوں کالجوں، یونیورسٹیوں کے اساتذہ، طلبا سے براہ راست رابطہ کرتی ہے، مشورے کرتی ہے اور اردو زبان کے فروغ کے لیے ہمہ جہت کوششیں بھی کرتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اسی سلسلے کی کڑی ہے تاکہ عوام وخواص اردو کے قومی اور عالمی منظر ناموں سے واقف ہوسکیں۔

پیش نظر کتاب کے مرتب اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی سعی جمیلہ سے عالمی کانفرنس کا انعقاد ہوا، اور یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ امید ہے اس کتاب کے مضامین فکری سطح پر ہمیں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کریں گے۔

## تاریخ اسلام کے علمی ذخائر: ایک تجزیاتی مطالعہ

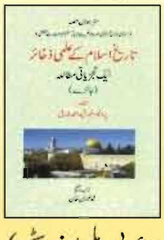

تالیف: پروفیسر خورشید احمد فارق
ترتیب وتصحیح: پروفیسر محمد نعمان خان
صفحات: 273، قیمت: 158 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ابلاغ پبلی کیشنز، جامعہ نگر نئی دہلی
مبصر : ڈاکٹر رشید اشرف خان، ممبئی

زیر نظر کتاب کے مؤلف پروفیسر خورشید احمد فارق (سابق صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی) جن کی مدت حیات 1916 تا 5/نومبر 2001 پر محیط ہے۔ یہ کتاب دراصل تاریخ اسلام کے علمی ذخائر نامی سلسلۂ تصانیف کا سترہواں حصہ ہے اور اس کتاب کا موضوع اسلامی تاریخ، اسپین اور پیرنیس پہاڑ پار مسلم غزوات کا بیان ہے۔ زیر نظر جلد میں تین مختلف موضوعات پر مبنی عربی کتب کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلی کتاب کا عنوان 'الانس الجلیل بتاریخ القدس فالخلیل' ہے جسے دسویں صدی ہجری میں بیت المقدس کے مشہور عالم دین قاضی مجیر الدین جلیلی حنبلی نے تحریر کیا تھا۔ اس کتاب میں فلسطین کے دو مشہور شہروں 'بیت المقدس' اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے نام سے منسوب شہر 'الخلیل' کی ایک مفصل اور جامع ترین تاریخ پیش کی گئی ہے جس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر مصنف نے اپنے دور تک کے فلسطین کی تاریخ خصوصاً مذکورہ شہروں کے تاریخی، علمی وثقافتی حالات کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ منعکس کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1866 میں قاہرہ سے شائع ہوئی اور تقریباً ایک صدی بعد اس کی دوسری اشاعت نجف سے دو جلدوں میں ہوئی جس کی پہلی جلد کو فارق صاحب نے اردو میں ترجمہ کر کے درحقیقت بیت المقدس کا انسائیکلو پیڈیا پیش کر دیا ہے۔ کتاب کے مصنف علام قاضی مجیر الدین جلیلی حنبلی کا سنہ وفات 928ھ تھا۔

موجودہ کتاب میں دوسری مشمولہ کتاب لبنان کے مشہور ادیب، شاعر وصحافی جُرجی زیدان کی ''تاریخ مصر الحدیث'' کے پہلے حصے کا اردو ترجمہ ہے جو مصر کے دور جاہلیت سے لے کر انیسوی صدی تک کا ادبی، تہذیبی اور تاریخی منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ جرجی زیدان کی اس کتاب کی اشاعت پہلی بار 1889 میں مصر سے ہوئی جو دو جلدوں پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب مصر کی جامع صفات تاریخ کا ایک نادر ونایاب نمونہ ہے۔ زیدان نے لبنان سے ہجرت کر کے مصر میں مستقل سکونت اختیار کی تھی اور یہیں پر 1914 میں انتقال ہوا۔ اس جلد میں شامل تیسری اہم کتاب لبنان ہی کے ایک مشہور مورخ، ادیب وشاعر، امیر البیان شکیب ارسلان کی تحقیقی کتاب 'تاریخ غزوات العرب' کے اردو ترجمے پر مبنی ہے۔ شکیب ارسلان لبنان کے شہر شویفات میں 1869 میں پیدا ہوا تھا۔ وہ عرب ممالک کی وحدانیت کا خواہاں تھا لہٰذا دمشق سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی کتاب کے لیے عرب اور یورپ کے کئی ملکوں کا دورہ کیا اور ان ممالک میں عربی زبان اور اس کی تاریخ سے متعلق مواد فراہم کر کے اپنی کتاب میں اسپین، فرانس، اٹلی اور عرب ممالک کے نشیب وفراز کا ایک بہترین مرقع پیش کیا ہے۔

زیر نظر کتاب پروفیسر خورشید احمد فارق کے اس ذوق علمی کا ثمرہ ہے جس کی تکمیل کے لیے انھوں نے عمر کے کسی بھی دور میں اور کسی بھی سطح پر مفاہمت نہیں کی۔ حصول علم کے اس بے پایاں ذوق نے ہی انھیں ہندوستان کی ان چند ممتاز شخصیات میں نمایاں مقام عطا کیا جو اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ پروفیسر فارق عربی زبان وادب اور اسلامی تاریخ پر گہری نگاہ رکھتے تھے، عربی کے ساتھ ہی انھیں اردو زبان سے بھی خاصا شغف تھا تاہم وہ اپنی روزمرہ زندگی میں بھی عربی زبان کو اس کے مستند صرفی ونحوی تقاضوں کے ساتھ برتنے پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ کتاب کے مرتب پروفیسر نعمان خاں نے اپنے استاد کی شخصیت کے اس پہلو پر کچھ یوں روشنی ڈالی ہے:

''فارق صاحب 'عربی' اور 'اردو' دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ یہ کتاب ترجمہ میں ان کی مہارت کا ثبوت ہے لیکن بظاہر وہ ترجمے پر نظر ثانی نہیں کر پاتے تھے اس لیے بعض مقامات پر چوک ہوگئی ہے، اسی طرح بسا اوقات جملوں میں الفاظ کی ترتیب گنجلک ہوگئی ہے، بعض غیر مانوس الفاظ اور عربی تعبیرات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے پورا یقین ہو جاتا ہے کہ کہ فارق صاحب کو کتاب کی طباعت کا خیال نہیں تھا، بس علمی شوق ومزاج کی بنیاد پر انھوں نے یہ کام انجام دے دیا'' (ص8)

پروفیسر خورشید احمد فارق کی زیر مطالعہ کتاب میں اتنی علمی، ادبی، لسانی اور فنی خوبیاں ہیں کہ سب کا احاطہ کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہیں۔ انھوں نے ہر باب کے شروع میں ایک قرآنی آیت ضرور لکھی ہے اس سے نہ صرف ان کے غیر معمولی تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے مطالعہ قرآنی اور حکمت ایمانی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

اس کتاب کے مرتب پروفیسر خورشید احمد فارق کے لائق شاگرد پروفیسر محمد نعمان خان نہایت درجہ قابل تعریف ومبارکباد ہیں جنھوں نے اس کی ترتیب وتصحیح انتہائی ریزہ کاری، عرق ریزی اور بھرپور علمی انہماک سے کی۔ یہ بہت بڑی خدمت تھی جسے پروفیسر نعمان خان نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دی جو ہمارے دور کے فہیم اور بالغ نظر طالبان کے لیے یہ ایک عمدہ عملی سبق ہے کہ تحصیل علم، خدمت استاد اور علم اندوزی کا سلیقہ کیا ہے؟

**ادبی بصیرت** (ادبی تبصرے اور تنقیدی و تحقیقی مضامین)

مصنف: ڈاکٹر محمد ناظم علی
صفحات: 180، قیمت 250 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ڈاکٹر محمد ناظم علی، 17.07.335، یاقوت پورہ، حیدرآباد
مبصر: اقرا سبحان، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر محمد ناظم علی گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ ضلع نظام آباد میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ موصوف کی پانچ کتابیں آئینہ عصر، روح عصر، عکس ادب، حیدرآباد کے رسائل آزادی کے بعد سے حال تک، پروفیسر آل احمد سرور: فکر و فن شائع ہو چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'ادبی بصیرت' مصنف کی چھٹی تصنیف ہے۔ پیش لفظ صابر علی سیوانی نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی کو 1991 میں ریاستی اردو اکیڈمی سے بسٹ ٹیچر ایوارڈ، حکومت آندھرا پردیش سے اسٹیٹ ایوارڈ ٹو میری ٹوریس ٹیچر، انڈین سالیٹری کونسل نئی دہلی کی جانب سے بھارت ودیا شرومنی ایوارڈ، اور بزم علم و ادب کی جانب سے بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔

'ادبی بصیرت' کتب و رسائل کے تبصروں پر مبنی ہے۔ اس میں 'شارب ردولوی شخصیت اور تنقید نگاری'، از ڈاکٹر عرشیہ جبیں، انگور کھٹے ہیں از پاگل عادل آبادی، آخر شب کے ہمنشیں از محمد ایوب فاروقی صابر، مجلہ عالمی اردو ایڈیٹرس کانفرنس، مدیر زاہد علی خاں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بعض 18 تنقیدی مضامین بھی زینت کتاب ہیں۔ ان مضامین میں خصوصیت کے ساتھ آل احمد سرور کا تنقیدی تصور، کیا انشائیہ صنف ادب ہے، سعادت حسن منٹو کے افسانوں کی عصری معنویت، اردو کی غیر مستعمل زوال یافتہ اصناف کا تحفظ، اکیسویں صدی میں ادیب کی ذمہ داری، ادب میں معنی کی تکثیریت کے علاوہ سلسلہ وار مضمون غزل میں ضمائر کی بات وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

مصنف نے بعض معروف ادبی رسائل اور اخبارات کے ادبی کالموں پر بھی تبصرے کیے ہیں۔ ان کے تبصروں اور تبصرہ جاتی مضامین کو پڑھ کر صاحب طرز ہونے کا امکان بہت قوی ہے۔ اوراق ادب، حیدرآباد کے کالم گفت باہمی کی چودہ قسطوں پر بڑی عمدہ گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ اردو دنیا نئی دہلی کے 17 شماروں پر بھی تبصرے کیے ہیں۔ تبصروں کے بالمقابل ڈاکٹر ناظم صاحب کے تنقیدی مضامین میں کسی حد تک گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود مصنف نے کچھ ایسی فکر انگیز باتیں اور سوالات قائم کیے ہیں جن پر غور کرنا مفید ثابت ہوگا۔ سعدیہ مشتاق صاحبہ کے مضمون 'سفید خون' پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ناظم صاحب نے اپنے ایک اور مضمون 'مولانا آزاد...... عبقری شخصیت، قوم و ملک کے نباض' میں نئی نسل سے دیگر قومی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد کو بھی متعارف کرانا چاہیے۔ مولانا آزاد کے لیے بھی نوجوانوں میں جذبے کی ویسی ہی شدت پیدا ہونی چاہیے جو دیگر قومی رہنماؤں کے لیے ان کے دلوں میں ہے۔ ناظم صاحب نے اس جذبے کو مہمیز کرنے کے لیے 11 نومبر کو یوم قومی تعلیم کا انعقاد کرنے کی سفارش کی ہے تاکہ مولانا کی خدمات اور کارہائے گراں مایہ کو سچا اور صحیح خراج دیا جاسکے۔ ڈاکٹر ناظم صاحب کی یہ رائے یقیناً قابل احترام ہے۔ ایک دیگر مضمون میں مصنف نے یہ بات کہی ہے کہ حیدرآباد جو کہ اہل علم وفن کا شہر ہے، ادب کا عظیم مرکز ہے۔ اس کے باوجود اس کے پہلے ادبی رسالے کی کھوج ایک مشکل مرحلہ ہے۔ لہٰذا مصنف نے 'رسالہ مخزن الفوائد' کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد میں یہ سمجھتی ہوں کہ مصنف کو اس رسالے کو پہلا ادبی رسالہ ماننے میں کچھ تامل ہے۔ وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ رسالے کے دیباچے میں ادبی مزاج و رجحان کا کچھ ذکر نہیں۔ اس کے باوجود مصنف حتمی نتیجہ ادبی دانشوروں اور مدیروں کے فیصلوں پر چھوڑتے ہیں کہ حیدرآباد کا پہلا ادبی رسالہ کون سا ہے؟

کتاب میں پروف کی غلطیاں وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ پروف کی غلطیوں سے میری مراد ایسے الفاظ سے ہے جن کے حذف ہوجانے یا ٹائپ نہ ہونے کی وجہ سے عبارت کا مطالعہ مسدود ہونے لگتا ہے۔

اس کے علاوہ مصنف نے 'و' عطف کا استعمال ضرورت سے زیادہ کیا ہے۔ بعض مقامات پر 'و' عطف کا استعمال نامناسب بھی معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے نثر عجیب طور پر بدمزگی پیدا کرتی ہے۔ 'و' عطف کا ایسا استعمال جو نامناسب لگتا ہے مجھے نہیں معلوم کہ وہ اب بھی حیدرآباد کی ٹکسالی زبان میں رائج ہے یا نہیں۔ اگر وہاں رائج ہے تو خوب ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً واقعات و تجربات، واقعات و حوادث، پرورش و فروغ، پرکھنا و سمجھنا، مستند و معتبر و مسلمہ، وغیرہ۔ ظاہر ہے پرکھنا و سمجھنا کے علاوہ دیگر ترکیبیں یہاں مناسب معلوم ہو رہی ہیں لیکن عبارت میں اس ترکیب کی بھرمار کم از کم مجھے اچھی نہیں لگی۔ مثال کے طور پر جملہ بھی درج ذیل ہے:

... اس کی تصویر ہم محسوس و دیکھ رہے ہیں۔ سب کچھ منظر و ماحول بدل گیا۔ انھوں نے تعلیم نسواں کے عنوان و موضوع پر پر اثر و عمدہ...

تبصروں کو ترتیب دینے کے لیے ناظم صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ناظم صاحب کی تحریروں کا بنیادی وصف مطالعے کی جستجو پیدا کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں ضرور بار آور ہوگی۔

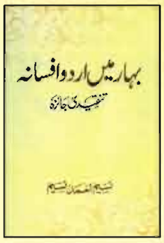


**بہار میں اردو افسانہ: تنقیدی جائزہ**

مصنف: نسیم احمد نسیم
صفحات: 178، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: الکوثر پبلی کیشن، دریاپور، سبزی باغ، پٹنہ
مبصر: ڈاکٹر محمد مرتضیٰ

بہار کی سرزمین قدیم زمانے سے علم و ادب کا مرکز رہی ہے۔ شاعری کی بات ہو یا اردو نثر نگاری کی یا پھر اردو تنقید و تحقیق کا میدان ہو بہار کے ادیبوں نے قابل قدر کام انجام دیے ہیں۔ بہار میں بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں اردو افسانے واضح طور پر ملتے ہیں۔ جسے ہم اردو افسانے کا دور اول کہتے ہیں۔ اس کے بعد ترقی پسندی کا دور آتا ہے۔ آزادی کے بعد کے حالات بدلے، زمانہ بدلا اور جینے کا ڈھب بھی یکسر تبدیل ہوگیا اور اس کے بعد افسانہ نگاری کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

زیر مطالعہ کتاب 'بہار میں اردو افسانہ' نسیم احمد نسیم کی نہایت دیدہ زیب اور بہار کے افسانہ نگاروں پر بطور خاص ایک جامع کتاب ہے۔ اس سے صوبائی سطح پر کام کرنے کی اہمیت اور افادیت دو چند ہوجاتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس اعتبار سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں کئی ایسے افسانہ نگاروں کا تذکرہ آیا ہے جن کا ذکر یا تو بہت کم ہوا ہے یا ہوا ہی نہیں۔ ساتھ ہی افسانہ نگار کی نفسیات، رجحانات، احساسات کا خیال کرتے ہوئے افسانہ نگاروں کے فکر و فن پر بھرپور بحث کی گئی ہے۔

مصنف نے اس کتاب کو مفید تر بنانے کے لیے اسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں بہار میں اردو افسانے کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ جس میں ابتدا سے حال تک کی افسانہ نگاری کے ارتقائی سفر کو پیش کیا گیا ہے۔ یلدرم اور جوش نے ترکی افسانوں کے ترجمے کیے اور اردو افسانہ کو نئے آسمان اور نئی زمین سے روشناس کرایا۔ بہار میں افسانہ نگاری کی ابتدا سہیل عظیم آبادی کے افسانے 'محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش' سے

ہی ہوتی ہے۔ دوسرے حصے میں بہار میں سماجی سیاسی اور ادبی صورت حال کا ذکر ہے۔ مصنف نے اس حصے میں جے پی تحریک 1974 کا ذکر کیا ہے جو آگے چل کر اپنے مقصد میں ناکام ہوگئی۔ لیکن بہار کے ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک سے متاثر ہوکر بہترین کہانیاں لکھیں۔ اس کے ساتھ ہی فسادات کا بھی ذکر کیا ہے جیسے بھاگل پور، پٹنہ سیٹی اور سیتامڑھی کے فسادات سے متاثر ہوکر کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ تیسرے حصے میں بہار کے نمائندہ افسانہ نگاروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں کچھ منتخب افسانہ نگاروں کی خدمات کا مختصراً جائزہ مصنف نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے جمیل احمد کندھاپوری کے یہاں مزدوروں اور محنت کشوں سے خاص لگاؤ نظر آتا ہے۔ غیاث احمد گدی کے یہاں جو درد، کسک، سچائی اور صاف گوئی ہے وہ محض افسانہ بنانے کے لیے نہیں ہے۔ کلام حیدری نے نہ صرف اپنے افسانوں میں حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا بلکہ وہ تکنیک اور ہیئت کی سطح پر بھی نت نئے تجربے کرتے ہیں۔ شین مظفر پوری نے نفسیاتی، سیاسی، سماجی اور جنسی ہر طرح کے افسانے تخلیق کیے۔ جن میں ایک پختہ اور رچا ہوا اسلوب ملتا ہے۔ شمیم صادقہ افسانہ نگاری میں اہم نام ہے ان کے افسانے فکری اور فنی پرواز کا ثبوت دے چکے ہیں۔ اعجاز شاہین کے یہاں بھی دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح عورتوں اور بچوں کی نفسیات، رہن سہن اور جذبات واحساسات کی عکاسی بھرپور طور پر دکھائی دیتی ہے۔ شوکت حیات کے یہاں احتجاج اور خود شناسی کا رجحان غالب ہے۔ عبدالصمد کے افسانوں میں سیاسی شعور کی پختگی جھلکتی ہے۔ حسین الحق کے یہاں زندگی کے متضاد اور مختلف پہلوؤں کی عکاسی نظر آتی ہے۔

غضنفر کے یہاں موضوع اسلوب اور تکنیک کی سطح پر اتنا پھیلاؤ اور وسعت ہے جتنا ان کے ہم عصروں میں کم ہی لوگوں کے یہاں ہے۔ مشرف عالم ذوقی جذباتی ہیں دوٹوک اور بے لاگ انداز رکھتے ہیں۔ فسادات اور نفسیات ان کا خاص میدان ہیں۔ ان کے علاوہ جن افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے ان کے یہاں بھی سماجی، مذہبی اور سیاسی مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

چوتھے اور آخری حصے میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت، احتجاجی لہجہ، جاگیردارانہ نظام کے بعد کا بحران، تکنیکی خصوصیات، خطابت کا انداز، بازیافت، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری جیسے پہلوؤں پر مصنف نے اچھی خاصی نظر ثانی کی ہے۔

نسیم احمد نسیم کی اس کتاب میں جن پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے وہ قابل ذکر ہیں جس کو پڑھ کر آنے والی نسلیں اپنے علم میں اضافہ کرسکیں گی۔

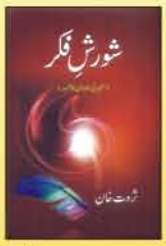

**شورش فکر** (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

مصنفہ: ڈاکٹر ثروت خان

صفحات: 320، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد عثمان احمد، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

شورش فکر ڈاکٹر ثروت خان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مصنفہ نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''میں بنیادی طور پر تخلیق کار ہوں'' ان کے تخلیقی اثاثے میں 'ذروں کی حرارت' (افسانوی مجموعہ 2004) ناول 'اندھیرا پگ' اہمیت کے حامل ہیں۔ زیر نظر کتاب میں قاری کو جگہ جگہ تخلیقی نثر کے نمونے ملیں گے خاص طور پر مضمون 'وارث علوی کی تنقید کے تخلیقی رموز' کتاب میں چوبیس مضامین ہیں اور کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب 'تانیثی ادب' دوسرا 'ادب عالیہ' تیسرا 'بیسویں صدی میں اردو ادب' اور چوتھے باب کا عنوان 'معاصر ادب' ہے۔

پہلے باب تانیثی ادب میں گیارہ مضامین ہیں سبھی مضامین توجہ طلب ہیں۔ چند مضامین ایسے ہیں جو اپنے موضوع اور عنوانات کی بنا پر قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں کامیاب ہیں۔ ان مضامین کے عناوین ہی سے مصنفہ کی منفرد سوچ اور وسیع مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ باب اول کے تین مضامین اول 'پنجابی کلچر اور ایک چادر میلی سی' میں لیٹی: رانو، دوم 'اردو کے تانیثی ادب میں طنز و مزاح کے عناصر' سوم 'میرا کا تصور عشق اور اس کی معنویت' آخرالذکر مضمون میں تصوف، بھگتی، صوفیائے کرام کے اقوال، اقبال و حافظ کے اشعار کے ذریعہ میرا بائی کے حقیقی عشق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ اپنی تحریروں میں نئی بات کہنے کی اور انفرادی زاویۂ نظر رکھنے کی شعوری کوشش کرتی ہیں، اور اس شعوری کوشش کا اظہار عنوان ہی سے ہونے لگتا ہے۔ نیز میرا بائی کے متعلق ڈاکٹر ثروت خان کی ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔

دوسرے باب 'ادب عالیہ' میں تین مضامین ہیں پہلا مضمون 'میواڑ کے صوفی سنتوں کی شاعری (شعری روایت کے پس منظر میں)' طویل مضمون ہے مجموعے کے انتیس صفحات پر مشتمل یہ مضمون قاری کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔

اسی باب میں دو مضمون اور ہیں جن کے عنوانات 'مراثی انیس میں انسانی رشتے اور معاصر شاعری میں ان کی تلاش' اور دوسرا مضمون 'غالب کی فکری جہت (کلام فارسی کے آئینہ میں)' ہیں۔ ان مضامین میں بھی موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے۔ مراثی انیس میں انسانی رشتے اور معاصر شاعری میں ان کی تلاش، میں معاصر شعرا کے بہترین اشعار درج کیے ہیں جو کہ مصنفہ کے علم اور ذوق کا پتہ دیتے ہیں۔ اہل علم کی نظر میں مراثی انیس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان میں انسانی جذبات کی آئینہ داری کی گئی ہے۔ اسی طرح کے جذبات کو مصنفہ نے معاصر شعرا کے یہاں تلاش کیا ہے اور وہ اس تلاش میں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں:

حضرت حُر کی شہادت پر ایک حقیقی بہن کی طرح حضرت زینبؓ کچھ اس طرح بین کرتی ہیں:

زینب یہ روئی شہ کے فدائی کے واسطے
جیسے بہن تڑپتی ہے بھائی کے واسطے

اس شعر میں بہن بھائی کے رشتے سے متعلق انیس نے جو بات کہی ہے، اس کی مثال مصنفہ نے معاصر شعرا میں ندا فاضلی کی نظم سے دی ہے جس سے قاری کو اتفاق بھی ہوسکتا ہے اور اختلاف بھی۔

تیسرا باب 'بیسویں صدی میں اردو ادب' میں چار مضامین ہیں۔ معاصر ادب میں پانچ مضامین اور 'ثروت کی کہانی میری زبانی' کے عنوان سے مختصر مگر اہم آپ بیتی ہے۔ چونتیس صفحات پر مشتمل اس آپ بیتی میں مصنفہ نے بچپن سے لے کر آپ بیتی لکھنے تک کے واقعات کو بڑے سادے اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ اس آپ بیتی کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں دوسری خاتون ادیباؤں کی طرح تہذیب کی دیواریں نہیں گرائی ہیں، نہ ہی مصنفہ نے بلاوجہ معاشرے کی دھجیاں اڑائی ہیں کیوں کہ مصنفہ کے بقول:

جس طرح خود نوشتوں میں تسلیمہ نسرین، امرتا پریتم یا ہندی یا دیگر زبان کی ادیباؤں نے جنسی معاملات کو پرکشش انداز میں قارئین کے سامنے رکھا۔ کیا ادب کو اس سے کوئی فائدہ پہنچا۔ کوئی اضافہ ہوا؟ آخر تہذیبی قدریں بھی کوئی شے ہے۔ مانا کہ یہ ادیب کی زندگی کا ایک رخ ہے۔ اس کے لاشعور کی گرہیں اور نفسیات کی پیچیدگیوں تک پہنچنے کا وسیلہ، لیکن محض گلیمر پیدا کرنے کے لیے ایسی شیرینی کے چٹخارے وہی لوگ دیتے اور لیتے ہیں جنھیں ادب کے معیار کی پرواہ نہیں ہوتی۔ مشتہر کرنے کو جمالیات سے تعبیر نہیں

کیا جاسکتا۔ اس بات کا خیال ضروری ہے کہ کیسے، کیا اور کتنا لکھنا چاہیے۔ ادب کے میدان کے سپاہی کو اگر اس کا شعور نہیں تو پھر ادب بھی گھر گھر میں غلاظت پروسنے کے ترسیلی ذرائع ٹی۔وی۔انٹرنیٹ وغیرہ کی فہرست میں شمار ہوتا چلا جائے گا۔ (صفحہ نمبر 315 تا 316)

پیش نظر کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ثروت خان کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے اور وہ ادب کے مطالعے کا ماحصل بہترین انداز میں پیش کرسکتی ہیں۔ امید ہے کہ اردو ادب کے حلقے میں اس کتاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ اس خوبصورت کتاب کے لیے میں ڈاکٹر ثروت خان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

## اردو کی اہم خواتین افسانہ نگار

مصنف: ڈاکٹر رخسانہ جمیل

صفحات: 184، قیمت: 90 روپے

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: صدف اقبال، پوسٹ بھدیہ، بارہ چٹی، ضلع گیا (بہار)

اردو کی اہم خواتین افسانہ نگار ڈاکٹر رخسانہ جمیل کی تنقیدی کتاب ہے۔ جس میں صوبہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب میں پروفیسر عتیق اللہ اور ڈاکٹر کوثر مظہری کی رائے بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں بہار کی 27 افسانہ نگاروں کا طویل اور مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ بہار نے نہ صرف بڑے مرد افسانہ نگار پیدا کیے بلکہ خواتین افسانہ نگاروں کی بھی ایک لمبی فہرست نظر آتی ہے۔ اگر ہم چند ناموں پر غور کریں تو شکیلہ اختر، اعجاز شاہین، ذکیہ مشہدی، شمیم صادقہ، قمر جہاں ایسے نام ہیں جنھیں ملک گیر سطح پر جانا جاتا ہے۔ دوسری صف میں شمیم افزا قمر، شیریں نیازی، اشرف جہاں، تبسم فاطمہ اور تسلیم کوثر وغیرہ کو ہم رکھ سکتے ہیں۔ باقی خواتین افسانہ نگاروں نے اس طرح کا کوئی افسانہ نہیں لکھا جسے ہم یاد رکھ سکتے ہیں۔

بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں جہاں شکیلہ اختر اوّلین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتی ہیں وہیں مبینہ امام اور کہکشاں انجم حال کے دنوں میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ اس موضوع کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے گوشے میں بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کے اردو افسانے کا ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم میں بہار کی خواتین کے اردو افسانے جھارکھنڈ کی تشکیل کے بعد کیا صورتِ حال رہی ہے اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اس میں ذکیہ مشہدی، شمیم افزا قمر، نزہت پروین، ڈاکٹر اشرف جہاں، تسلیم کوثر، کہکشاں پروین، نشاط افزا اور تبسم فاطمہ ایسی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے خواتین افسانہ نگاروں میں اپنا مقام بلند کیا ہے۔ تیسرے باب میں خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے کے موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں افسانہ نگاروں کی زبان اور اسلوب پر بات کی گئی ہے۔

اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر جیسی افسانہ نگار بہار نے پیدا نہیں کی۔ لیکن شکیلہ اختر کو ہم ایک اہم افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں تک میرا ماننا ہے کہ شکیلہ اختر کا قد اختر اورینوی کی وجہ سے بھی اس طرح نہیں نکلا جس طرح نکلنا چاہیے تھا۔ اختر اورینوی اردو کے مشہور افسانہ نگار گزرے ہیں اور شکیلہ اختر ان کی اہلیہ تھیں۔ اس لیے وہ مقام حاصل نہیں کرسکیں جو انھیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ اسی گھر میں ایک ہی صنف میں دو فنکار بیک وقت بلندی کو شاید ہی چھوتے ہیں۔

اس کتاب میں جتنی بھی خواتین افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ تشنہ ہے۔ جن افسانہ نگاروں کے ایک یا دو افسانوی مجموعے شائع ہوچکے تھے یا جنھوں نے اپنا مقام بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں بنا لیا تھا اس پر تفصیلی گفتگو کرنی چاہیے تھی۔ جن کے افسانوی مجموعے شائع نہیں ہوئے ان کے افسانوں کو ڈھونڈ کر نکالنا چاہیے تھا اور ان افسانوں پر بات کرنی چاہیے تھی۔ اس کے باوجود یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ ابھی تک بہار کی خواتین افسانہ نگاروں پر کوئی قابل ذکر کتاب سامنے نہیں آئی تھی یہ کتاب یقیناً آگے کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

## پتھر جیسے لوگ

مصنف/ ناشر: محمد قیوم میو

صفحات: 119، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2013

مبصرہ: بی بی شفقت آرا، A-128، تھرڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت اور خوبصورتی اس کا اختصار یعنی مختصر ہونا ہے۔ دوسرے لفظوں میں افسانہ کہتے ہی ہیں مختصر کہانی کو۔ مگر ہر مختصر افسانہ بھی افسانہ نہیں ہوتا۔ مختصر افسانہ ادب کی وہ صنف ہے، جس کی اپنی ایک فنی ترتیب، جمالیاتی اصول، معیار اور قدریں ہوتی ہیں اور افسانہ اپنی ان ہی اصولی قدروں سے پہچانا جاتا ہے۔ غیر ضروری لفاظی اور کاریگری دکھانے کے شوق میں اکثر افسانے غیر ضروری طوالت کا شکار ہوکر افسانے کے دائرے سے خارج ہوجاتے ہیں۔ مشہور افسانہ نگار محمد قیوم میو کی کتاب 'پتھر جیسے لوگ' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ معروف وقابل ناول نگار نے بھی اختصار سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیق میں افسانے کی مقبولیت کے تمام میزان کو ملحوظ رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ افسانہ آج بھی وہی قبولیت سے سرفراز ہوتا ہے جو اصلاح سماج ومعاشرہ پر مبنی ہوتا ہے۔ محمد قیوم میو کے افسانوں میں جا بجا معاشرہ کے مسائل ومشکلات نظر آتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'پتھر جیسے لوگ' کے مصنف اور مشہور افسانہ نگار محمد قیوم میو کی ایک ہزار سے زائد افسانوی نگارشات ہندوپاک کے موقر رسائل واخبارات میں شائع ہوچکی ہیں جو ان کی مقبولیت کی ایک مثال ہے۔ افسانہ نگار محمد قیوم میو عصر حاضر کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں اپنا ایک منفرد مقام ومرتبہ رکھتے ہوئے زبوں حال اور ستم رسیدہ اردو زبان کی آبیاری کررہے ہیں۔ ان کی تحریر سے اندازہ لگتا ہے کہ آئندہ بھی یہ آبیاری کرتے رہیں گے۔ ان کے افسانوں میں سماج کی صحت مند اور ہمدردانہ تنقید کا جذبہ کارفرما ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے میں سماجی حقیقت نگاری کی جھلکیاں ہیں اور کہیں کہیں تلخ طنز بھی ہے۔ ان کے یہاں منظر نگاری کم ہے۔ ان سب کے علاوہ ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کہانی میں کوئی پیچیدگی اور بالیدگی نہیں ہے۔ زبان بالکل سلیس، روزمرہ بولی جانے والی اور رواں ہے۔ اس کے علاوہ موصوف کے چار عدد ضخیم افسانوی مجموعے 'بہار اورخزاں'، 'رشتوں کا کرب'، 'ماڈرن اولادیں' اور 'ننھی گڑیا' جو بچوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے منظر عام پر آکر صرف اپنی جگہ نہیں بنائے ہیں بلکہ ادب کے متوالے کو فیضیاب کررہے ہیں۔ موصوف کے متعدد افسانے آکاش وانی آگرہ سے بھی نشر ہوئے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف ادبی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف اس فن میں منفرد مقام کی تلاش میں ہمہ تن مصروف رہ کر اپنی بلند وبرتر نگارشات اور مجموعے کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب 'پتھر جیسے لوگ' (افسانوی مجموعہ) کی زبان نہایت عام فہم اور انبساط وکرب کا آئینہ ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں صاحب کتاب نے چند مسائل جیسے گلوبل وارمنگ، موسمیاتی تبدیلی، ماحولیاتی کثافت اور بچہ مزدوری سمیت کئی دیگر مسائل پر اپنے قلم وبیان کے ذریعے بحث کی ہے جو کافی حد تک مقبول بھی ہوئی ہے۔

119 صفحات پر مشتمل یہ ادب پارہ 'پتھر جیسے لوگ' افسانہ نگار محمد قیوم میو کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں 28 افسانے شامل ہیں۔ موصوف کا شماران حساس کہانی کاروں میں ہوتا ہے، جو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہیں، افسانہ آج بھی وہی قبولیت سے سرفراز ہوتا ہے جو اصلاح سماج ومعاشرہ پر مبنی ہوتا ہے، قاری اس میں اپنے مسائل ومشکلات کو ڈھونڈتا ہے۔ 1980 کے بعد کے افسانہ نگاروں نے افسانے میں کہانی پن کی واپسی کا اعلان کرتے ہوئے ایسے افسانے لکھے جو کسی تحریک یا رجحان کی قید سے یکسر آزاد ہیں۔ محمد قیوم میو کے افسانوں میں جا بجا معاشرے کے مسائل ومشکلات نظر آتے ہیں۔

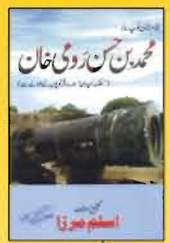


## نظامِ شاہی توپ ساز **محمد بن حسن رومی خان**

('ملک میدان' اور دیگر توپوں کے حوالے سے)

تحقیق وتالیف: اسلم مرزا

صفحات: 80، قیمت: 125 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: نوائے دکن پبلی کیشنز، رشید پورہ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

مبصر: ڈاکٹر شکیل احمد خان، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ انگریزی، متسیودری کالج، جالنہ

اسلم مرزا کی تازہ تصنیف 'نظام شاہی توپ ساز محمد بن حسن رومی خان ('ملکِ میدان' اور دیگر توپوں کے حوالے سے)' جون 2013 میں منظر عام پر آئی ہے۔ زیر نظر کتاب جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ملک میدان نامی توپ اور اس کے خالق محمد بن حسن رومی خان کے گرد گھومتی ہے لیکن چونکہ دونوں کا تعلق سیاسی تاریخ سے ہے لہٰذا معاصر بادشاہوں، قلعوں اور لڑائیوں کا پس منظر نہایت عرق ریزی سے پیش کیا گیا ہے۔ نہایت اختصار لیکن جامع انداز میں پیش کی گئی اس تحقیق میں صرف حقائق پر انحصار کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ عرق ریزی، حقائق پر انحصار اور دیانت دارانہ کوشش کا ثبوت 'حوالے، تشریحات اور تعلیقات' کا باب ہے جو کتاب کی ضخامت کے نصف حصے پر مشتمل ہے۔

کتاب کا موضوع اگرچہ علمی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مخصوص شعبوں سے متعلق چنندہ اشخاص کو ہی اس میں دلچسپی ہوسکتی ہے لیکن مذکورہ تصنیف کو خالص علمی، خشک اور تکنیکی تحریر سمجھ کر آگے بڑھ جانا مناسب نہیں کیونکہ اپنے تکنیکی موضوع کے باوجود ادبی چاشنی، ڈرامائیت اور سادہ وسلیس اور بامحاورہ زبان کا استعمال اسے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق افراد کے لیے دلکش بنا کر اس میں دلچسپی لینے پر مجبور کرتا ہے۔ مزید برآں خوبصورت اور متعلقہ بیالیس تصاویر کی شمولیت کے باعث کتاب نہ صرف نا قابل مطالعہ ہے بلکہ قابل دید بھی۔

اسلم مرزا نے معروضی تاریخی حقائق کو جذب کر کے Subjective انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں حقائق اور حساسیت کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے جو اس کتاب کی خوبی بھی ہے اور انفرادیت بھی۔

دکن میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد احمد نگر کی نظام شاہی، بیجاپور کی عادل شاہی، بیدر کی برید شاہی، برار کی عماد شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی وجود میں آئیں۔ ملک احمد نظام شاہ بحری نے 1486 میں خود مختاری کا اعلان کر کے 1490 میں احمد نگر کی بنیاد ڈالی۔ 1510 میں تخت نشین ہوئے، اس کے بیٹے برہان نظام شاہ کے عہد میں رومی خان کا نام سامنے آتا ہے۔

برہان نظام شاہ کے ہی دور میں اور اسی کی ہدایت پر رومی خان نے 1549 میں ملکِ میدان توپ ڈھالی۔ رومی خان چونکہ تقریباً نظام شاہوں کے 'میر آتش' کے عہدے پر فائز رہے اور ان کی ڈھالی ہوئی توپوں نے ان شاہوں کی لڑائیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے توپوں اور اس کے خالق کے بیان کے ضمن میں اس عہد کی مختصر مگر واضح سیاسی تاریخ بھی زیر بحث آگئی ہے۔ برہان نظام شاہ دوم کے بعد احمد نگر میں طوائف الملوکی پھیل گئی اور چاند بی بی کے قتل کے بعد قلعۂ احمد نگر کو مغلوں نے فتح کر لیا۔ اس صورت حال میں ملک عنبر نے برہان نظام شاہ اول کے پوتے مرتضیٰ نظام شاہ دوم کو قلعہ پرانڈہ میں تخت نشین کیا۔ 1609 میں ملک عنبر نے مغلوں کو شکست دے کر قلعہ احمد نگر اور ملکِ میدان توپ پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں توپ کو قلعہ دولت آباد پر رکھا اور قلعۂ شولا پور کی فتح کے بعد اسے پرانڈہ بھیج دیا۔ ملک عنبر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا فتح خان نظام شاہی سلطنت کا دار المہام بن بیٹھا اور اسی نے 1632 میں نظام شاہ کو زہر دے کر مار ڈالا۔ اس دوران قلعۂ پرانڈہ کے گورنر آقا رضوان نے عادل شاہ سے ساز باز کر کے قلعۂ پرانڈہ اس کے حوالے کر دیا۔ بعد ازاں محمد عادل شاہ کے حکم پر ملکِ میدان بیجاپور پہنچ کر شرزہ برج پر متمکن ہوگئی۔ بعد کے ادوار میں کئی صاحب اقتدار ہستیوں نے اسے حاصل کرنے اور یہاں سے منتقل کرنے کی ناکام کوششیں کیں۔ دکن میں آمد کے بعد اورنگ زیب نے اسے کافی اہمیت دی اور 1686 میں نظام علی خان نے پونہ کے پیشوا سے شکست کھا کر یہ علاقہ اسے سونپ دیا۔ پیشوا نے ملکِ میدان کو پونہ منتقل کرنے کی کوشش کی مگر 1718 میں انگریزوں نے پیشوا سے بیجاپور کا علاقہ چھین لیا۔ 1823 میں انگریزوں نے بھی توپ کو انگلینڈ بھجوانے کی ناکام کوشش کی۔

مندرجہ بالا ادوار کی طویل تاریخ کو اختصار لیکن درکار تسلسل اور صرف ضروری تفصیلات کو استعمال کرتے ہوئے نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے، گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی اس عہد میں استعمال ہونے والے آلاتِ حرب اور اُن سے متعلق افراد کے لیے مستعمل اصطلاحات کا معلوماتی تذکرہ بھی کیا ہے۔

آخر میں احمد نگر شہر میں رومی خان کی تعمیر کردہ رہائشی حویلی، مکہ مسجد اور مقبرے کا ذکر اور ان کی موجودہ زبوں حالی کا بیان ہے جو کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔

غرض مختلف ظاہری و باطنی خوبیوں سے مزین ماضی کی روشنی میں مستقبل کی طرف قدم بڑھانے کے لے مہمیز کا کام کرتی ہے۔ علمی و تحقیقی کام کرنے والے افراد اور لائبریریوں کے لیے ایک قابل قدر تحفہ ہے۔ عمدہ ونفیس کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب وطباعت دیدہ زیب اور خامیوں سے مبرہ ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے!

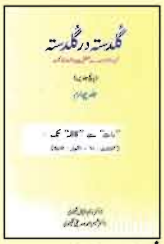


## **گلدستہ درگلدستہ** (جلد چہارم)

مرتبین: ڈاکٹر وسیم اقبال نگینوی، ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی نگینوی

صفحات: 352، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت 2014

مبصر: انجینئر محمد فرقان سنبھلی، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مافی الضمیر کا اظہار اور اس سے جمالیاتی انبساط حاصل کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ زبان کی ابتدا کے بعد سے ہی اپنی خواہشات، خارجی زندگی سے تعلقات کی نوعیت اور قلبی واردات کی عکاسی انسان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ کرۂ ارض پر انسانی معاشرے کی تشکیل کے ساتھ ہی لوک ادب کی تخلیق کا آغاز ہو گیا تھا۔ جس کا سرچشمہ انسان کا اجتماعی لاشعور تسلیم کیا گیا۔ 'یونگ' کا خیال ہے کہ اجتماعی لاشعور میں کارفرما قوتیں اپنا بھرپور، بے لاگ اور بے باک اظہار خوابوں، دیومالاؤں اور مختلف ادب پاروں بالخصوص لوک ادب کی تخلیقی شکل میں کرتی ہیں۔ بیت بازی لوک ادب کی دلچسپ اور مقبول عام صنف ہے۔ بیت بازی کو فروغ تب حاصل ہوا جب کہ روہیل کھنڈ میں روہیلہ سردار داؤد خاں روہیلہ کی ریاست قائم کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ اس دوران افغانستان سے تجارتی قافلے روہیل کھنڈ آ جا رہے تھے۔ 1776 میں جب نواب فیض اللہ خاں نے رام پور کو اپنا دارالریاست بنایا تو بہت سے سرحدی

قبائل یہاں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ رامپور میں آباد ہونے والے افغانیوں میں عالم دین، ادیب اور شعرا وغیرہ کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں کم علم، کاشت کار، تاجر اور سپہ گر شامل تھے۔ یہ محنت کش پختون دن بھر محنت مزدوری کرتے اور رات کو ایک جگہ جمع ہو کر ہنسی مذاق کرتے، خبروں کا لین دین ہوتا اور بیت بازی کا لطف لیا جاتا تھا۔ عبدالکریم خاں غزنوی بیت بازی کے کہنہ مشق استاد تھے اور افغانستان سے بعض دوستوں کی فرمائش پر رام پور میں آکر بس گئے تھے۔ انھیں پشتو اور اردو پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے اردو میں جو سرمایہ پیش کیا وہ قابل ذکر ہے حالانکہ ان کے پشتو کے سرمایے کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

ڈاکٹر وسیم اقبال نگینوی کی کتاب 'گلدستہ درگلدستہ' تین سو عنوانات پر مشتمل چیدہ اشعار کا مجموعہ ہے۔ بیت بازی کو فروغ دینے کے سلسلے کی یہ اہم کتاب ہے جس کی تین جلدیں شائع ہو کر نہایت مقبول ہوئی تھیں، اب ان کی چوتھی جلد 'رات سے قافلہ تک' منظر عام پر آئی ہے اس کتاب میں 60 عنوانات قائم کرتے ہوئے کل 2712 اشعار جمع کیے گئے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ایک عنوان کے تحت شامل کیا گیا شعر دوسرے عنوان کے کسی بھی زمرے میں دہرایا نہیں گیا ہے۔ کتاب کا انتساب ڈاکٹر وسیم نگینوی نے 50 معروف شعرا کے نام ایک صفحے کی دلچسپ تحریر کے ذریعے کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے خیال سے متفق ہوا جاسکتا ہے جس کا اظہار انھوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وسیم نگینوی نے خرد و جواں کی شعری تربیت کے لیے قدیم و جدید شعرا کے رنگارنگ کلام پر مشتمل کئی جلدیں پیش کی ہیں جو بظاہر بیت بازی کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہیں مگر ان کے اندرون میں ادبی شوق کو نکھارنے یا جلا دینے کی مخلصانہ کوشش کارفرما ہے۔ کتاب کا روشن پہلو یہ ہے کہ اس چوتھی جلد میں 136 نئے شعرا کے اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے یہ وہ شعرا ہیں جو کہ پہلی جلدوں میں شامل نہیں تھے۔ جلد چہارم کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں ہر رنگ ہر فکر کے شاعر کو جگہ دی گئی ہے۔ ان میں اگر میر، مومن، ذوق، داغ، غالب، اقبال، فیض اور فراق جیسے شعرا کے اشعار شامل کیے گئے ہیں تو دوسری جانب یہ سلسلہ مجاز، جوش، جگر مرادآبادی، شکیل بدایونی، احمد فراز، رفعت سروش، ملک زادہ منظور احمد، وسیم بریلوی، بشیر بدر، منور رانا سے ہو کر مجاہد فراز تک چلا آیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر وسیم اقبال نگینوی نے اردو شاعری کی تاریخ کے تمام معتبر شعرا کے کلام کو پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ڈاکٹر وسیم نگینوی نے کلاسیکی، رومانی اور ترقی پسند دور کے شعرا سے لے کر جدید شعرا تک کے انتخاب کو اس انداز میں مرتب کیا ہے کہ بیت بازی کے شوقین اس کا بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آخیر میں 'گلدستہ درگلدستہ' جلد چہارم کے ان 134 نئے شعرا کا انڈیکس بھی شامل کر دیا ہے جس سے ان شعرا کے اشعار کو بہ آسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ سادہ لیکن پرکشش پیپر بیک ایڈیشن کا ٹائٹل کور (Title Cover) مواد کی نوعیت کے اعتبار سے معقول قیمت 'گلدستہ درگلدستہ' کی دیگر خصوصیات ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر وسیم نگینوی کی یہ چوتھی جلد بھی دیگر تین جلدوں کی طرح مقبولیت حاصل کرے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیت بازی کے شوقین اور معیاری اشعار سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص کے لیے یہ کتاب بہترین تحفہ ہے۔

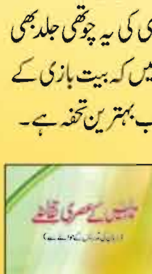

## تدریس کے عصری تقاضے

مصنف: محمد فاروق انصاری

صفحات: 135، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: گولڈن گرافک اینڈ پرنٹرس، دہلی

مبصر: عادل احسان، 210 جھیلم ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

تعلیمی اور تدریسی ادارے ذہن انسانی کی تعمیر و تشکیل کے کارخانے ہیں۔ انسانی زندگی کو سلیقے اور قرینے عطا کرنے اور ایک آدمی کو انسان یا شخصیت کے زمرے میں لا کھڑا کرنے کے لیے تعلیم و تدریس کی اہمیت ایسی ہے جیسے کہ انسانی جسم کے لیے دماغ کی۔ عصر حاضر میں درس و تدریس نے واقعی ترقی کی راہیں طے کی ہیں اور مسلسل ارتقا کی منزلوں پر گامزن ہے۔

محمد فاروق انصاری کی مرتب کردہ اس کتاب میں تعلیم کے متعلق بہت ہی معنی خیز باتیں بتائی گئی ہیں۔ اس میں تدریس کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے تعلیم کو ایک نئے دور میں لا کھڑا کر دیا ہے جس سے یہ کتاب ایک نئے زاویے کا پتہ دیتی ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں درس و تدریس کے تقاضوں کے حوالے سے بحث کی ہے جس میں تعلیم کو زندگی کا سب سے بڑا تقاضا بتایا ہے۔ کیونکہ بغیر تعلیم کے کسی انسان کے اندر وہ انسانیت نہیں آسکتی جو ایک انسان کے اندر ہوتی ہے یعنی انھوں نے تعلیم کی پہلی پاٹ شالا ماں کی گود کو بتایا ہے کیونکہ ایک بچہ اپنی ماں سے ہی جو سیکھتا ہے وہ اس کی سب سے پہلی تدریس ہوتی ہے۔

مصنف کا ماننا ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں میں تعلیم و تعلم کے عمل سے متعلق بہت ساری تحقیقات ہوئی ہیں اور نئے نئے نتائج سامنے آئے ہیں جس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ درس و تدریس نے اس میدان میں نئی نئی تکنیک سے لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔ تدریس کے نئے طریقے اور تکنیکیں بھی وضع کی گئی ہیں۔ پیاجے، وائگوٹسکی، نوک، ہانکس، پوزنر جیسے ماہرین نے اپنی اپنی تحقیقات کا موضوع ہی اسے بنایا کہ طلبا کے اندر کس طرح کے علم کی تعمیر کو رائج کیا جائے اور استاد اپنے طلبا کے اندر کس طرح اپنے تصورات کی رہنمائی کرتے ہیں۔

تدریس کے عصری تقاضے میں مرتب نے کل تیرہ مقالات کو جمع کیا ہے۔ یہ مقالات بیشتر ایسے اشخاص کے ہیں جو درس و تدریس سے منسلک ہیں اور اس شعبہ زندگی پر ان کی خاصی گہری نگاہ ہے۔ یہ مضامین ان کے تجربات اور معلومات و مشاہدات کے حامل ہیں۔ تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کے اعمال و آثار کو ان مضامین کی روشنی میں مختلف زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ محرکات بہت مفید و سودمند ہیں۔ کتاب میں شامل اوّلین تین مضامین محمد فاروق انصاری کے ہیں۔ تدریس کے تقاضے میں انھوں نے موجودہ عہد کے تناظر میں تدریس کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ یہ عمل جدید عہد کے تقاضے سے ہم آہنگ ہو۔ ایسا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اسے متحرک اور موثر بنا کر اس کے فوائد کو عام کیا جائے اور بہتر سے بہتر نتائج برآمد کیے جاسکیں۔ مرتب موصوف کا دوسرا مضمون متن کی قرأت سے متعلق ہے۔ اس سے زبان دانی اور اندازۂ قدر کے اصول و آداب آتے ہیں۔ تیسرا مضمون 'تعمیر پسندی اور تدریس' ہے۔ کتاب میں شامل مضامین۔ اردو ذریعہ تعلیم از محمد نعمان خاں، اردو رسم الخط کی تدریس از بشیر احمد انصاری، تحریری تدریس کا طریقہ کار از غضنفر علی، زبان کی تدریس اور تفہیم از راجیس مشرا، اردو زبان کی تدریس میں جدید طریقوں اور تکنیکوں کا استعمال۔ ایک مطالعہ از محمود صدیقی، حق تعلیم ایکٹ اور اردو تدریس از رضوان الحق موضوع سے متعلق اور بے حد اہم ہیں۔ علاوہ ازیں مقالہ علمی تحقیق، درسی کتاب اور اس کا ارتقا، تراجم کی صورت حال، تخلیقی صلاحیتوں کی تربیت، بالترتیب مقالہ نویس زبیدہ حبیب، قاسم خورشید، محمد حسن فاروقی بھی قابل قدر اور استفادے کے لائق ہے۔

محمد فاروق انصاری کی کتاب 'تدریس کے عصری تقاضے' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تدریس سے متعلق بہت ساری معلومات فراہم کی گئی ہیں اور تعلیم و تعلم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بے حد اہم ہے۔ اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کرنے کے لیے مصنف نے بہت ہی معنی خیز باتیں بتائی ہیں جس سے کتاب کی اہمیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

# عالمی اردو نامہ

## ساتویں عالمی اردو کانفرنس

**کراچی:** اردو کے ممتاز فکشن نگار انتظار حسین نے کہا کہ تحریک پاکستان کے رہنما نہیں دیکھ سکے کہ اردو کو قومی زبان بنانے کے نتائج کیا ہوں گے۔ وہ کراچی میں جاری سکے کہ اردو زبان کو قومی زبان بنانے کے نتائج کیا ہوں گے۔ ان کا کہنا تھا بابائے اردو مولوی عبدالحق جب پاکستان آگئے تو ہندوستان والے پریشان ہوگئے کہ ہماری

ساتویں عالمی اردو کانفرنس سے خطاب کررہے تھے۔ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں جاری چار روزہ ساتویں عالمی اردو کانفرنس کے دوسرے روز پانچ اجلاس ہوئے اور اختتام محفل موسیقی پر ہوا۔ دوسرے روز کے پہلے اجلاس کا موضوع 'اردو کا جدید ناول اور افسانہ' تھا جس سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ ناول اور افسانہ آج کے جدید دور میں ادب کے لیے ناگزیر صنف بن گیا ہے۔ اجلاس کی مجلسِ صدارت انتظار حسین، عبداللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ، اسد محمد خان، مسعود اشعر، نجم الحسن رضوی، انیس اشفاق، زاہدہ حنا، فرحت پروین پر مشتمل تھی جبکہ نظامت کے فرائض عرفان جاوید نے انجام دیے۔ معروف افسانہ نویس زاہدہ حنا نے کہا کہ افسانے کی دنیا میں خواتین نے ان اہم اور تلخ موضوعات پر بھی لکھا ہے جن پر لکھتے ہوئے مرد قلم کار بھی گھبراتے ہیں۔ نجم الحسن رضوی، انیس اشفاق، اخلاق احمد، عنبرین حسیب عنبر نے فکشن سے متعلق موضوعات پر پرمغز گفتگو کی۔

'اردو زبان کو درپیش مسائل اور اس کا مستقبل' کے موضوع پر ہونے والے سیشن کے صدر الصدور ممتاز فکشن نگار انتظار حسین نے کہا کہ اردو کو سب سے زیادہ نقصان تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں نے پہنچایا وہ یہ نہیں دیکھ اردو کا اب کیا بنے گا؟ تو یہاں لوگوں نے برجستہ کہا کہ فکر کی بات نہیں وہاں اردو کے لیے لتا منگیشکر موجود ہیں۔ ہندوستان سے آئے مندوب ڈاکٹر قاضی افضال حسین نے کہا کہ ہم نے یہ تصور کرلیا ہے کہ گلوبلائزیشن پر گرفت کرلیں گے مگر ہم نہیں جانتے کہ اس کوشش میں ہم گلوبلائزیشن کا شکار ہوچکے ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر فاطمہ حسن، ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اظہار خیال کیا۔

بیادِ رفتگاں کے عنوان سے ہونے والے تیسرے اجلاس میں معروف ادیب وشاعر کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے احمد ندیم قاسمی پر بات کی اور کہا کہ ان میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور حس مزاح بہت زبردست تھی۔ اس اجلاس میں شفیع عقیل پر احفاظ الرحمٰن کا مضمون علی احمد خان نے پڑھا۔ جاذب قریشی نے سلیم احمد کی شخصیت کا جائزہ لیا۔ اظہر عباس ہاشمی نے سرشار صدیقی کو یاد کیا۔ ڈاکٹر آصف فرخی نے محبوب خزاں کے بارے میں بات کی اور مصور شاہد رسام نے صادقین کے نقوش تازہ کیے۔ 'اردو کی نئی بستیاں اور تراجم کی روایت' کے عنوان سے ہونے والے چوتھے اجلاس میں صدر الصدور معروف شاعر و دانشور امجد اسلام امجد نے تراجم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس کے بغیر نہ ہماری بات دنیا تک پہنچے گی اور نہ ہی دنیا کی ہم تک۔ اجلاس میں ارشد فاروق، نصر ملک، خلیل طوق آر، ابراہیم محمد ابراہیم، اشفاق حسین، سعید نقوی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے دن کا پانچواں اجلاس مقبول شاعر جاوید اختر کے شعری مجموعے 'لاوا' کی تقریب اجرا تھی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 19 اکتوبر 2014

## واشنگٹن میں سرسید ڈے کا انعقاد

**علی گڑھ:** علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کے 197 ویں یومِ پیدائش کے موقعے پر دنیا بھر میں پھیلے اے ایم یو کے سابق طلبا نے یوم سرسید کا انعقاد کرکے اس عظیم مصلح قوم اور جدید ہندوستان کے معمار کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ امریکہ کے واشنگٹن ڈی سی میں مصطفیٰ ہاشمی اور ڈاکٹر افشاں ہاشمی نے یوم سرسید کا انعقاد کرکے مسلم طبقے کی فلاح کے لیے کیے گئے ان

کے کارناموں کو سراہا۔ اے ایم یو کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ر) نے ڈاکٹر افشاں ہاشمی کو ارسال کردہ اپنے پیغام میں کہا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کی صفِ اوّل کی یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے اور اس ادارے نے مختلف میدانوں میں عظیم ہستیاں پیدا کی ہیں۔ انھوں نے توقع کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر افشاں ہاشمی طلبا کو بہتر روزگار حاصل کرنے میں معاونت فرمائیں گی۔ ویلکم ٹرسٹ اور ڈی بی ٹی انڈیا ایلائنس کے سی ای او ڈاکٹر شاہد جمیل نے سرسید کے افکار ونظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ تحریک کے ابتدائی ایام میں شروع کیے گئے ترجمے کے عمل کو پھر سے جلا بخشنے کی ضرورت ہے۔ پروگرام کی صدارت ایمبیسڈر اسلام اے صدیقی نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اکتوبر 2014

## اردو اکادمی جدہ کی جانب سے ڈاکٹر منظر حسین کو استقبالیہ

**جدہ:** 10 اکتوبر 2014 کو اردو اکیڈمی جدہ کے چیئر مین سید جمال قادری، سکریٹری جناب سلیم فاروقی اور دیگر اراکین کی جانب سے ڈاکٹر منظر حسین، صدر شعبۂ اردو،

رانچی یونیورسٹی رانچی، کو استقبالیہ دیا گیا۔ واضح ہو کہ تقریباً دو دہائیوں میں اردو اکیڈمی جدہ، مختلف علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی خدمات انجام دے رہی ہے۔ اکادمی کے صدر جناب سید جمال قادری نے کہا کہ اردو اکادمی جدہ آندھرا پردیش کے مختلف اردو میڈیم اسکولوں کے طلبا و طالبات کو مالی تعاون پیش کر رہی ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں میں Uniform کی تقسیم Mid Day Meal کا نظم بھی کر رہی ہے۔ جدہ میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے مختلف علمی و ادبی پروگرام منعقد کیے جا رہے ہیں۔ خصوصاً 11 نومبر کو یوم تعلیم کے موقعے پر جدہ کی مختلف یونیورسٹیوں سے طلبا و طالبات کی ایک بڑی تعداد Essay Comp etition, Quize Competition، تقریری پروگرام وغیرہ میں حصہ لے کر انعامات کے مستحق ہوتی رہتی ہے۔ Top کرنے والے طلبا کو Gold Med al دیا جاتا ہے۔ طلبا و طالبات اور اردو کے شائقین کے لیے جناب سید جمال قادری اور جناب سلیم فاروقی کی کاوشوں سے ایک دارالمطالعہ کا قیام عمل میں آیا ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں علمی ادبی اور دینی کتابیں موجود ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر منظر حسین نے ان حضرات کی خدمات اور اردو کے تئیں ایثار و قربانی کے لیے انہیں مبارک باد پیش کی اور بتایا کہ ہندوستان میں بھی اردو کے فروغ کے سلسلے میں اتنا بڑا کام نہیں ہو رہا ہے۔ آپ ریگستان میں پھول کھلا کر نئی نسلوں کو اردو سے جوڑنے کی جو سعی مستحکم کر رہے ہیں اس کی ستائش اور اعتراف ہر طرف سے ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر جمال قادری اور سلیم فاروقی صاحب نے ڈاکٹر منظر حسین کو اکیڈمی کا مومنٹو دے کر اعزاز بخشا۔

پریس ریلیز عالمگیر ساحل، جدہ، 11 اکتوبر 2014

## بزم اردو قطر کا ماہانہ مشاعرہ

**قطر:** اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے قطر میں 1959 سے سرگرم عمل تنظیم بزم اردو قطر کے زیر اہتمام 19 ستمبر 2014 بروز جمعہ نو بجے شب علامہ ابن حجر لائبریری فریج بن عمران کے وسیع ہال میں پروقار طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جہاں اس مشاعرے میں قطر کے کئی معیاری شعرائے کرام نے شرکت کی وہیں دیگر ممالک سے ای میل کے ذریعے گیارہ شعرانے اپنی طرحی غزلیں روانہ کر شرکت کر کے اسے عالمی مشاعرہ بنا دیا۔ قطر کے معروف شاعر، انڈیا اردو سوسائٹی کے نائب صدر جناب عتیق انظر کی صدارت میں ہونے والے اس مشاعرے میں بحیثیت مہمانِ خصوصی و مہمان اعزازی مولانا سیف اللہ محمدی و جناب محمد خالد حسین شریک ہوئے۔ مولانا سیف اللہ محمدی عالم دین ہیں اور بہت ہی عمدہ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ بزم کے مشاعروں میں عرصے سے ای میل سے موصول غزلوں کو بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مہمانِ اعزازی جناب محمد خالد حسین انڈین ایسوسی ایشن فار بہار اینڈ جھارکھنڈ کے میڈیا سکریٹری ہیں اور اردو شاعری سے بے انتہا رغبت رکھتے ہیں۔ مشاعرے کی نظامت بزم اردو قطر کے جنرل سکریٹری اور تین مجموعہ غزلیات کے خوش فکر شاعر جناب افتخار راغب نے کی۔ بزم اردو قطر کے صدر جناب شاد اکولوی نے تمام شعرا و سامعین کا تہہ دل سے استقبال کیا اور بزم اردو قطر کے موقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ قطر میں مقیم تمام اردو سے محبت رکھنے والوں کا بزم اپنے پروگراموں میں خیر مقدم کرتی ہے۔ نثر پارہ کے طور پر بزم اردو قطر کے سرپرست و گزرگاہ خیال فورم کے بانی و صدر ڈاکٹر فیصل حنیف خیال نے اس بار سر سید احمد خان کا ایک دلچسپ مضمون 'خوشامد' منتخب کیا تھا جسے جناب سید آصف حسین نے بہت ہی عمدہ انداز میں پیش کر کے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ناظم مشاعرہ جناب افتخار راغب نے ڈاکٹر خلیق انجم کا تحریر کردہ مجروح سلطان پوری کا مختصر تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد بزم اردو قطر کے نائب صدر فیروز خان نے اپنے خیالات پیش کیے۔ اس مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کی اور غزلیں پیش کیں۔ وہ حسب ذیل ہیں: رئیس ممتاز نے محترمہ رضویہ کاظمی (امریکہ)، جناب شاد اکولوی نے جناب احمد علی برقی اعظمی (دہلی) جناب فضل عباس فاضل (ممبئی)، جناب ذوالفقار ابراہیم نے جناب شاہین فصیح ربانی (مسقط)، جناب مظفر نایاب نے جناب نقشبند قمر نقوی (امریکہ) اور جناب سیف اللہ محمدی نے جناب شمشاد علی منظری (ٹانڈہ، ہندوستان) کی طرح غزلیں اپنے اپنے منفرد انداز میں پیش کر کے محفل کے آہنگ کو عروج بخشا۔ ڈاکٹر احمد ندیم رفیع (امریکہ) کی غزل جناب سید عبدالحی نے مجروح سلطان پوری کے انداز اور ترنم میں پیش کر کے سب کو حیران کر دیا۔ ناظم مشاعرہ جناب افتخار راغب نے محترمہ عالیہ تقوی (الٰہ آباد)، جناب یعقوب اطہر (راجن پور، پاکستان)، جناب تنویر پھول (امریکہ) اور محترمہ ذہینہ صدیقی (دہلی) کی غزلوں سے منتخب اشعار پیش کیے۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 12 اکتوبر 2014

## ملکۂ ترنم نور جہاں کے 88ویں یوم پیدائش کا اہتمام

**لاہور:** فلم انڈسٹری کی معروف اداکارہ گلوکارہ ملکۂ ترنم نور جہاں کے 88ویں یوم پیدائش کا اہتمام کیا گیا۔ ملکہ ترنم نور جہاں 21 ستمبر 1926 کو قصور میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اصل نام اللہ دسائی تھا اور نور جہاں ان کا فلمی نام تھا۔

انھوں نے اپنے فنی کریئر کا آغاز 1935 میں 'پنڈ دی کڑی' سے کیا۔ وہ قیام پاکستان کے بعد اپنے شوہر شوکت حسین رضوی کے ہمراہ ممبئی سے کراچی منتقل ہوگئیں۔ 1957 میں انھیں شاندار پرفارمنس کے لیے صدارتی ایوارڈ 'تمغہ امتیاز' اور بعدازاں 'پرائیڈ آف پرفارمنس' سے بھی نوازا گیا۔ 1965 کی جنگ میں انھوں نے 'مارے ڈھول سپاہیا'، 'اے وطن کے سجیلے جوانو'، 'ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے'، 'او ماہی چھیل چھبیلا'، 'یہ ہواؤں کے مسافر'، 'رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو'، 'میرا سوہنا شہر قصور نیں' سمیت بے شمار گیت گائے۔ انھوں نے مجموعی طور پر 10 ہزار سے زائد غزلیں و گیت گائے جن میں ان کا سب سے پہلا گانا ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' بے پناہ ہٹ ہوا۔ ملکہ ترنم نے کئی فلموں میں کامیاب اداکاری و گلوکاری کے جوہر دکھائے جن میں ایماندار، پیام حق، سجنی، یملا جٹ، چوہدری، ریڈ سگنل، سسرال، چاندنی، دھیر جج، فریاد، خاندان، نادان، دہائی، نوکر، لال حویلی، دوست، زینت، گاؤں کی گوری، بڑی ماں، بھائی جان، انمول گھڑی، دل، ہمجولی، صوفیہ، جادوگر، مرزا صاحبان، انارکلی، لخت جگر، پاٹے خان چھومنتر، نیند، کوئل وغیرہ شامل ہیں۔ ملکہ ترنم نور جہاں 23 دسمبر 2000 کو 74 برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی 22 ستمبر 2014

# قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

# خبرنامہ

## فن خطاطی کو مزید فروغ دینے کے مقصد سے قومی اردو کونسل ملکی سطح پر نمائش اور ورکشاپ کا انعقاد کرے گی: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

**نئی دھلی:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے زیر اہتمام فن خطاطی کو مزید فروغ دینے کے مقصد سے اردو بھون میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی، جس میں فن خطاطی کو روزگار اور اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے سے متعلق غور و خوض کیا گیا۔ ملک کی مختلف ریاستوں سے آئے خطاط اور ماہرین کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ کونسل فن خطاطی کو فروغ دینے کی غرض سے ملک بھر میں 53 مراکز چلا رہی ہے جن کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ ان مراکز کے ساتھ ساتھ کونسل اب اردو والوں کو اس قدیم ورثے سے جوڑنے اور فن خطاطی کے تئیں نئی نسل میں ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے ملک کی مختلف ریاستوں میں کیلی گرافی نمائش کا بھی اہتمام کیا کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ کونسل آئندہ ماہ نومبر میں کل ہند کیلی گرافی نمائش کا اہتمام دہلی میں کرنے جا رہی ہے، جس میں بڑی تعداد میں ماہرین اور کونسل مراکز کے اساتذہ شرکت کریں گے تاکہ کیلی گرافی اساتذہ کو تربیت دی جا سکے اور انھیں اس فن کی باریکیوں سے بخوبی واقف کرایا جا سکے۔ انھوں نے کہا فن خطاطی اردو زبان و ادب اور تہذیب کا ایک اہم ورثہ ہے جس کے تحفظ اور ترقی کے لیے کونسل ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

اس موقع پر کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے اجلاس کو فن خطاطی سے متعلق کونسل کی سرگرمیوں اور کارکردگی سے واقف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ سابقہ نمائشوں اور ورکشاپ سے کونسل کو حوصلہ افزا نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ میٹنگ میں ماہرین نے بھی اپنی تجاویز کونسل کو پیش کیں۔ فن خطاطی سے متعلق کونسل کی کوششوں کی ستائش کرتے ہوئے ماہرین نے کہا کہ ٹکنالوجی کے اس دور میں فن خطاطی کو فروغ دینے کے مزید امکان روشن ہوئے ہیں۔ یہ فن خطاطی کے روشن مستقبل کے لیے ایک خوش آئند بات ہے۔

قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر جناب انتخاب احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا، میٹنگ میں معروف خطاط جناب انیس صدیقی، جناب خورشید عالم، جناب ریاض الحسن، جناب عثمان علی انصاری کے علاوہ فیض الاسلام فیضی اور پروجیکٹ اسسٹنٹ محمد قاسم نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 اکتوبر 2014

### درس گاہ بنات المسلمین میں تقسیم اسناد کا پروگرام

**پٹنہ:** اردو زبان ہمارا ملی و قومی سرمایہ ہے، لہٰذا اس کی ترویج و اشاعت ہمارا فریضہ ہے۔ اردو سے نابلد بچوں کو اردو خواندہ بنانا ایک بہترین کارنامہ ہے۔ درسگاہ بنات المسلمین ناصری گنج پٹھان ٹولی، دانا پور پٹنہ یہ قابل قدر خدمت انجام دے رہی ہے، مذکورہ درسگاہ میں منعقدہ تقسیم اسناد کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی تحریک اردو (رجسٹرڈ) کے صدر محمد کمال الظفر ان خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ واضح رہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے چلایا جانے والا کورس ڈپلومہ سرٹیفکیٹ ان اردو لینگویج کا ایک سنٹر الہند ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی پٹنہ کے زیر اہتمام چلایا جاتا ہے۔ اس کی ایک شاخ مذکورہ درسگاہ میں بھی ہے، جہاں جناب محمد کمال الظفر کے ہاتھوں طلبہ و طالبات کے درمیان سند تقسیم کی گئیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 نومبر 2014

## قومی تعلیمی دن کے موقع پر آسام میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام چار روزہ تربیتی پروگرام

نئی دہلی: حکومت ہند نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم پیدائش 11 نومبر 2014 کو بطور قومی یوم تعلیم کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے جو صفحہ اول کے مجاہد آزادی، مشہور و

معروف ماہر تعلیم اور پہلے مرکزی وزیر تعلیم تھے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا چار روزہ تربیتی پروگرام بمقام گوہاٹی، آسام میں 10 تا 13 نومبر 2014 کو منعقد کیا گیا جس میں نارتھ ایسٹ، مغربی بنگال اور کشن گنج، کٹہار، پورنیہ، ارریہ اور سوپول، بہار کے کمپیوٹر سینٹر کے اساتذہ نے شرکت کی۔ نیز شمال مشرق میں اردو اور عربی مراکز کے اساتذہ وطلبا بھی کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ پروگرام کے انعقاد کا مقصد اس دن کی اہمیت سے آگاہ کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے مرکز میں اس دن کو کس طریقے سے منائیں گے اس کے طور طریقے سے بھی اساتذہ کو واقف کرایا گیا۔ اس پروگرام کے افتتاحی دن قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ ہمیں اس دن کی معنویت کو سمجھنا اور اپنے معاشرے کو سمجھانا از حد ضروری ہے تاکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت جن اقدار سے عبارت تھی وہ نہ صرف ہماری زندگی میں بلکہ ہمارے بچوں کی زندگی میں پیدا ہوسکیں۔ بچوں میں بھی وہی خصوصیات پیدا ہوں جس کے ذریعہ اس جمہوری ملک میں وہ اپنے حقوق کو حاصل کر پائیں گے اور ایک شہری نہ صرف خود کی بلکہ اس ملک کی بھی خدمت کرے گا۔ بچوں میں ان اقدار کو پیدا کرنے کے لیے سیمینار، سمپوزیم، تحریری وتقریری مقابلہ اور اس نوع کے دوسرے ذرائع کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر کونسل کے ریسرچ آفیسر جناب ڈاکٹر کلیم اللہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہمیں تعلیم سے آراستہ ہو کر اپنے بچوں کو بھی اخلاقی و دنیاوی تعلیم سے مزین کرانھیں ایک بہترین شہری بنانے کی تگ و دو کرنی چاہیے۔ آخر میں انتخاب احمد، ریسرچ آفیسر نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 نومبر 2014

# کونسل کے مالی تعاون سے

## امیر خسرو کی دلّی: تاریخی اور سماجی منظرنامہ

**نئی دہلی:** نیشنل امیر خسرو سوسائٹی، این سی پی یو ایل اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'امیر خسرو کی دلّی: تاریخی اور سماجی منظرنامہ' کے موضوع پر دو روزہ سیمینار کا افتتاحی اجلاس غالب انسٹی ٹیوٹ میں عمل میں آیا۔ جلسے میں مقررین اور محققین نے امیر خسروؒ کی مختلف حیثیتوں کو اجاگر کیا۔ افتتاحی جلسے کے بعد ملک کے معروف کلاسیکی سنگر استاد اقبال احمد خاں نے کلام خسرو اپنی خوبصورت آواز میں پیش کیا۔ افتتاحی تقریر کرتے ہوئے معروف محقق اور امیر خسرو سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ امیر خسرو ہماری علمی و ادبی تاریخ کے اتنے عظیم شاعر ہیں کہ جن پر بہت کم علمی کام ہوا ہے۔ امیر خسرو کے کلام کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ وہ ہندوستان سے بہت محبت کرتے تھے اور انھوں نے اس ملک کی تہذیب و ثقافت کو جس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ ہماری تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ جلسے کے مہمان خصوصی ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی فولادی نے حضرت امیر خسرو کی خدمات کو سراہتے ہوئے ہند و ایران تعلقات کے حوالے سے خسرو کے کلام کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ معروف فارسی ادیب پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خسروؒ جتنے ہندوستان میں مقبول ہیں، اتنے ہی زیادہ بیرونِ ہند میں مقبول ہیں۔ امیر خسرو آج بھی بیرون ملک میں ثقافتی سفیر کی حیثیت سے پہچانے جاتے

دائیں سے: ڈاکٹر رضا حیدر، شاہد ماہلی، علی فولادی، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر شریف حسین قاسمی

ہیں۔ نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کے جنرل سکریٹری شاہد ماہلی نے امیر خسرو سوسائٹی اور ان سے وابستہ لوگوں کی علمی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سید رضا حیدر نے اپنی ابتدائی گفتگو میں کہا کہ خسرو کی دلّی کی تاریخ اور دلّی کے سماجی منظرنامے سے اتنی وابستگی تھی کہ ہم خسرو کو دلی کے بغیر اور دلی کو خسرو کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتے ہیں۔ اس جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کہا کہ امیر خسرو ہمارے ان بڑے شاعروں میں ہیں، جن کا کلام آج بھی ہماری علمی رہنمائی کر رہا ہے۔

سیمینار کے دوسرے دن تین اجلاس منعقد ہوئے، جس میں ملک کے مختلف حصوں کے ادیب و دانشور حضرات نے اپنے مقالے پیش کیے۔ مقالہ نگاروں نے اس بات پر زور دیا کہ حضرت امیر خسرو قومی یکجہتی کے بہت بڑے علمبردار تھے اور انھوں نے ہندوستان کی تہذیب، ثقافت اور بھائی چارگی کو اپنی شاعری میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔ بعض مقالہ نگاروں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ موجودہ حالات میں امیر خسرو کی شاعری کی نشر و اشاعت بے حد ضروری ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 و 13 اکتوبر 2014

# اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

**قومی:**

## رضا لائبریری میں سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار

**رام پور:** رام پور کا نام میں چاقو سے جانتا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ رام پور میں ایک ایسا علمی و ادبی سرمایہ بھی ہے جو ذہنوں کو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز کرتا ہے اور وہ مرکز ہے دنیا کی عظیم رضا لائبریری۔ یہ بات گورنر اتر پردیش و چیئرمین رضا لائبریری رام نائک نے سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار 'مکتوبات اور تذکرے' (13 ویں صدی تک) ہندوستانی تاریخ و ثقافت کے ماخذ' کا افتتاح کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے رضا لائبریری کی ایک سالہ آڈٹ رپورٹ کا

رضا لائبریری کی یک سالہ آڈٹ رپورٹ کا اجرا کرتے ہوئے گورنر اتر پردیش رام نائک و دیگر معززین اسٹیج پر

اجرا کرتے ہوئے کہا کہ ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین نے ایک سال کی رپورٹ میں عوام و خواص کو بتا دیا کہ رضا لائبریری کس طرح ترقی کر رہی ہے۔ گورنر رام نائک نے کہا کہ جس طرح ریزرو بینک کے خزانہ میں سونا جمع ہے، جو ملک کی اقتصادی حالت بیان کرتا ہے، اسی طرح رضا لائبریری میں 17 ہزار نایاب مخطوطات ہیں، جو ہماری وراثت اور ثقافت کی امانت ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ رضا لائبریری میں 250 تاڑ پتروں پر لکھی عبارتیں محفوظ ہیں۔ ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین نے چیئرمین رضا لائبریری بورڈ رام نائک کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ 13 ویں صدی سے 19 ویں صدی تک کی تاریخ ہندوستان کا حصہ نہ بن سکی۔ انگریزوں نے جو ہندوستان کی تاریخ لکھوائی، وہ دو فرقوں میں تفریق پیدا کرنے والی تھی۔

رضا لائبریری کے خیابان رضا میں منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار بعنوان 'مکتوبات و تذکرات 13 ویں صدی سے 19 ویں صدی تک ہندوستانی تاریخ و ثقافت کے مآخذ' کے انعقاد کیا گیا۔ گورنر اتر پردیش کے ذریعے افتتاح کیے جانے والے اس سیمینار میں پہلے روز 11 اور دوسرے دن 12 مقالات پڑھے گئے۔ سیمینار میں دہلی سے تشرف لائے ڈاکٹر علیم اشرف نے اپنے مقالے میں بتایا کہ صوفیا کے ملفوظات کس طرح ہمیں تاریخ، تہذیب، ثقافت اور تمدن سے متعلق تاریخی مواد فراہم کرتے ہیں۔ ساجدہ شیروانی رامپور نے اپنے مقالے میں بتایا کہ 'تذکرۃ الواقعات' ہمایوں کے جانشین شہنشاہ اکبر کی فرمائش پر 995 ہجری میں فارسی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ نارائن دت مشرا اورنگ آباد نے بتایا کہ روحانی خیالات کے ماننے والوں میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے بیٹے دارا شکوہ کا بہت اہم مقام ہے۔ دارا شکوہ نے اپنی پہلی فارسی کی کتاب 'مجمع البحرین' لکھی جس کا ترجمہ سنسکرت میں سمندر سنگم کے نام سے لکھا گیا ہے۔ زرینہ خان، نزہت فاطمہ حمیدیہ، زرنگار دہلی، علاء الدین خاں اعظم گڑھی، رمیشور پرشاد بہوگنا، بنیاد علی افغانی یوسفہ نفیس الہ آباد، حافظ شیش انور علوی، یاسر عباس دہلی، سعادت اللہ خاں رامپوری، مصباح احمد صدیقی امروہہ، خلیق النسا رامپوری وغیرہ نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 اکتوبر و روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اکتوبر 2014

## عصر حاضر میں شبلی کے تعلیمی افکار کی معنویت

**اعظم گڑھ:** ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی نشاۃ ثانیہ میں علامہ شبلی نعمانی کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، ان کے تعلیمی افکار و نظریات اور خدمات پر ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ شبلی نے تعلیم کے نظریاتی مباحث قائم کیے، تعلیمی اداروں کو فروغ دیا اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے افراد تیار کیے ہیں جنھوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اشتیاق احمد ظلی (ڈائریکٹر شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ) نے جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے زیر اہتمام 'عصر حاضر میں شبلی کے تعلیمی افکار کی معنویت' کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار (24,25 اکتوبر 2014) کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری نے صدارت کی جبکہ ڈاکٹر ابرار احمد اعظمی، جناب شمیم طارق، سید فیصل علی، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا ابرار احمد اصلاحی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ سیف الاسلام اور ان کے ساتھیوں نے جامعۃ الفلاح کا ترانہ پیش کیا۔ ناظم جامعہ نے مہمانوں کی خدمت میں یادگاری مومنٹو پیش کیا۔ اس موقعے پر مطالعہ شبلیات کے ماہر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو شبلی شناسی کے باب میں ان کی نمایاں خدمات پر ناظم جامعہ نے یادگاری مومنٹو پیش کیا۔ افتتاحی اجلاس میں گلشن طارق کی کتاب 'مولانا عبدالسلام ندوی اور ان کی ادبی خدمات' اور جامعۃ الفلاح کے ایک فرزند ریاض قاصد کے شعری مجموعہ 'محبتوں کے چراغ' کی رسم رونمائی بھی ہوئی۔ ابتدا میں جامعۃ الفلاح کے ناظم مولانا محمد طاہر مدنی نے مہمانوں اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ علامہ شبلی جس معجون مرکب کے داعی تھے جامعۃ الفلاح اس کی ایک تجربہ گاہ ہے۔ معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر ابرار اعظمی نے کہا کہ جامعہ نے روزِ اول ہی سے شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات کو جزوی حد تک ہی سہی اپنے نصاب کا حصہ بنایا۔ جناب شمیم طارق صاحب نے کہا کہ علامہ شبلی نہ صرف اپنے عہد کے تعلیمی نظریات سے واقف تھے بلکہ سو برس آگے کے بارے میں بھی جانتے تھے۔ مولانا ابرار اصلاحی مکی

'عصر حاضر میں شبلی کے تعلیمی افکار کی معنویت' پر منعقدہ سیمینار کا منظر

(رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ) نے کہا کہ علامہ شبلی کی صدی تقریبات کے حسین موقعے پر خطۂ اعظم گڑھ سے کاروانِ تعلیم وترقی کے نام سے ایک تعلیمی تحریک کا آغاز کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کیا جاسکے۔ مولانا نظام الدین اصلاحی نے کہا کہ مسلمانوں نے شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار ونظریات کو سو سال کے بعد اپنایا، اگر اسے شبلی کے دور میں ہی اپنا لیا گیا ہوتا تو آج صورت حال اس سے مختلف ہوتی۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری نے خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت جبکہ تعلیم کے میدان میں مختلف تجربات کیے جارہے ہیں اور تعلیمی ترقیات کے حوالے سے حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر کوشش کی جارہی ہے ایسے وقت میں شبلی کے تعلیمی افکار کے حوالے سے اس سیمینار کا انعقاد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اختتامی اجلاس کی نظامت ذکی الرحمٰن غازی فلاحی نے کی۔ اس نشست میں مولانا نعیم الدین اصلاحی، ڈاکٹر علاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، جناب شمیم طارق نے مقالات پیش کیے۔ اس سے قبل صبح کا اجلاس نائب ناظم جامعہ مولانا مقبول احمد فلاحی کی صدارت میں منعقد ہوا جس کی نظامت عبیداللہ طاہر فلاحی نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، رضوان احمد رفیقی، ڈاکٹر عمیر منظر فلاحی، ڈاکٹر جرار احمد فلاحی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز، ڈاکٹر مسعود عالم فلاحی، مولانا محمد اسماعیل فلاحی نے مقالات پیش کیے۔ نائب ناظم جامعہ مولانا مقبول احمد فلاحی کلمات تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اکتوبر 2014

## جے این یو میں عربی ریسرچ اسکالر سیمینار

**نئی دہلی:** سینٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز اور اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ظفرالاسلام 'ایڈیٹر ملی گزٹ' نے عربی زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی علما نے حدیث، فقہ، ادب، فلسفہ، نحو، صرف، کلام، بلاغت اور تفسیر میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف جامعات میں موجود گراں قدر عربی مخطوطات اس کی مثال ہیں۔ اس دو روزہ سیمینار میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی کے علاوہ پورے ملک سے درجنوں اسکالرس نے حصہ لیا۔ سینٹر کے چیئرپرسن پروفیسر مجیب الرحمٰن نے شرکا کا استقبال کرتے ہوئے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ سیمینار کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد قطب الدین نے پروگرام

جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں منعقدہ دو روزہ عربی ریسرچ اسکالر سیمینار میں ڈاکٹر ظفرالاسلام خان کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے

کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور اس سلسلے میں طلبہ و طالبات کی دلچسپی کو بھی سراہا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس کے سپوری نے عربی ریسرچ اسکالرس کے اس سیمینار کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اس طرح کا پروگرام بہت ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ عربی زبان نے نہ صرف ہند وعرب روابط میں پختگی پیدا کی ہے بلکہ عالمی سطح پر روزگار کے مستحکم مواقع بھی پیدا کیے ہیں۔ جے این یو کی پروفیسر سودھا پائی نے اس پروگرام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ پروگرام کا اس خوش اسلوبی کے ساتھ انعقاد ہونا عربی سینٹر کے لیے ہی نہیں بلکہ جے این یو اور پوری عربی برادری کے لیے باعث فخر ہے۔ اس موقعے پر ہندوستان میں سفارت خانہ مصر کے کلچرل کونسلر احمد محمد عبدالرحمٰن نے عربی زبان وادب میں ہندوستانی علما کی خدمات کا اعتراف کیا اور اس بات کا یقین دلایا کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کے فروغ کے لیے شعبہ ثقافت مصر بھرپور تعاون پیش کرے گا۔ شرکا کا شکریہ ڈاکٹر رضوان الرحمٰن نے پیش کیا۔

''ہندوستان میں عربی زبان وادب کے فروغ اور موثر تحقیقات کے لیے عرب ممالک کی یونیورسٹی سے روابط، محققین اور اساتذہ کی تحقیقی سرگرمیوں اور علمی ذخائر تک آسانی سے رسائی اور پورے ملک میں ریسرچ اسکالروں کو نیٹ ورکنگ سے جوڑا جائے تاکہ طلبہ تحقیقات اور معلومات کا تبادلہ کرکے اپنی تحقیقات میں پختگی اور بالیدگی پیدا کرسکیں۔ سینٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز اور اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں منعقدہ عربی ریسرچ اسکالرس سیمینار کے اختتامی اجلاس میں پاس کی گئی ایک قرار داد میں مذکورہ باتیں کہی گئیں۔ اس سیمینار میں تقریباً 70 ریسرچ اسکالروں نے مختلف موضوعات پر اپنے مقالے پیش کیے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت چیئرمین پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کی، مہمان خصوصی کے طور پر معروف ادیب وشاعر کرم اللہ احمد کرکساوی سابق سفیر سوڈان نے شرکت کی اور نظامت ڈاکٹر خورشید عالم نے کی۔ مہمان خصوصی مسٹر کرم اللہ احمد کرکساوی نے اس سیمینار کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر مجیب الرحمٰن نے سیمینار میں پڑھے گئے مقالات پر روشنی ڈالی۔ اخیر میں سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد قطب الدین نے مہمانان، ریسرچ اسکالرس اور شرکا اور معاونین خاص طور سے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 و 3 نومبر 2014

## رومی: ثقافت، بقائے باہمی اور تکثیریت

'رومی: ثقافت، بقائے باہمی اور تکثیریت' کے موضوع پر منعقدہ پروگرام کے شرکا

**نئی دھلی:** ترکی زبان ایک نئی آفاق کے طور پر آئی ہے اور ہندوستان میں اس زبان کا مستقبل روشن ہے، اس سے دونوں ملکوں یعنی ترکی اور ہندوستان کے تعلقات بھی بہتر ہوں گے۔ان خیالات کا اظہار ترکی کے مولانا یونیورسٹی کے وائس چانسلر تانکوت یالچی نوز نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رومی: ثقافت، بقائے باہمی اور تکثیریت کے موضوع پر منعقدہ ایک سیمینار میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔انھوں نے مولانا یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درمیان تعلیمی تبادلہ کی بات کہی۔قبل ازیں شعبہ ترکی زبان کے سربراہ ڈاکٹر محسن علی نے اپنے افتتاحی کلمات میں شعبے کا تعارف کرایا اور جدید ہندوستان میں ترکی زبان، اس سے روابط اور عالمی سطح پر ترکی زبان کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مہمانان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس بات کی یقین دہانی کرائی کے وہ جامعہ میں شعبہ ترکی کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔مولانا یونیورسٹی کے ڈائریکٹر آف انٹرنیشنل افیرس ڈاکٹر حقان گوک نے مسلم دنیا کی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے حل پر روشنی ڈالی اور کہا کہ تمام پریشانیوں کی جڑ دراصل جہالت، غریبی، بے صبری اور عدم برداشت کی کمی ہے۔انھوں نے ان تمام کمیوں کو مولانا رومی کے فلسفہ کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ بحیثیت مسلمان ہمیں فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے، صبر و ضبط، عفو اور درگزر سے کام لینا چاہیے۔اس موقعے پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، شعبہ فارسی کے صدر پروفیسر عین الحسن نے رومی کی شعری روایت پر روشنی ڈالی۔ ڈین فیکلٹی لسانیات و عمرانیات پروفیسر جی پی شرما نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ رومی امن کے پیغامبر تھے اور ہم اصل میں اسی وقت کامیاب کہے جاسکتے ہیں جب ان کے فکر اور فلسفہ کو حقیقی معنوں میں متعارف کرائیں اور ان کا جو پیغام تھا اس کو دنیا کے سامنے متعارف کرایا جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 اکتوبر 2014

## ابن سینا کی شخصیت اور خدمات پر عالمی سیمینار

**علی گڑھ:** ابن سینا ایک عظیم دانشور تھے انھوں نے طبی موضوعات کے علاوہ دیگر علوم پر بھی اپنی شناخت قائم کی ہے۔انھوں نے طب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جسے رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا، ہندوستان ہو یا پاکستان طب پر جو کام ہوئے ہیں ان میں ابن سینا کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ان خیالات کا اظہار انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار یونانی میڈیسن کی صدر اور ہمدرد یونیورسٹی کراچی (پاکستان) کی چانسلر سعدیہ راشد نے کیا۔وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں ابن سینا اکادمی علی گڑھ کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ عالمی سیمینار کو بطور مہمانِ خصوصی خطاب کررہی تھیں۔سعدیہ راشد نے یونانی طب کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کے تایا حکیم عبدالحمید علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے چانسلر رہ چکے تھے اور خود ان کے والد حکیم سعید نے کراچی میں ہمدرد یونیورسٹی قائم کی۔صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے وائس چانسلر جنرل ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ وہ یونانی میڈیسن فیکلٹی کے کاموں کو ترجیح دے رہے ہیں۔انھوں نے کہا کہ اس ادارے سے کئی ابن سینا پیدا ہونے چاہئیں۔ جارڈن سے آئے ڈاکٹر احمد محمود الحسینی نے کہا کہ عرب ممالک نے طب کے باوا آدم ابن سینا کو فراموش کردیا ہے، جبکہ برصغیر ہند کی یونیورسٹیوں اور حکومتوں نے یونانی طب کے میدان میں ان کو جلا بخشی ہے۔سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کے ڈائریکٹر جنرل پروفیسر شاکر جمیل نے کہا کہ ابن سینا ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔طب، فلسفہ، ریاضی ان کے خاص موضوعات تھے۔ابن سینا اکادمی کے ڈائریکٹر پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی کا قیام 2000 میں عمل میں آیا تھا اور ان چودہ برسوں میں تیس کے قریب کتب تاریخ طب، بنیادی مآخذ، مخطوطات اور دوسرے موضوعات کے تعلق سے شائع ہوچکی ہیں۔ نیپال کے چیف جسٹس صلاح الدین صدیقی نے کہا کہ ابن سینا نے بیماریوں کے علاج کے لیے یوگا پر بھی زور دیا تھا اور نیپال میں جڑی بوٹیوں کا ذخیرہ ہے۔اس موقعے پر سائنس میگزین کے مدیر محمد خلیل کو پچیس ہزار روپے کے نقد انعام سے سرفراز کیا گیا اور نصف درجن کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔شعبۂ فائن آرٹ کی استاد ڈاکٹر اسما کاظمی نے ابن سینا کا پورٹریٹ ہمدرد کی چانسلر محترمہ سعدیہ راشد کو پیش کیا۔ پروفیسر ایف ایس شیرانی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 اکتوبر 2014

## علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا 62واں سالانہ جلسہ تقسیم اسناد

**علی گڑھ:** علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے 62ویں سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد سے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے اسلامک ایجوکیشنل سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن کے ڈائرکٹر جنرل اور فیڈریشن آف دا یونیورسٹی آف دا اسلامک ورلڈ، رباط، مراکش کے سکریٹری جنرل عزت مآب ڈاکٹر عبدالعزیز عثمان التویجری نے پوری دنیا اور بالخصوص ہندوستان کے مسلم نوجوانوں سے

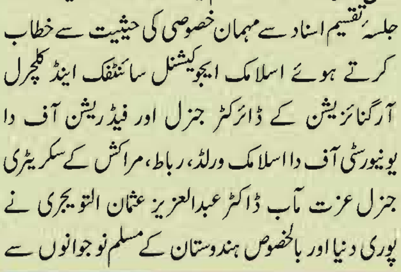

اپیل کی کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کی ایک حقیقی، انسانیت نواز اور مکمل ضابطۂ حیات کی شبیہ پیش کرنے کے لیے کام کریں۔اس سے قبل، یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ دینی مدارس کے فارغین کے لیے شروع کیا گیا برج کورس اپنی نوعیت کا منفرد کورس ہے، جس کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔جنرل شاہ نے کہا کہ ہمیں قومی تعمیر کی سمت میں کام کرنا ہے اور اس سلسلے میں یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کے نظریات وفکر اور ان کی تعلیمی کوششوں کو چراغ راہ بنانا ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروائس چانسلر بریگیڈیر

سید احمد علی نے دکتورکی اعزازی سند حاصل کرنے والوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے انھیں اس اعزاز کے لیے پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالعزیز عثمان التویجری، متحدہ عرب امارات معروف کمپنی وی پی ایس ہیلتھ کیئر کے مینیجنگ ڈائریکٹر ڈاکٹر شمشیر ویالل پر مباتھ اور ریاض، سعودی عرب کی معروف کنسٹرکشن کمپنی سلمان الترائس اینڈ پارٹنرس لمیٹڈ کے جنرل منیجر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ممتاز سابق طالب علم ڈاکٹر ندیم اختر ترین کو دکتور کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی، 17 اکتوبر 2014

ساہتیہ اکادمی میں یک روزہ منعقدہ سمپوزیم 'خواجہ احمد عباس: فکروفن' کے دوران مونوگراف 'خواجہ احمد عباس' کے اجرا کا منظر

## راشٹریہ ایکتا دوس پر شعبہ اردو جامعہ ملیہ کا پروگرام

**نئی دہلی:** جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قومی یکجہتی کی مناسبت

اسٹیج پر پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر کم کم دیوان، پروفیسر شہزاد انجم اور ڈائس ڈاکٹر سرور الہدیٰ

سے شعبۂ اردو کی جانب سے ایک شاندار پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں معروف ناقد، محقق، شاعر، ناول نگار شمس الرحمٰن فاروقی نے شرکت کی۔ ساتھ ہی پروفیسر وہاج الدین علوی صدر شعبۂ اردو، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر خالد مبشر کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ فاروقی صاحب نے اس پروگرام میں اردو زبان اور قومی یک جہتی' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قومی یکجہتی کا نظریہ اردو زبان کی ہی دین ہے۔ سارے جہاں سے اچھا، ہندوستاں ہمارا جیسا بے مثال قومی ترانہ اردو زبان نے ہی دیا ہے۔ اگر کسی کو سیکولر بننا ہے تو اسے اردو زبان پڑھنا چاہیے۔ اس زبان میں ہر مکتب فکر کے لوگوں نے اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ ایک شعر 'رام مجھ میں ہے اور میں رام میں ہوں' کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جس زبان میں اس قسم کی باتیں کہی گئی ہوں اسے ایک خاص مکتب فکر سے جوڑنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غالب کے بے شمار نظریات ویدوں سے مستعار ہیں۔ میں بارہا کہا کرتا ہوں کہ وید نہ ہوتے تو غالب نہ ہوتا۔ پروگرام میں شریک پروفیسر قم قم دیوان صاحبہ نے موجودہ حالات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ آج ہمارے بچوں کو سیکولر، اتحاد و اتفاق اور ہمدردی کی سوغات دینا وقت کی اشد ضرورت ہے کیوں کہ آج کا بچہ کل کا نوجوان ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 2 نومبر 2014

## شہنشاہِ اکبر کے جنرل کے مقبرے کی تجدید

**مظفر نگر:** ہندوستانی محکمۂ آثار قدیمہ کی اے ایس آئی کی آگرہ اکائی نے صدر دفتر کو مظفر نگر کی جناتھ تحصیل کے بھجیرا گاؤں میں موجود اکبر کے جنرل سید محمود کے مقبرے کی تجدید کاری کی تجویز ارسال کی ہے۔ یہ مقبرہ اکبر کے سب سے وفادار جنرلوں میں سے ایک محمود کی آخری آرام گاہ ہے جس کا تذکرہ عہد اکبر میں اس کی انتظامیہ کی زیر نگرانی تحریر کی گئی آئین اکبری میں بھی ہے۔ اے ایس آئی کے افسران نے بتایا کہ یہ مقبرہ محمود نے بذات حود اپنے لیے بنوایا تھا مگر اس کی حیات میں انتقال کرنے والا اس کا بیٹا سیف خان بھی یہاں دفن ہے۔

سید محمود کے علاوہ اے ایس آئی ان کے رشتہ دار میران سید حسین اور سید عمر نور کے مقبرے کی بھی تجدید کاری کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ ان دونوں کے مقبرے 1561 اور 1592 کے درمیان بنائے گئے تھے اور اب 400 برس بعد ان کی تجدید کی جائے گی۔ سفید سنگ مرمر کے ستون اور سرخ پتھر کے گنبد والا سید عمر نور کے مقبرے کی تعمیر کی تاریخ کا علم نہیں ہے۔ سید محمود کے مقبرے پر موجود کتبے کے مطابق عمر نور دیہاتی عادات والا سخی اور ہمتی آدمی تھا۔ اے ایس آئی کو امید ہے کہ تجدید کاری کا کام دو ماہ کے اندر شروع ہو جائے گا۔ کام کو مرحلہ وار پورا کیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اکتوبر 2014

## خواجہ احمد عباس پر یک روزہ سمپوزیم

**نئی دہلی:** خواجہ احمد عباس ہشت پہلو نگینہ تھے، وہ روشن خیال ادیب تھے۔ ادب، آرٹ، فلم اور صحافت کے میدان کے شہسوار تھے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کو کئی یادگار کتابیں اور فلمیں دیں۔ اپنی روشن خیالی سے سب کو متاثر کیا۔ ان خیالات کا اظہار اردو زبان و ادب کے ممتاز نقاد، دانشور اور ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک روزہ سمپوزیم 'خواجہ احمد عباس: فکروفن' کے موقعے پر کیا۔ پروفیسر نارنگ نے ان کی گراں قدر خدمات کی بازیافت پر زور دیا اور ان کی شاہکار فلموں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ احمد عباس نے سب سے زیادہ شہرت 'لاسٹ پیج' اور 'آزاد قلم' سے حاصل کی اور اسے وہ زندگی کی آخری سانس تک لکھتے رہے۔

مہمان خصوصی اور سابق وائس چانسلر حیدر آباد یونیورسٹی پروفیسر سید احتشام حسنین نے کہا کہ خواجہ احمد عباس کا تخلیقی ویژن بہت وسیع تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ایک سچے سوشلسٹ تھے اور اپنی پوری زندگی انھوں نے اسی نظریے کے تحت گزاری۔ ڈاکٹر زویا زیدی نے کہا کہ خواجہ عباس کی کہانیوں میں خواتین کی آزادیِ خیال پر اصرار ملتا ہے۔ انھوں نے خواتین کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنا کر سماج کو آئینہ دکھایا۔ معروف افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی نے ان کے فکشن کو عالمی معیار کا درجہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کی کہانیوں اور ناولوں میں کسانوں اور مزدوروں کی ایک الگ کائنات موجود ہے جو ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس موقعے پر ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام شائع مونوگراف 'خواجہ احمد عباس' (مصنف: خالد اشرف) کا اجرا ممتاز اسکالر سید احتشام حسنین کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی

شبلی نعمانی کا 100 واں یوم وفات کے موقعے پر منعقدہ سیمینار کا منظر

کے سکریٹری ڈاکٹر کے ایس راؤ نے تمام مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور خواجہ احمد عباس کے فکر وفن پر روشنی ڈالی۔ آخر میں اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے خواجہ احمد عباس کو ایک لجنڈ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان جیسی شخصیتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ چندر بھان خیال نے تمام مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اکادمی کے پروگرام افسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے نظامت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اکتوبر 2014

## شبلی نعمانی کا 100واں یوم وفات

**نئی دھلی:** شبلی اردو ادب کی ایک ایسی عبقری شخصیت ہیں جن کا کوئی بدل نہیں ہے۔ وہ ایک متنوع اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے جس موضوع پر بھی لکھا اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان خیالات کا اظہار غالب اکادمی کے زیراہتمام علامہ شبلی نعمانی کے 100 ویں یوم وفات کے موقعے پر منعقدہ ایک کل ہند سیمینار میں کیا گیا۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ علامہ شبلی اور علامہ اقبال ایسی دو عبقری شخصیتیں ہیں جن کی مثال اردو ادب تو کیا، دنیا کے کسی زبان کے ادب میں نہیں ملے گی۔ شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم الکلام پر سب سے پہلے بحث کی، تنقید نگاری کی ابتدا کی، مرثیہ نگاری کو انیس اور دبیر کا موازنہ کرکے صنف کا درجہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ شبلی ہی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انقلابی اور احتجاجی شاعری کی جس کی وجہ سے انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چھوڑنا پڑی۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے شبلی کے تعلیمی تصورات پر اپنا سیر حاصل مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ شبلی تعلیمی تفریق کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اپنے آبائی وطن اعظم گڑھ میں اس طرز کا ایک اسکول قائم کیا، نیز جب ندوۃ العلماء لکھنؤ میں معتمد تعلیم بنائے گئے تو اس وقت بھی انھوں نے سخت مخالفتوں کے باوجود جدید علوم بالخصوص انگریزی اور سنسکرت کو نصاب میں داخل کرایا حالانکہ اس فیصلہ کی سخت مخالفت ہوئی۔ فارسی اور شعرالعجم کے حوالے سے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے مقالے میں کہا کہ علامہ شبلی کے کئی امتیازات ہیں ان میں سے ایک امتیاز یہ ہے کہ وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے فارسی شعر وادب کی تاریخ لکھی جبکہ یہ کام ایرانی ادبا بھی نہیں کرپائے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے تحقیق اور منسوبات کے موضوع پر اپنے مقالے میں بتایا کہ علامہ شبلی نے بڑی دیدہ ریزی سے کئی اہم کتابوں کی اصل کا پتہ لگایا، ان کا یہ کارنامہ آج بھی بے مثال ہے۔ پروفیسر عامر حیات حسینی نے شبلی تفسیریات، اور علم الکلام کے موضوع پر اپنے وقیع مقالہ میں کہا کہ علامہ شبلی فلسفی نہیں تھے انھوں نے اپنے حالات، مزاج اور تبحر علمی کے مطابق سوالات اٹھائے اور ان کی تعمیل کی۔ محقق ڈاکٹر شمس بدایونی نے شبلی کے مراسلت اور خطوط پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے بعد شبلی وہ مکتوب نگار ہیں جن کے خطوط میں وہ سب محاسن موجود ہیں جو قاری کے ذہن کو اپیل کرتے ہیں۔ پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے اردو کی ترقی اور ترویج کے حوالے سے شبلی کی خدمات کا احاطہ کیا۔ ان کے علاوہ عبدالسلام اور نظام الدین نے بھی مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 اکتوبر 2014

## 15واں آل انڈیا مسابقہ حفظ وتجوید وتفسیر قرآن کریم کا انعقاد

**نئی دھلی:** قرآن وحدیث سے براہ راست تعلق بڑے شرف وسعادت کی بات ہے۔ بڑے خوش نصیب ہیں وہ اساتذہ وطلبہ جو قرآن کریم کی تعلیم وتعلم کو اپنا نصب العین اور حاصل زندگی سمجھ کر اس کے حفظ وتلاوت اور معارف ومعانی کی تفہیم وتشریح میں شب وروز لگے ہوئے ہیں۔ مرکزی جمعیت اور اس کے ذمے داران ان ہونہار طلبہ مدارس کے لیے ہر سال مسابقہ حفظ وتجوید و تفسیر قرآن کریم کے انعقاد کو اپنے لیے باعث سعادت اور دینوی واخروی فوز فلاح کا باعث سمجھتے ہیں اور ان طلبہ کے والدین اور مدارس کے شکرگزار اور ان کے لیے دعاگو ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے ناظم عمومی مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی نے کیا۔ موصوف مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے زیراہتمام پندرہواں دوروزہ آل انڈیا مسابقہ حفظ وتجوید وتفسیر قرآن کریم اختتامی وانعامی اجلاس منعقدہ اہل حدیث کمپلیکس اوکھلا نئی دہلی زیرصدارت حافظ محمد یحیٰی دہلوی حفظہ اللہ امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند حاضرین سے خطاب کررہے تھے۔ اس موقعے پر مسابقہ کے کل چھ زمروں میں اول پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کا ایمان افروز مظاہرہ قرأت ہوا جس سے بڑی تعداد میں آئے ہوئے سامعین کافی محظوظ ہوئے اور کشمیر سے لے کر آسام تک ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے بڑی تعداد میں طلبہ مدارس کو مختلف اہم دینی، ملی اور علمی شخصیات کے ہاتھوں گراں قدر نقد انعامات، گھڑیاں، مصحف، کتاب التوحید اور توصیفی اسناد سے نوازا گیا۔ اس اختتامی اجلاس کا افتتاح مولانا قاری صغیر احمد سلفی استاذ جامعہ اثریہ دارالحدیث، مئو کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ نظامت مولانا ظل الرحمٰن تیمی نے کی اور مولانا محمد ہارون سنابلی ناظم شعبہ تنظیم مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ زمرہ اوّل (حفظ وتجوید قرآن کریم، مکمل) کے تحت روح اللہ بن علاء الدین نے اول پوزیشن حاصل کی جو تمباپہاڑ جھاجھا بہار سے تعلق رکھتے ہیں، حامد مختار احمد نے دوم پوزیشن اور محمد بن محمد کلیم نے سوم پوزیشن حاصل کی۔ زمرہ دوم (حفظ وتجوید قرآن، 20 پارے) کے تحت افروز عالم محمد شریف نے اول پوزیشن، محمد نعمان بن حاجی محمد انعام نے دوم پوزیشن اور توفیق احمد بن مستقیم سوم پوزیشن حاصل کی، زمرہ سوم (حفظ وتجوید قرآن کریم 10 پارے) کے تحت محمد صداقت بن محمد لیاقت نے اول پوزیشن، ریان فریدی محمد یوسف دوم پوزیشن اور محمد صادق اقبال محمد جرجیس سوم پوزیشن حاصل کی۔ ان کے علاوہ بقیہ تین زمروں کے تحت بھی کامیاب ہونے والے طلبہ میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ روزنامہ 'انقلاب' نئی دہلی، 4 نومبر 2014

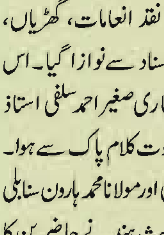

روح اللہ

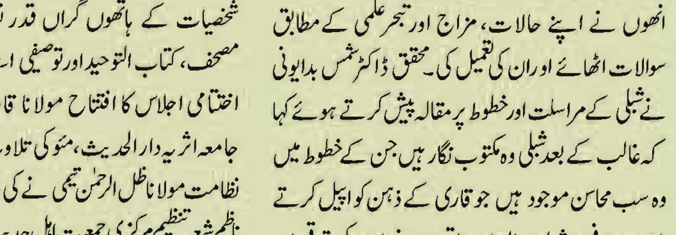

15 واں آل انڈیا مسابقہ تجوید وتفسیر قرآن مجید پروگرام سے مولانا اصغر علی سلفی خطاب کرتے ہوئے

## زبان سے دوری کا مطلب اپنی سرزمین سے کٹنا ہے: جاوید اختر

**نئی دہلی:** معروف نغمہ نگار جاوید اختر کا کہنا ہے کہ اپنی زبان سے کٹنے کا مطلب ہے اپنی سرزمین سے کٹنا۔ زبان صرف ٹرانسمیشن اور ایک دوسرے تک اپنی بات

پہنچانے کا ہی ذریعہ نہیں ہے بلکہ زبان ہیریٹیج ہے، کلچر ہے۔ سماج کو سمجھنے کا آئینہ ہے۔ انھوں نے یہ بات ایک پریس کانفرنس میں کہی۔ انھوں نے بتایا کہ آج کے نوجوانوں کو شاعری، دوہوں میں استعمال کیے گئے اردو اور سنسکرت کے الفاظ کے معنی کی وضاحت کے لیے ٹاٹا اسکائی پر ایکٹیو جاوید اختر سروس شروع ہو رہی ہے، جس میں غالب، میر، کبیر، رحیم سمیت دیگر عظیم فن پاروں کی شاعری اور دوہوں پر مذاکرہ کیا جائے گا۔ جاوید اختر نے کہا کہ آج کے وقت میں اسکولوں اور کالجوں سے لٹریچر غائب ہوتا جا رہا ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ایک طبقہ انگریزی کے پیچھے بھاگ رہا ہے، اسے میں غلط نہیں مانتا کیونکہ انگریزی ایک ایسی زبان ہے جو ہمیں دنیا سے جوڑتی ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ہم انگریزی کے چکر میں ہندی، اردو، تیلگو، بنگلہ وغیرہ زبانوں کو بھول جائیں۔ یہ وہ زبانیں ہیں جو ہمیں ہماری جڑوں سے جوڑتی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اکتوبر 2014

**دہلی:**

## انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں قومی سیمینار

**نئی دہلی:** انڈیا اسلامک کے صدر سراج الدین قریشی نے اعلان کیا ہے کہ جلد ہی سینٹر کے بانیوں کے نام پر مختلف شعبوں میں نمایاں کام کرنے والی شخصیات کو ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ سینٹر کے بانیوں کی حیات و خدمات پر منعقد ایک خصوصی سیمینار میں خطاب کرتے ہوئے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر جسٹس ہدایت اللہ، حکیم عبدالحمید، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، چودھری محمد عارف، بدرالدین طیب جی، ایس شفیع، بیگم عابدہ احمد اور جی نقشبند کی حیات، خدمات اور شخصیات پر تحریری مضامین پر مشتمل ایک کتاب کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ان شخصیات پر ڈاکٹر بصیر احمد، ڈاکٹر جاوید احمد، ڈاکٹر سید ظفر محمود، وصی احمد نعمانی، ضمیر احمد مضمر، مولانا عبدالمجید پاریکھ اور مشتاق احمد ایڈوکیٹ نے مضامین تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب میں سینٹر کی نشاۃ ثانیہ کے معمار سراج الدین قریشی اور ان کے ساتھیوں پر بھی ایم ودود ساجد نے مضمون تحریر کیا ہے۔ سیمینار میں ان تمام قلم کاروں نے اپنے اپنے مقالوں کی تلخیص بھی پیش کی۔ وصی احمد نعمانی نے ہر چند کہ چودھری محمد عارف پر اپنا مقالہ پیش کیا لیکن انھوں نے اس مضمون میں اسلامک سینٹر کی پوری تاریخ کو سمو دیا۔ پروگرام میں سینٹر کے دو سو سے زائد ممبران اور بہی خواہان نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 اکتوبر 2014

انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں منعقدہ قومی سیمینار کے دوران کتاب کے اجرا کا منظر

## دہلی یونیورسٹی میں یوم سرسید کا انعقاد

**نئی دہلی:** شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں یوم سرسید کے موقعے پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں سرسید احمد خاں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پروگرام میں بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر فیروز دہلوی نے شرکت کی اور پروفیسر عبدالحق

نے صدارت کی جبکہ نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر ابن کنول نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے درمیان موجود دونوں اساتذہ کا تعلق شعبہ اردو سے رہا ہے۔ پروفیسر عبدالحق کا نام ماہرین اقبالیات میں سرفہرست ہے اور محمد فیروز دہلوی تنقید کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرسید کو مسلمانوں کے مسیحا کے طور پر تا قیامت فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا مضمون 'گزرا ہوا زمانہ' کا مطالعہ کریں تو افسانے کی ساری خصوصیات اس میں نظر آتی ہیں۔ 19ویں صدی میں سرسید نہ ہوتے تو مسلمان آج بھی تعلیم کے اعتبار سے پست ہوتے۔ 19ویں صدی میں سرسید، 20ویں صدی میں حکم عبدالحمید اور اب 21ویں صدی کے سرسید کا انتظار ہے۔ ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے کہا کہ مجھے شعبہ اردو میں آکر بہت خوشی ہوئی، کیونکہ شعبے میں کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ سرسید عظیم شخصیت تھے، ہمیں چاہیے کہ اتنے بڑے مجدد کو صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حوالے نہ کریں بلکہ انھیں ہمیشہ یاد کرتے رہیں۔ ڈاکٹر احمد امتیاز، سعد مشتاق اور نورین علی حق نے سرسید کے حوالے سے پر مغز گفتگو کی۔ ان کے بعد ڈاکٹر دانش حسین خان نے ترانۂ علی گڑھ اپنے منفرد انداز میں پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اکتوبر 2014

## پروفیسر مجیب یادگاری خطبہ

**نئی دہلی:** جامعہ ملیہ اسلامیہ کے 96ویں یوم تاسیس کے موقعے پر 'پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ' کا اہتمام ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ایڈورڈ سعید ہال میں کیا۔ اس یادگاری خطبے کے مہمان معروف مورخ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن تھے اور ان کے خطبے کا موضوع تھا 'ہندوستان کے نوآبادیاتی عہد میں بذلہ سنجی' ظرافت و مزاح کی کھوج، اس موقعے پر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد اسحاق نے کہا کہ پدم بھوشن پروفیسر محمد مجیب ایک مورخ، ادیب اور آرٹسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے استاذ بھی تھے۔ پروفیسر مشیر الحسن نے اپنے خطبہ میں سیاسی رکاوٹوں اور غلامی کے ماحول میں ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی علمی، و تحقیقی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا اور اپنے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروفیسر مشیر الحسن نے طنز و مزاح کی نامور ہستیوں کے قلم کی جولانیوں کا بھرپور جائزہ لیا۔ آخر میں پروفیسر محمد ذاکر نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ ایسے توسیعی خطبات سے علم و تحقیق کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 اکتوبر 2014

علماء کرام وفارغین مدارس کی دس روزہ کانفرنس کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مولانا رفیق قاسمی، جب کہ اسٹیج پر مولانا سید جلال الدین عمری ودیگر

## علمائے کرام وفارغین مدارس کی دس روزہ کانفرنس

**نئی دھلی:** معاشرہ اور قوم کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے علمائے کرام کو ان کی ذمے داریاں یاد دلاتے ہوئے کئی مسلم دانشوروں نے کہا کہ ''ایسے وقت میں جبکہ ملک وملت کئی مسائل سے دوچار ہے، یہاں علمائے کرام کی ذمے داریاں مزید دوگنی ہوجاتی ہیں۔ جماعت اسلامی ہند کے زیراہتمام علمائے کرام وفارغین مدارس کی دس روزہ کانفرنس کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا سید جلال الدین عمری نے کہا کہ ''علما انبیا کے وارث ہیں، اس لیے حالات چاہے جتنے ناموافق کیوں ہوں، ہمیں ہرصورت میں دعوت کا کام کرنا چاہیے، حالات کی ناسازگاری کا عذر مناسب نہیں معلوم ہوتا، ایسے ہی حالات میں استقامت کا ثبوت دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس موقعے پر مولانا رفیق قاسمی سکریٹری جماعت اسلامی ہند نے علمائے کرام کو ان کی منصبی ذمے داریوں کو سمجھ کر صحت مند معاشرے کی تشکیل میں اپنا سرگرم کردار نبھانے کی اپیل کی۔

اس موقعے پر شاہ ولی اللہ ٹرسٹ کے چیئرمین مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ ہمیں قرآن سے اپنے تعلق کا ایماندارانہ جائزہ لینا چاہیے، قرآن کو سمجھ کر پڑھیں اور اس فکر کو عام کریں۔ شیعہ عالم مولانا جلال حیدر نقوی نے کہا کہ اتحاد امت وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، ہمیں اس کی پائیدار کوشش کرنی چاہیے۔ پروفیسر محسن عثمانی نے کہا یہ موقع دنیا کو صحیح رخ دینے کا ہے، یہ ذمے داری معروف اور منکر کو جاننے والوں کی ہے۔ تقریب سے خطاب کرنے والوں میں پروفیسر محمد غلام یحییٰ، دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا شوکت علی، مولانا اصغر امام مہدی وغیرہ شامل ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 19 اکتوبر 2014

## ساتواں بین الاقوامی اسلامی کتاب میلہ

**نئی دھلی:** اسلامک کلچرل سینٹر میں ساتویں بین الاقوامی اسلامی کتاب میلے کے موقعے پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نائب صدر صفدر ایچ خان نے کہا کہ مکتبہ الحسنات کے اس میلے نے گزشتہ چھ برسوں میں زبردست مقبولیت حاصل کی ہے۔ میلے کے افتتاح کے لیے پرانی دہلی کی ایک ہونہار اسٹوڈنٹ منیبہ بیگم کو بطور خاص بلایا گیا تھا۔ منیبہ بیگم نے چشمہ بلڈنگ اسکول سے بارہویں کلاس پاس کی ہے اور اردو میں 99 فیصد نمبرز حاصل کیے ہیں۔ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والی اس طالبہ کا مجموعی ریزلٹ 91 فیصد رہا اور اسے DITE میں داخلہ مل گیا ہے۔ مکتبہ الحسنات کے ڈائرکٹر عبدالمالک فہیم نے کہا کہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اسلامی کتابوں کے میلہ نے ایک انفرادیت حاصل کرلی ہے۔ فیصل فہیم نے مہمانوں اور شائقین کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس بار اس میلے میں سعودی عرب، پاکستان، چین، متحدہ عرب امارات، لبنان، امریکہ، برطانیہ، ملیشیا، سنگاپور، سری لنکا، ایران اور مصر کے مختلف مکتبوں سے شائع کتابیں جمع کی گئی ہیں، جہاں قرآن، قرآن ریڈر پین، اذان کلاک، اسلامی یادگاریں، حجاب، طغرے، عطر، سی ڈیز، ڈی وی ڈیز اور بچوں کے لیے اسلامی گیم بھی فروخت کے لیے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی تہذیب وتمدن سے متعلق بھی مختلف اشیا کا ذخیرہ لایا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 19 اکتوبر 2014

## اردو اکادمی کا 6 روزہ ڈرامہ فیسٹول

**نئی دھلی:** محکمہ فن، ثقافت اور السنہ حکومت دہلی کے فعال ادارہ اردو اکادمی کے زیراہتمام جاری چھ روزہ 26 واں اردو ڈرامہ فیسٹول منڈی ہاؤس پر واقع شری رام سینٹر آڈیٹوریم میں اختتام پذیر ہوگیا۔ اس سال اس فیسٹول کو معروف فلمساز، تخلیق کار اور دانشور خواجہ احمد عباس اور قدسیہ زیدی کو معنون کیا گیا اور چھ روزہ میلے میں ان دونوں شخصیات کی تخلیقات کی عملی پیش کش بھی دہلی کے معروف ڈرامہ گروپ اور تھیٹر کمپنیوں نے کی۔ آخری دن 'دھوبن کو کپڑے دیئے' اور 'تیماردار' دو کہانیاں پیش کی گئیں۔ ان تینوں کہانیوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اردو کے معروف کردار حاجی بغلول کی طرح چچا چھکن بھی ایک مشہور کردار ہے۔ اس کہانی کو ہم پڑھتے چلے آرہے ہیں لیکن آج جس عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس سے اس کہانی میں مزید خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے۔ اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے بھی اس شو کی تعریف کی اور اس کے لیے سوشل پرائڈ ویلفیئر سوسائٹی کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے اردو اکادمی کے زیراہتمام جاری چھ روزہ ڈرامہ فیسٹول پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 19 اکتوبر 2014

### آندھرا پردیش:

## تقی عابدی کا اردو رسم الخط پر خطاب

**حیدرآباد:** مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں مشہور محقق اور نقاد سید تقی عابدی نے اردو رسم الخط سے متعلق بڑا بلیغ اور پرمغز خطاب فرمایا۔ ان کا کہنا تھا کہ اول اشاروں پھر تصویروں اس کے بعد آوازوں سے رسم الخط بنا۔ عربی میں سات رسم الخط ہیں جو 'نس' کہلاتی ہیں اور فارسی رسم الخط کو 'تعلیق' کہتے ہیں اور اردو رسم الخط کو 'نستعلیق' کہتے ہیں جو عربی اور فارسی کا امتزاج ہے۔ البیرونی کے مطابق ہندوستان میں ناگری رسم الخط تھا۔ عہد وسطیٰ میں فارسی کا غلبہ ہوا تو نستعلیق میں تحریریں لکھی جانے لگیں اس وقت اردو رسم الخط کے مسئلہ کو لے کر دو گروہ سامنے ہیں۔ ایک نستعلیق جب کہ دوسرا ناگری کی حمایت میں ہے۔ لیکن دونوں مسیحا ہیں، ناگری کی حمایت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس کی تلمیحات، تشبیہات و استعارات غیرملکی ہیں، مماثل آوازوں کے حروف زائد ہیں ٹائپ کرنا مشکل ہے مثلاً ع کے استعمال کو لیجیے عبادت، معلم، مربع اور رکوع میں جدا جدا طریقہ پر ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ رسم الخط ہزاروں سال کے تجربات پر بنتا ہے، رسم الخط اور زبان کا معاملہ عوام، خواص، لسانیات کے ماہرین اور علما سے بھی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ رسم الخط لباس کے مانند ہے جسے بدلنے میں کوئی قباحت نہیں مگر لباس نہیں یہ تو جلد اور جسم کی چمڑی ہے جسے اتار دیا جائے

تو زندگی ختم ہوجائے گی۔ ولادت اور اہم واقعات کی تاریخ نکالنے کا فن دفن ہوجائے گا کیونکہ ابجد، ہوز اس کی بنیاد ہے۔ لاکھوں کتابیں رسم الخط بدلنے سے ضائع ہوجائیں گی جیسے ترکی میں ہوا۔ املا کو درست اور تہجی کے مسئلہ کو حل کیا جائے۔ یہ کام چائے خانوں میں نہیں بلکہ اداروں اور جامعات میں ہوں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جس طرح سے ماں کو بدلا نہیں جاسکتا اسی طرح اپنی مادری زبان کو بھی نہیں بدلا جاسکتا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 9 نومبر 2014

**اتر پردیش:**

## سرسید احمد خاں حیات وخدمات

**لکھنؤ:** مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایک سیمینار بعنوان 'سرسید احمد خاں: حیات وخدمات' ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی صدارت اور ڈاکٹر محمد ہارون رشید کی نظامت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے رضوان احمد، سابق ڈی جی پی اترپردیش، ظفر یاب جیلانی ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل یوپی، آئی پی سنگھ، چیف اسٹینڈنگ کونسل اترپردیش شریک ہوئے، مہمان ذی وقار میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر انیس انصاری، ٹی این گپتا ایڈوکیٹ، طارق صدیقی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ فاؤنڈیشن کے بانی جنرل سکریٹری محمد وصی صدیقی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں جملہ مہمانوں اور سامعین کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ عظیم لوگوں کی خدمات کو یاد کرنے سے ہمیں اپنی زندگی میں حوصلہ ملتا ہے اور ہمارے لیے راہیں روشن ہوتی ہیں۔ اس موقعے پر مقررین نے سرسید احمد خاں کی حیات کے مختلف پہلوؤں اور ان کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ شرکا نے سرسید کو یونیورسل دانشور قرار دیا۔

پریس ریلیز، ہارون رشید، لکھنؤ، 18 اکتوبر 2014

## علی گڑھ میں سرسید سیمینار

**علی گڑھ:** سرسید کے خوابوں کی تعبیر کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ غریب اور مزدور طبقہ تک تعلیم عام ہو اور غربا اس سے فیضیاب ہوں۔ ان خیالات کا اظہار ڈپٹی لیبر کمشنر زبیں عائشہ نے شمس مسلم ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ سرسید سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ غریبوں اور مزدوروں کو تعلیم سے آشنا کرانے کا کام صرف حکومت کا ہی نہیں ہے بلکہ یہ ذمے داری سماج کے دانشور طبقے کی بھی ہے۔ محترمہ عائشہ نے جلسے میں موجود تمام افراد کو محکمہ لیبر کی جانب سے ملنے والی امداد کے تعلق سے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ سوسائٹی کے صدر و پروگرام کنوینر نسیم شاہد نے کہا کہ تعلیم انسان کا وہ خزانہ ہے جس کو نہ کوئی تقسیم کرپاتا ہے اور نہ کوئی چرا پاتا ہے، اس کے ذریعے انسان کو زندگی کے اہم فیصلے لینے میں آسانی ہوتی ہے اور تعلیم سے ترقی کی منازل طے کرنے میں انسان کامیاب رہتا ہے۔ شعبۂ قانون کے استاد ڈاکٹر شکیل احمد صمدانی نے کہا کہ سرسید کی معنویت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ انیسویں صدی میں تھی۔ ایس پی بھیم راج مینا نے کہا کہ سرسید کے مشن کو آگے لے جانے کے لیے خواتین کی حصے داری ضروری ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 اکتوبر 2014

## میرٹھ میں ہفت روزہ جشن سرسید کا انعقاد

**میرٹھ:** شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور سرسید ایجوکیشنل سوسائٹی، میرٹھ کے باہمی اشتراک سے منعقد ہو رہے ہفت روزہ جشن سرسید تقریبات کا نیو ہورائزن پبلک اسکول، زیدی سوسائٹی میرٹھ میں شہر قاضی پروفیسر زین الراشدین کی سرپرستی میں شاندار آغاز ہوا جس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور ڈاکٹر معراج الدین (سابق وزیر، حکومت اترپردیش) اور مہمانان ذی وقار کے طور پر قاری شفیق الرحمٰن قاسمی اور سید جاوید اختر شریک ہوئے اور نظامت کے فرائض آفاق احمد خاں نے انجام دیے۔ استقبالیہ کی رسم محترم طالب زیدی اور شکریے کی رسم اسکول کی پرنسپل محترمہ تنویر فاطمہ نے ادا کی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 14 اکتوبر 2014

## عالمی اتحاد ملت کانفرنس

**قنوج:** بھارت صوفیہ کا ملک ہے جہاں سلسلہ چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور قادریہ کے ہزاروں صوفی علما و مشائخ نے انسانوں کو حق وانصاف کی تعلیم دی ہے، اخلاقی تربیت کی ہے، فکر وعمل کی اصلاح کا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے نتیجے میں ایک گنگا جمنی تہذیب نے بھارت میں جنم لیا اور بھائی چارہ کا معاشرہ تیار ہوا جس کی مثالیں باہری دیشوں میں دی جاتی ہے۔ یہ باتیں سیمینار و کانفرنس کے مہمان خصوصی حضرت علامہ شمیم محمد افضل نقشبندی ڈائرکٹر جنرل اسلامک فاؤنڈیشن بنگلہ دیش نے عالمی اتحاد امت کانفرنس میں کہیں۔ کانفرنس میں حضرت مفتی آفاق احمد نقشبندی بانی وسربراہ جامعہ احمدیہ (داعی وکنوینر) نے ملت کے اتحاد پر زور دیا۔ سیمینار کی پہلی نشست میں جامعہ منظر اسلام، جامعہ رضا بریلی اور جامعہ احمدیہ کے منتہی طلبہ نے 'اسلام اور تعمیر ہند' کے موضوع پر مقالات پیش کیے گئے۔ دوسرے دن مولانا جاوید عنبر مصباحی انڈمان نکوبار، مولانا محمد ظفر الدین برکاتی و مولانا غلام رسول دہلوی دہلی، ڈاکٹر عبدالسلام جیلانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا فہیم احمد ازہری بدایوں، مولانا ذاکر حسین اشرفی پنڈوہ بنگال، مولانا نور محمد مصباحی برکاتی کپل وستو نیپال نے 'مسلمان اور تعمیر ہندوستان' کے تحت مقالات پیش کیے۔ دوسری نشست میں محقق مسائل جدیدہ مفتی محمد نظام الدین رضوی رئیس الاساتذہ جامعہ اشرفیہ اور مولانا شمس الہدیٰ مصباحی مبارکپور، مولانا بشارت حسین صدیقی جدہ سعودی عرب، مولانا انوار احمد بغدادی علیمیہ جمدا شاہی بستی وغیرہ نے اپنے مقالات پیش کیے اور مولانا لیٰسین اختر مصباحی دہلی، ضلع قنوج کے افسر اعلیٰ ڈی ایم اور ایس ڈی ایم صاحبان نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایس ڈی ایم قنوج نے نوجوانوں سے کہا کہ ''پڑھتے جاؤ بڑھتے جاؤ''، جب کہ ڈی ایم نے 'یہ صدی تعلیم اور تکنیک کی صدی ہے' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی میدان میں بھارت کی تعمیر وترقی میں بھارتیہ مسلمانوں کی حصے داری اور بھومیکا کو بتانے اور گنانے کی ضرورت نہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اکتوبر 2014

**بہار:**

## ایس سی آر ٹی کا سہ روزہ ترجمہ تربیتی پروگرام

**پٹنہ:** 11 اکتوبر 2014 ایس سی ای آر ٹی پٹنہ اور قومی ترجمہ مشن میسور کے اشتراک سے ایس سی ای آر ٹی پٹنہ

کے کانفرنس ہال میں سہ روزہ مترجم تربیتی پروگرام کا انعقاد ہوا۔ 11 اکتوبر کو پروگرام کا افتتاحی اجلاس ہوا جس کی

صدارت قاسم خورشید نے کی۔ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے میسور سے تشریف لائے ڈاکٹر انور نے پروگرام کے اغراض و مقاصد اور ترجمہ کی اہمیت کو تفصیلاً بیان کیا۔ بعدازاں ڈاکٹر قاسم خورشید نے اپنے صدارتی خطبہ میں ترجمہ اور اس کے فن کا تفصیلی احاطہ کرتے ہوئے ترجمہ کے مختلف رموز و نکات سے مترجمین و حاضرین کو آشنا کیا۔ پروگرام کے روح رواں ڈاکٹر انور اوّل تا آخر اپنے تجربات و مشاہدات سے حاضرین کو روشناس کراتے رہے۔ موصوف نے مشن کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ آئین کی آٹھویں جدول میں درج تمام ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کے ذریعہ علمی متون تک رسائی کے لیے 'قومی ترجمہ مشن' کی تشکیل حکومت ہند کی ایک خوش آئند پیش رفت ہے۔ جس کا بنیادی مقصد مختلف علوم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ترجمہ شدہ مواد کی فراہمی نہایت ضروری ہے۔ ایس سی ای آر ٹی پٹنہ کے ڈائریکٹر حسن وارث نے بھی اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ ترجمہ کے حوالے سے بہار میں پہلی بار اتنے بڑے پروگرام کا انعقاد ہوا جس سے یہاں کے دانشوروں میں ایک نیا پیغام جائے گا۔ IGNOU دہلی کے پروفیسر سوشانت کمار نے ترجمہ کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ترجمہ کے دوران پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے حل کی طرف حاضرین کو متوجہ کیا اور ترجمہ کی باریکیوں کو علمی انداز میں واضح کیا۔

رپورٹ: ڈاکٹر نثار احمد فیضی، پٹنہ، 27 اکتوبر 2014

**تلنگانہ**

## اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر

**جگتیال:** محمد قلی قطب شاہ نہ صرف اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا بلکہ شہر حیدرآباد اور اس کی عظیم تر گنگا جمنی تہذیب کا بھی بانی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہم محمد قلی قطب شاہ کی چھوڑی ہوئی مذہبی رواداری اور گنگا جمنی تہذیب کی عظیم تر روایات کو پروان چڑھائیں ان خیالات کا اظہار پروفیسر اکبر علی خان ڈین شعبہ کامرس عثمانیہ یونیورسٹی و سابق وائس چانسلر تلنگانہ یونیورسٹی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی ویمنس ڈگری کالج جگتیال میں یو جی سی اور تحریک اردو تلنگانہ کے اشتراک سے منعقدہ دو روزہ ریاستی اردو سیمینار بعنوان 'محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر' کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ کالج پرنسپل کے کشن کی صدارت میں منعقد ہونے والے سیمینار میں کلیدی خطبہ پروفیسر مجید بیدار عثمانیہ یونیورسٹی نے دیا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر معید جاوید صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم چیئرمین بورڈ آف اسٹڈیز اورینٹل اردو عثمانیہ، ڈاکٹر جعفری شعبہ اردو شاتاواہانہ یونیورسٹی، ڈاکٹر حمیرہ تسلیم صدر شعبہ اردو شاتاواہانہ یونیورسٹی کریم نگر نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ کنوینر سیمینار خان ضیا نے خیر مقدمی تقریر کی۔ پروفیسر مجید بیدار نے اپنے کلیدی خطبے میں محمد قلی قطب شاہ کے شعری سفر کو بیان کیا اور کہا کہ محمد قلی پہلا شاعر ہے جس نے دکنی زبان کو اس قابل سمجھا کہ اس میں شاعری کی جائے۔ وہ قومی یکجہتی کا علمبردار شاعر تھا۔ جگتیال کے متوطن اور عثمانیہ یونیورسٹی میں نام روشن کرنے والے ڈاکٹر فضل اللہ مکرم نے کہا کہ قلی قطب شاہ اردو کا پہلا شاعر تھا جس نے تلگو میں بھی شاعری کی تھی۔ اس موقعے پر سیمینار میں پیش ہونے والے مقالوں پر مشتمل سوونیر کی رسم اجرا مہمانوں نے انجام دی۔ افتتاحی اجلاس کے اختتام کے موقعے پر کالج کی طالبات کی جانب سے دور قدیم کا تمثیلی مشاعرہ کامیابی سے پیش کیا گیا جس میں طالبات نے شعرا کا روپ دھار کر قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر وغیرہ کا کلام سنایا اور مہمانوں اور سامعین سے داد حاصل کی۔ ظہرانے کے بعد کے اجلاس کی صدارت پروفیسر مجید بیدار عثمانیہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر فضل اللہ مکرم عثمانیہ یونیورسٹی نے کی۔ اجلاس میں کئی اہم مقالے پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 15 اکتوبر 2014

'نظام آباد میں یوم سرسید کے اہتمام' کا منظر

## نظام آباد میں یوم سرسید کا اہتمام

**نظام آباد:** سرسید احمد خان انیسویں صدی کے عظیم مصلح قوم، ماہر تعلیم، ادیب، دانشور مفکر اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے۔ انھوں نے اپنے دور میں جو تعلیمی، اصلاحی اور تعمیری فکر شروع کی اس کے اثرات آج بھی مسلمانوں اور عہد حاضر کی ترقی یافتہ قوموں میں ملتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جناب محمد نصیر الدین صاحب کوآرڈینیٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی تعلیم اسٹڈی سنٹر نظام آباد میں یوم سرسید سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں طلبا اور اساتذہ موجود تھے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو گری راج گورنمنٹ کالج نظام آباد نے اس موقعے پر 'سرسید کی حیات اور کارناموں کی عصری معنویت' موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زندہ قوموں کی نشانی ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں بلکہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

پریس ریلیز، اسلم فاروقی، نظام آباد، مہاراشٹر، 19 اکتوبر 2014

## انجمن ترقی اردو کا آٹھواں ماہانہ ادبی اجلاس

**حیدرآباد:** شاعری دراصل اپنے لطیف جذبات اور دلی احساسات کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ شاعری تجرباتِ زندگی، مشاہدات اور ایک آرٹ بھی ہے۔ شاعری تصوراتی، جمالیاتی اور رومانی تخیل کا اظہار ہے۔ ان خیالات کا اظہار اسلم فرشوری نے 'ایوانِ صابر' مغل پورہ میں انجمن ترقی اردو عظیم تر حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ آٹھویں ماہانہ ادبی اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔ انجم شافعی نے مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ اگر شاعری جدیدیت کے لبادے میں ظہور پذیر ہو تو وہ شاعری مسائلی اور تجرباتی بن کے رہ جاتی ہے اور اس میں وہ چاشنی رہتی ہے اور نہ وہ تاثر جو اس کا خاصہ ہونا چاہیے۔ وہی شاعری مقبول عام ہوتی ہے جو حضرت امیر خسرو سے قلی قطب شاہ اور پھر میر و غالب سے لے کر آج تک جو روایتی انداز میں کہی گئی ہے جو آج بھی زبان زد خاص و عام ہے۔ ڈاکٹر سلیم عابدی نے مذاکرے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ''وہی شاعری مقبول عام ہوتی ہے جو عام فہم اور آسان زبان میں کی گئی ہو'' اس یادگار مذاکرے کی

صدارت ممتاز وسینئر صحافی محمد مسعود فضلی صدر انجمن ترقی اردو عظیم تر حیدر آباد نے کی۔ سید فضل الحق رضوی کے اظہارِ تشکر پر ادبی اجلاس ونعتیہ مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

روز نامہ 'منصف' حیدر آباد، 30 اکتوبر 2014

## اکیسویں صدی میں حالی اور شبلی کی معنویت

**حیدر آباد:** مولانا آزاد نیشنل اردو کے شعبہ اردو کی جانب سے یونیورسٹی کے لائبریری آڈیٹوریم میں کینیڈا سے آئے معروف محقق و دانشور ڈاکٹر سید تقی عابدی کے

خطاب کا انعقاد عمل میں آیا جس میں انھوں نے 'اکیسویں صدی میں حالی اور شبلی کی معنویت' پر سیر حاصل گفتگو کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ حالی کے معاصرین میں ایک سے بڑھ کر ایک ادیب، شاعر، عالم، فاضل اور صاحب طرز موجود تھے مگر آج اکیسویں صدی میں حالی کی نثر کی پیروی ہورہی ہے اور آئندہ بھی کی جائے گی۔ ان کی سوانح نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ تقریباً ایک سو سال میں غالب پر 118 کتابیں لکھی گئیں مگر کچھ تسامحات کے باوجود یادگار غالب کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جہاں تک شبلی کی بات ہے انھوں نے اردو زبان کو وہ معیار دیا کہ عربی و فارسی کے ساتھ اس کا نام لیا جانے لگا۔ شبلی جذباتی اور سیمابی طبیعت کے مالک تھے اس لیے علی گڑھ، ندوہ پھر اعظم گڑھ چلے گئے مگر جہاں رہے علمی فیضان جاری رہا۔ ڈاکٹر فیروز احمد، پروفیسر شعبہ اردو نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سرسید کی صحبتیں اور فکر اور عمل نے ہی ان دونوں کی تربیت کی جس سے ان کی علمی، ادبی اور فکری جہات سامنے آئیں۔ یونیورسٹی کے نائب شیخ الجامعہ ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اس طرح کے خطبات کا اہتمام ہوتے رہنا چاہیے کیونکہ تحقیق کے لیے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔

روز نامہ 'منصف' حیدر آباد، 30 اکتوبر 3014

**کیرالا:**

## انجمن ترقی اردو کیرالہ کی مشاورتی میٹنگ

**کالی کٹ:** کیرالا کی مشہور و معروف فروغ اردو تنظیم 'انجمن ترقی اردو کیرالا' کی جانب سے کالی کٹ میں ایک مشاورتی میٹنگ کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس میں کمیٹی کے ریاستی ممبران شریک ہوئے۔ مشاورتی اجلاس میں فروغ اردو کے تئیں نیشنل اردو سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقعے پر تنظیم کے صدر ایم پی عبدالصمد صمدانی نے کہا کہ اردو زبان قومی یکجہتی کی علامت ہے۔ آزادی ہند میں اردو زبان نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ماہ دسمبر کے آخر میں کالی کٹ میں ایک روزہ عظیم الشان قومی سیمینار کا انعقاد کیا جائے گا۔ حالانکہ ابھی تک تاریخ متعین نہ ہوسکی۔ انھوں نے بتایا کہ تنظیم فروغ اردو کی خاطر مسلسل جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے۔ تعلیمی مقابلہ، خصوصی سیمینار، اردو ڈے، انعامی مقابلہ وغیرہ پروگرام مستقل منعقد ہوتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس سیمینار میں ملک بھر سے اردو نمائندگان تشریف لا رہے ہیں۔ اس موقعے پر تنظیم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر کے عبدالغفور نے سالانہ رپورٹ بھی پیش کی۔

روز نامہ 'خبریں' دہلی، 8 اکتوبر 2014

**کرناٹک:**

## 'اردو زبان وادب کے فروغ میں غیر مسلم قلمکاروں کا حصہ

**دھارواڑ:** کرناٹک یونیورسٹی کے کرناٹک آرٹس کالج دھارواڑ میں شعبۂ اردو فارسی اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے مالی اشتراک سے 'اُردو زبان وادب کے فروغ میں غیر مسلم قلم کاروں کا حصہ' کے موضوع پر دوروزہ قومی اُردو سیمینار کا انعقاد بی۔بی۔اے سیمینار ہال میں کیا گیا۔ جناب کرشن کمار طور نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شمع روشن کرکے سیمینار کا افتتاح کیا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر اس کی پرورش کی ہے۔ ڈاکٹر مجید بیدار صاحب سابق صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے اُردو ادب کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک کے تمام غیر مسلم قلم کاروں کے خدمات پر بحسن وخوبی روشنی ڈالی اور ایک طویل جامع کلیدی خطبہ پیش کیا۔ سیمینار کا آغاز مولانا محمد کلیم اشرف ریسرچ اسکالر کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا بعد ازاں چیترا اور ان کے ساتھیوں نے بھگوت گیتا پڑھی، اللہ بخش ہومنی (بی ایس سی) نے نبی کریم کی خدمت اقدس میں نعت شریف کا نذرانہ پیش کیا، کرناٹک میوزک کالج دھارواڑ کی طالبات چیترا اور ساتھیوں نے ناڈگیت (کرناٹک کا قومی ترانہ) پیش کیا۔

حنا کوثر، ثمرین اور سلیمان نے مرحوم عثمان شاہد مولوی کا تخلیق کردہ ترانہ 'اُردو شیریں سخن ہے اُردو رنگ چمن ہے اُردو' پیش کرکے محفل کو مسحور کردیا اعزازی مہمان ڈاکٹر چندر مانگنگی (رجسٹرار کرناٹک یونیورسٹی۔ دھارواڑ) اور ڈاکٹر ایس، ایس، کٹی منی پرنسپل کرناٹک آرٹس کالج، دھارواڑ، راجیشوری مہیشوریا نائب پرنسپل نے اپنے خیالات سے نوازا۔ افتتاحی تقریب کی نظامت ڈاکٹر نسیم بانو نے انجام دیں۔ ڈاکٹر سلیمیٰ بی کولور نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی، پہلا اجلاس گلبرگہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس ڈاکٹر حمید اکبر کی صدارت میں ہوا اس میں ڈاکٹر سلیمیٰ بی کولور دھارواڑ، ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، کاروار، پروفیسر انیس الحق ناندیڑ (مہاراشٹرا)، محمد اقبال کرمڈی نے مقالے پیش کیے۔ ں کھانے کے وقفہ کے بعد دوسرے اجلاس کا انعقاد ہوا ڈاکٹر سید قدیر ناظم سرگرو وظیفہ یاب صدر شعبۂ اُردو وفارسی کرناٹک آرٹس کالج دھارواڑ کی صدارت میں ڈاکٹر کے، وی، نکولن کیرلا، پروفیسر سلیم دولت کوٹی بیجاپور، پروفیسر ریشما حسینی ہبلی، پروفیسر الیاس احمد پٹویگر ہبلی نے مقالے پیش کیے۔ چائے کے وقفے کے بعد تیسرا اجلاس ڈاکٹر مجید بیدار حیدرآباد کی صدارت میں ہوا۔ پروفیسر رؤف خوشتر بیجاپور، ڈاکٹر منظور دکنی گلبرگہ، ڈاکٹر داؤد محسن، ڈاکٹر نسیم بانو نے مقالے پڑھے۔

دوسرے روز چوتھے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عقیل شاہ مدار صاحب نے کی جس میں ڈاکٹر ایچ پی تبسم ہاسن، ڈاکٹر یاسمین فاطمہ دھارواڑ، پروفیسر حافظ جبین میسور، پروفیسر صفی ناز میسور، ڈاکٹر ضیاء قاضی بنگلور نے مقالے پیش کیے۔ پانچواں اجلاس ڈاکٹر فہیم صدیقی ناندیڑ مرٹھواڑا مہاراشٹرا کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی شکاری پور شیموگہ، ڈاکٹر علیم اللہ بیجاپور، فاطمہ النسا بیگم میسور، محمد کلیم اشرف، الیاس احمد خواجہ پوری، اسمٰعیل سوداگر نے مقالے پیش کیے۔ چائے کے وقفہ کے بعد چھٹا اجلاس ڈاکٹر فاطمۃ الزہرہ ہاسن کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں بی بی رضا خاتون کا مقالہ ان کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر علیم اللہ نے پڑھا۔ ریاض احمد سوریا گول، اور رضیہ خان سرسی، نور جہان ہبلی، نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اختتامی جلسے میں انیل ٹھکر (ہبلی) ڈرامہ و ناول نگار نے کہا کہ اُردو کے سمینار میں دعوت نامے اُردو زبان ہی میں چھاپنے چاہیے۔ ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ جناب کرشن کمار طور نے مبارک باد پیش کی، شہر ہبلی کے مظہر محی الدین نے کہا کہ عام طور پر لوگ یہ جانتے

ناگپور میں یک روزہ قومی سیمینار کا منظر

ہیں کہ انھیں کیا بولنا ہے عقل مند آدمی وہ ہے کہ وہ یہ بھی جانے کہ اسے کیا نہیں بولنا ہے، ڈاکٹر حیدر کرنڈی نے کہا کہ مجھے میرے اس شاگرد پر فخر ہے کہ انھوں نے کرناٹک کالج کے شعبۂ اُردو میں اپنی اعلیٰ کارکردگیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں اور اس موضوع پر سیمینار کو منعقد کرکے کرناٹک کالج کی تاریخ میں ایک یادگار نقش چھوڑ دیا ہے۔ ڈاکٹر سلیمٰی بی کولور نے سیمینار کی تفصیلی رپورٹ پڑھی اور ہدیہ تشکر پیش کیا۔

پریس ریلیز، ایس اے کولر، ایچ او ڈی، شعبۂ اردو، کے اے سی ڈی، کرناٹک، 23 اکتوبر 2014

**مہاراشٹر**

## ناگپور میں یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد

**ناگپور:** یشودا گرلز آرٹس اینڈ کامرس کالج ناگپور کے زیراہتمام اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن دہلی کے مالی اشتراک سے ونامتی ہال ناگپور میں یک روزہ قومی سیمینار بعنوان 'غیر مسلم اردو شعرا کی شعری خدمات' کا انعقاد ہوا۔ معروف اردو شاعر جناب ساگر ترپاٹھی (ممبئی) نے سیمینار کا افتتاح کیا۔ موصوف نے غیر مسلم اردو شعرا کی بے مثال خدمات پر فخر کا اظہار کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر مجید بیدار نے پرمغز کلیدی خطبے میں ابتدا تا حال غیر مسلم شعرا کی شعری خدمات کا تاریخی جائزہ پیش کیا اپنے عالمانہ خطبے میں موصوف نے اردو کے حال و مستقبل پر تشویش کا اظہار کیا۔

افتتاحی تقریب کی صدارت کالج انتظامیہ کے رکن شری کانت گھوگرے نے کی۔ نظامت کے فرائض سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد اظہر حیات نے انجام دیے۔ اس موقعے پر مہمانان کے دست مبارک سے 'غیر مسلم شعرا کی شعری خدمات' کے عنوان سے ایک مجلّے کا اجرا بھی ہوا جس میں ملک کے مختلف کالجوں کے اسکالرز کے ضمنی عنوانات پر 40 مقالے شامل ہیں۔ واضح ہو کہ اس مجلّے کو ڈاکٹر محمد اظہر حیات نے ترتیب دیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر گووند راؤ ڈیکر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر اظہر ابرار احمد، ناگپور، مہاراشٹر، 18 اکتوبر 2014

## ممبئی میں گول میز مذاکرہ

**تربھے:** ''صدر مدرسین، اساتذہ، منتظمین اور والدین اپنی اپنی ذمے داریوں کو پورا کریں تو اردو اسکولوں کا معیار بڑھ جائے گا اور اسکولوں کے بند ہونے کا مسئلہ ختم ہوجائے گا۔'' ان خیالات کا اظہار صدر جلسہ جناب عبدالکریم سالار صاحب اور دیگر شرکا نے مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی کے تعاون سے اور الحسنات ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، نئی ممبئی کے زیراہتمام ہوٹل یوگی ایگزیکیٹیو میں 'اردو اسکولوں کی بقا' کے عنوان سے منعقد گول میز مذاکرہ میں کیا۔ اس مذاکرے میں ریاست کے کئی اضلاع سے ماہرین تعلیم اور دانشوران جناب عبدالکریم سالار (جلگاؤں)، جناب شکیل انجینئر (اکولہ)، جناب سلیم الدین ظفر (ناگپور)، جناب اسحٰق خضر (مالیگاؤں)، جناب وقار احمد شیخ (شولاپور)، جناب جان عالم رہبر (بھیونڈی) کے علاوہ بمبئی سے جناب حامد اقبال صدیقی، جناب سرفراز آرزو، جناب زبیر اعظمی، جناب قاسم رضا، جناب عبدالماجد، جناب محمود پرویم انصاری، جناب عبدالرحمٰن قریشی، جناب فاروق سید، جناب اقبال کوارے اور لنترانی میڈیا ہاؤس سے منور سلطانہ نے شرکت کی۔ جاوید مکرم نے اورنگ آباد سے، رشید انجینئر صاحب نے پربھنی سے اور کاظم ملک نے بمبئی سے اپنی تجاویز تحریری طور پر بھیج دی تھیں۔

رپورٹ: عبدالرؤف خان، تربھے، نئی بمبئی، 27 اکتوبر 2014

**تہذیب و ثقافت:**

## پھول والوں کی سیر کے تحت تقریب کا انعقاد

**نئی دہلی:** فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی علامت 'پھول والوں کی سیر' کی تقریبات کا سلسلہ جاری ہے دو روز قبل دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ کو پھولوں کا پنکھا پیش کرکے اس تقریب کے آغاز کے بعد ایل جی نے روایات کے مطابق درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ پر حاضری دی اور پھولوں کی چادر پیش کی۔ ان کے ہمراہ دہلی پولیس کمشنر بی ایس بسی بھی موجود تھے۔ شام کو لیفٹیننٹ گورنر نے درگاہ میں حاضری دی جہاں کمیٹی کی جانب سے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ لیفٹیننٹ گورنر نے درگاہ میں نہایت عقیدت کے ساتھ پھولوں کی چادر پیش کی۔ اس دوران ایل جی نے کہا کہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور بین المذاہب کی جو مثال پھول والوں کی سیر میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ ہمارا قومی اثاثہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری آنے والی نسلوں کو یہ وراثت قائم رکھنی ہے۔ بی ایس بسی نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ انجمن گل فروشاں اگلے سال اس تقریب کو بڑے پیمانے پر کرے اور اس میں صدر جمہوریہ کو بھی مدعو کرے تاکہ پورے ملک میں بھائی چارہ کا پیغام پہنچے۔ کمیٹی کے رکن شیر علی نے ایل جی اور دیگر مہمانان کی دستار بندی کی۔ درگاہ کی مسجد کے امام مولانا اشتیاق احمد برکاتی نے ملک میں امن و امان، بھائی چارہ، قومی اتحاد کے ساتھ ساتھ کشمیر کے سیلاب متاثرین کے لیے خصوصی دعا کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اکتوبر 2014

## بین الاقوامی ثقافتی میلہ

**نئی دہلی:** انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے زیراہتمام 'آئی آئی سی تجربہ 2014: فنون کا ایک میلہ' کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر 'گم شدہ دنیا کا جھروکا: پہاڑی املی' کے نام سے ایک نمائش بھی لگائی گئی۔ اس نمائش میں دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن کے زیراہتمام جاری 'شاہ ولی اللہ پبلک لائبریری' کی نایاب کتب کو ڈیجیٹل شکل میں پیش کیا گیا۔ اس سالانہ بین الاقوامی ثقافتی میلے میں پہاڑی املی اور شاہ ولی اللہ پبلک لائبریری کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے کیونکہ گزشتہ دنوں کچھ نادر کتابوں میں دیمک لگ جانے کی خبر کے بعد یہ لائبریری خصوصی توجہ کا باعث بنی ہوئی ہے۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر ایشیا پروجیکٹ کی چیئرپرسن اور سینٹر کی تاحیات ٹرسٹی ڈاکٹر کپلا واتسیانن نے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں 'آئی آئی سی تجربہ 2010: فنون کا ایک میلہ' کا افتتاح کیا۔ دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن کے سرپرست عبدالستار اور پہاڑی املی کے بزرگ نسیم بیگ خاں چنگیزی کے ذاتی کتاب خانوں سے بھی اس نمائش میں استفادہ کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر ایسوسی ایشن کے صدر محمد نعیم نے آئی آئی سی کے ساتھ کام کرنے کے تجربے کو نیا اور بے نظیر بتاتے ہوئے لائبریری کو خصوصی مقام دینے کے لیے آئی آئی سی کا شکریہ ادا کیا۔ آئی آئی سی کی ڈائریکٹر ڈاکٹر کویتا اے شرما نے کہا کہ دہلی یوتھ

ویلفیئر ایسوسی ایشن کے تعاون کے بغیر ہمیں پہاڑی املی کی ثقافت کا علم نہیں ہوسکتا تھا۔ انھوں نے ایسوسی ایشن کے عہدے داران وممبران کی لگن اور تعاون کی ستائش کی۔ آئی آئی سی کے چیف لائبریرین ڈاکٹر ایس مجمدار نے لائبریری میں موجود کتب کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے ایسوسی ایشن کی تعریف کی اور کہا کہ مقامی انتظامیہ اور حکومت کو اس لائبریری میں موجود نادر و نایاب کتب کے خزینے کی حفاظت کے لیے ہر ممکن تعاون کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 اکتوبر 2014

## سول سرویسز آفیسرس انسٹی ٹیوٹ میں کوی سمیلن ومشاعرے کا انعقاد

**نئی دھلی:** ادیب اور شاعر لفظوں اور شبدوں کا محافظ اور ان کی حرمت کا پاسبان ہوتا ہے۔ الفاظ کو معنی کا جامہ پہنانا، انھیں نئے مفاہیم سے ہمکنار کرنا اور ان کو زبان زد خاص و عام کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف فکشن رائٹر اور شاعر، چیف کمشنر انکم ٹیکس، سید محمد اشرف نے سول سرویسز آفیسرس انسٹی ٹیوٹ (سی ایس او آئی) میں منعقد کوی سمیلن مشاعرہ میں اپنی صدارتی خطاب میں کیا۔ بیوروکریٹس شعرا کو معنون اس مشاعرے کا انعقاد اردو ہیریٹیج کارواں کی محرک ادبی و ثقافتی تنظیم آئیڈیا کمیونیکیشنز نے سی ایس او آئی کے اشتراک سے کیا تھا۔ مشاعرہ کی نظامت آئیڈیا کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے کی جبکہ استقبالیہ کلمات سی ایس او آئی کے جنرل منیجر کرنل راجندر کمار نے ادا کیے۔ کویوں اور شاعروں میں بیوروکریٹک سرکل سے سید محمد اشرف کے علاوہ نینا کمار (کمشنر انکم ٹیکس)، گجانند پرساد (ایگزیکیوٹو ڈائرکٹر، ریلوے بورڈ)، ارون بھٹناگر (کمشنر انکم ٹیکس)، ابھے کمار بیباک (ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل، سی آئی ڈی، بہار)، تجیندر لوتھرا (جوائنٹ کمشنر، دلی پولیس)، منوج اگروال (ڈپٹی ویجلنس آفیسر، نارتھ سنٹرل ریلوے)، مظفر ابدالی (ڈائرکٹر، منسٹری آف کمیونیکیشن) کے علاوہ منور رانا، خوشبیر سنگھ شاد، طارق قمر اور پروین شکلا نے اپنی شاعری سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں سید محمد اشرف نے بتایا کہ ہندوستانی بیوروکریسی میں شاعری کی روایت بے حد قدیم ہے۔ یہ اکبر کے درباری ابوالفضل اور عبدالرحیم خان خاناں سے چلی آرہی ہے۔ آصف اعظمی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ منور رانا نے اس قسم کی محفلوں کو غنیمت بتاتے ہوئے کہا کہ یہ گنگا جمنی تہذیب کا مظہر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی دو سگی بہنیں ہیں۔ ہندوستان کی ترقی کا خواب ان دونوں زبانوں اور ان سے جڑی تہذیب کے بنا ادھورا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 اکتوبر 2014

## ملکہ غزل کا صد سالہ جشن سالگرہ

**نئی دھلی:** ملکہ غزل کے نام سے مشہور بیگم اختر کی صد سالہ جشن سالگرہ تقریبات کی شروعات ہوگئی ہے، جو کہ ایک سال تک چلیں گی، اس موقعے پر وزارت برائے کلچرل امور کی جانب سے بیگم اختر کے نام سے 100 روپے اور 5 روپے کے یادگاری سکے بھی جاری کیے گئے ہیں۔ نیشنل میوزیم آڈیٹوریم جن پتھ میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں بیگم اختر کے نام سے سکے کے اجرا کے موقعے پر مرکزی وزیر برائے کلچرل امور شریپڈ نائک نے

بیگم اختر کے نام سے یادگاری سکے جاری کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے ثقافت

بیگم اختر کی پرکشش غزل گوئی کی ستائش کرتے ہوئے انھیں غزل گوئی کا 'وقار' بتایا۔ تقریب میں مشہور گلوکار ڈاکٹر ریتا گانگولی (دادرا)، ششانک شیکھر (ٹھمری) اور پرتھا مکھرجی (غزل) نے اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا۔ تقریب کے افتتاح پر موصوف وزیر نے بتایا کہ 'اختر بائی فیض آبادی (7 اکتوبر 1914، 30 اکتوبر 1974) جو کہ بیگم اختر کے نام سے مشہور تھیں، غزل گوئی میں بہت ہی مہارت رکھتی تھیں، اس کے علاوہ انھوں نے دادرا اور ٹھمری کے فن میں بھی شوق آزمائی کی، اپنے خوبصورت فن کے لیے انھیں سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ بھی دیا گیا اس کے علاوہ پدم شری اور پدم بھوشن جیسے موقر اعزازات سے بھی سرفراز ہوئیں۔ انھیں ان کی خوبصورت غزل گوئی کے لیے ملکہ غزل کا خطاب دیا گیا' مرکزی وزیر نائک نے مزید کہا کہ ''بیگم اختر نے ہندوستانی فنون میں جس قابل قدر سرمایہ کا اضافہ کیا ہے، اس پر ہمیں فخر ہے۔'' قابل ذکر ہے کہ بیگم اختر کی یاد میں سال بھر تقریبات جاری رکھنے کے لیے مرکزی وزیر کی نگرانی میں ایک این آئی سی (قومی نفاذ کمیٹی) بنائی گئی ہے، تاکہ یادگاری سال میں ہونے والے پروگرام طے کیے جائیں۔ وزارت کے افسران نے بتایا کہ ''بیگم اختر کی یاد میں جو پروگرام ہوں گے وہ ان شہروں میں منعقد کیے جارہے ہیں جہاں غزل، دادرا اور ٹھمری کی روایتیں جڑی ہوئی ہیں، ان میں سے سب سے اہم صدی تقریبات ہیں جو دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، بھوپال اور کولکاتہ میں منعقد ہوں گی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 8 اکتوبر 2014

## آل انڈیا چہار بیت مقابلہ

**رام پور:** لوک ہت سوشیو کلچرل ڈیولپمنٹ ایسوسی ایشن کی جانب سے جیل روڈ واقع گھونگھٹ میرج ہال میں آل انڈیا چہار بیت مقابلہ کا انعقاد کیا گیا۔ استاد چہار بیت خواں امجد اللہ خاں خنجر کی نسبت سے یاد خنجر کے عنوان سے منعقدہ مقابلہ چہار بیت میں شان ہند پارٹی ٹونک راجستھان کے علاوہ رامپور کے 21 اکھاڑوں پر مشتمل 3 گروپ ریڈ، گرین اور وائٹ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس موقعے پر اپنے آبا و اجداد کی وراثت کو زندہ رکھنے والے استاد غلام علی خاں کے پوتے استاد محمد امین خاں غزنی نے چہار بیت کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے عبدالکریم خاں کو رامپور میں چہار بیت کا بابا آدم قرار دیا۔ انھوں نے بتایا کہ 1774 رامپور ریاست کے قیام کے بعد نواب فیض اللہ خاں نے بہت سے پٹھان سرداروں کو رامپور بلا کر آباد کیا۔ ان کے ساتھ ہی فن چہار بیت کا بھی رامپور میں آغاز ہوا۔ استاد امین خاں نے کہا کہ ہندوستانی پٹھانوں نے یہاں کی تہذیب وتمدن کے فروغ میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ پٹھانوں نے ہندوستان میں لودھی اور سوری سلطنتوں سے لے کر عہد نوابین تک ہر زمانے میں ہندوستان کے ثقافتی ورثے کی اشاعت اور فروغ میں نہایت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ چہار بیت کو جو کہ آج بھی پشتو زبان اور پٹھان معاشرہ میں ایک عظیم ادبی صنف مانی جاتی ہے۔ ہندوستان میں ایک سوغات کے طور پر پٹھان اپنے ساتھ لائے اور اس نے خود کو اردو زبان کے سانچے میں ڈھال کر خوب ترقی کی۔ چہار بیت مقابلے کے روح رواں اور تنظیم کے صدر زبیر مسعود خاں نے چہار بیت خواں فنکاروں اور شرکا کا استقبال کرتے ہوئے موجودہ دور میں فن چہار بیت کی زبوں حالی پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس سے قبل مقابلے کا آغاز ذاکر صابری اور ساتھیوں کی نعتیہ چہار بیت سے ہوا۔ مقابلے کے اختتام پر سبھی فنکاروں کو سند توصیف اور نشان امتیاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اکتوبر 2014

## اعزاز و اکرام

### دہلی اردو اکادمی کا سالانہ جلسہ تقسیم ایوارڈ

**نئی دہلی:** اردو کسی ایک مذہب کی زبان نہیں ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں کی زبان ہے۔ اردو والوں کے درمیان شامل ہوکر مجھے فخر ہورہا ہے۔ اردو

دہلی سکریٹریٹ میں اردو اکادمی کے سالانہ ایوارڈ 2013 کے دوران ایوارڈ یافتگان کے ساتھ گروپ پوز دیتے ہوئے ایس ایس یادو ڈی ایس سپولیا، پروفیسر خالد محمود، انیس اعظمی، حاجی میاں فیاض الدین، ڈاکٹر عقیل احمد ودیگر

سے عقیدت کی حد تک پیار ہے اور اس کی وجہ میرے والدین کا اردو داں ہونا ہے۔ میرے والد عربی، فارسی و اردو کے اسکالر تھے۔ اور ایک افسانہ نگار تھے۔ خود کو اردو کی کلاسیکی غزلوں کا شائق بتاتے ہوئے کہا کہ بیگم اختر نے اردو غزلوں کو معیار عطا کیا ہے اور میں ان کی غزلوں کو معانی کے ساتھ سیکھنے کی کوشش کررہا ہوں۔ افسوس ہے کہ اتنی پیاری زبان اگر کسی نقصان کی شکار ہوتی ہے تو اس کے ذمے دار ہم خود ہوں گے۔ ان خیالات کا اظہار چیف سکریٹری ڈی ایم سپولیا نے اردو اکادمی، دہلی کے زیراہتمام سالانہ جلسہ تقسیم ایوارڈ سے خطاب کرتے ہوئے دہلی سکریٹریٹ کے آڈیٹوریم میں کیا۔ جبکہ مہمانِ اعزازی کے طور پر ایس ایس یادو سکریٹری، آرٹ اینڈ کلچر ولینگویجز نے شرکت کی۔ پروفیسر شمیم حنفی اور وائس چیئرمین اردو اکادمی پروفیسر خالد محمود بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ نظامت کے فرائض اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے انجام دیے۔ جبکہ ایوارڈ یافتگان کی سوانح ریشما فاروقی نے بیان کی۔ اس موقعے پر محکمہ فن، ثقافت والسنہ کے سکریٹری ایس ایس یادو نے کہا کہ اردو زبان سے زیادہ شیریں، پرلطف اور عالیشان زبان ہندوستان کی زمین پر دوسری کوئی نہیں ہے۔ یادو نے کہا کہ اردو اکادمی کی ذمے داری اٹھا کر مجھے فخر ہے اور مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ اردو اکادمی ملک کی سولہ اردو اکادمیوں میں سب سے نمایاں کردار ادا کررہی ہے۔ اس موقعے پر 1982 سے اب تک کے ایوارڈ یافتگان کو نام بنام یاد کرتے ہوئے سکریٹری اردو اکادمی انیس اعظمی نے کہا کہ ابھی تک اردو اکادمی دلی نے 276 ایوارڈ تقسیم کیے ہیں اور فخر کی بات یہ ہے کہ اردو اکادمی دہلی نے اپنا پہلا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ اردو کے جاں نثار آنند نرائن ملا کو دیا تھا۔ انیس اعظمی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اکادمی کی جملہ کارکردگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ارو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے اپنی تقریر میں کہا کہ پوری اردو دنیا کو ہر سال ایوارڈ فنکشن کا انتظار رہتا ہے اور اکادمی کے معیاری انتخاب یا پھر ان کی کوتاہیوں پر بھی اردو کے لوگ نہایت بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور ہر برس اکادمی ان اردو دوستوں کے مثبت اور منفی رویوں کا استقبال کرتی ہے۔ انھوں نے تمام ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کی۔ جن کو ایوارڈ دیا گیا ان میں کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ پروفیسر سیدہ جعفر، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ پروفیسر شمیم حنفی، ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید ڈاکٹر خاور ہاشمی، ایوارڈ برائے تخلیقی نثر اقبال مہدی، ایوارڈ برائے شاعری فرحت احساس، ایوارڈ برائے ترجمہ ڈاکٹر ارجمند آرا، ایوارڈ برائے اردو صحافت سہیل انجم، ایوارڈ برائے اردو ڈراما شاہد انور کو دیا گیا۔ علالت کی وجہ سے پروفیسر سیدہ جعفر نہ آسکیں اور ان کا ایوارڈ ان کے بیٹے کیپٹن ایس ایچ مہدی نے حاصل کیا جبکہ فرحت احساس بیرونِ ملک ہونے کی وجہ سے نہ آسکے ان کا ایوارڈ ان کے دوست معصوم مرادآبادی نے حاصل کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 نومبر 2014

### سردار شفیق کو فضا ابن فیضی ایوارڈ

**مئو:** مئو کی ادبی اور ثقافتی تنظیم 'حلقۂ ادب وثقافت' کی جانب سے معروف استاد شاعر جناب سردار شفیق کو 'فضا ابن فیضی ایوارڈ'

سے نوازا گیا۔ اس مناسبت سے ان کے فکروفن پر ایک مختصر سیمینار کا بھی اہتمام ہوا۔ یہ پروگرام نگر پالیکا پریشد، مئو کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت جناب ڈاکٹر شکیل احمد نے کی اور نظامت کے فرائض فیضان سعید، لکچرر رضا انٹر کالج، رام پور نے انجام دی۔ پروگرام کا آغاز محمد جابر زماں، ریسرچ اسکالر جے این یو نئی دہلی؛ کے افتتاحیہ کلمات سے ہوا۔ انھوں نے سردار کی شاعری کے گوشوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سردار کے یہاں جو شعری پختگی ہے وہ مانگے کا اجالا نہیں بلکہ انھوں نے اسے طویل تپیا کے بعد حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد حلقۂ ادب وثقافت کی ادبی کارگزاریوں سے متعلق ایک رپورٹ پیش کی گئی جسے جناب شمیم احمد، ریسرچ اسکالر: بی ایچ یو نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر امتیاز ندیم؛ استاد: جامعہ عالیہ عربیہ، مئو نے سردار شفیق کی نظم گوئی کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس پروگرام کے خصوصی مہمان ڈاکٹر ثوبان سعید، ایسوی ایٹ پروفیسر: خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی، لکھنؤ نے سامعین کے سامنے اپنا مقالہ پیش کیا۔ عزت مآب جناب ارشد جمال، سابق چیرمین نگر پالیکا پریشد، مئو اور دیگر مہمانوں کے ہاتھوں سردار شفیق صاحب کو 'فضا ابن فیضی ایوارڈ' پیش کیا گیا۔ اس ایوارڈ میں توصیفی سند، میمنٹو، شال اور دس ہزار روپے نقد شامل تھے، جس میں سابق چیرمین کا خصوصی تعاون بھی شامل رہا۔ چیرمین ارشد جمال نے اپنے خطاب میں سردار صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس ایوارڈ کو وقت کی ضرورت قرار دیا اور حلقۂ ادب وثقافت کے اراکین کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس کے بعد مولانا عبدالغنی فیضی، استاد: جامعہ فیض عام مئو نے پروگرام کے تعلق سے اپنے تاثرات پیش کیے۔ حلقہ ادب وثقافت کے اراکین کی حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر اعظم انصاری، اسسٹنٹ پروفیسر: خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی، لکھنؤ نے مئو میں اس طرح کے ادبی پروگراموں کا سلسلہ وسیع کرنے پر زور دیا۔ پروگرام کے آخر میں صدر محفل محترم ڈاکٹر شکیل احمد نے صدارتی کلمات میں سردار شفیق کی شعری وفکری جہات پر مختصر اور مدلل گفتگو کی اور نفیس احمد، ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی نے اظہار تشکر کیا۔

پریس ریلیز، محمد جابر زماں، صدر حلقۂ ادب وثقافت، مئو، 8 اکتوبر 2014

### عثمان عادل کو حفیظ میرٹھی ایوارڈ

**مظفرنگر:** میرٹھ روڈ پر رحمانیہ کالونی میں مسلم وائس آف انڈیا کے ہال میں پاشا اردو لائبریری کی جانب سے ایک شاندار پروگرام منعقد کیا گیا جس میں مظفرنگر کے استاد شاعر حضرت عثمان عادل کو حفیظ میرٹھی ایوارڈ 2014

سے قاضی فرید پاشا آزاد نے سرفراز کیا۔ واضح ہو کہ فرید پاشا آزاد 50 سے زائد کتابوں کے مصنف اور لائبریری کے بانی ہیں۔ اس موقعے پر عثمان عادل کو 5000 روپے نقد، ایک شال اور ایک سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر صداقت دیوبندی نے کی۔ مہمان خصوصی حاجی اجمل الرحمٰن رہے۔ اس موقعے پر شعرا حضرات نے اپنا کلام بھی پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت لائبریری کے سکریٹری فرخ سیر نے کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 10 اکتوبر 2014

## محمد خلیل کو ابن سینا ایوارڈ

معروف صحافی اور مشہور سائنسی رسالہ 'سائنس کی دنیا' کے سابق مدیر محمد خلیل کو ان کی طویل سائنسی خدمات کا اعتراف

کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے 'ابن سینا' ایوارڈ سے نوازا ہے۔ یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں ابن سینا اکادمی کے زیر اہتمام 'ابن سینا کی شخصیت اور خدمات' کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ عالمی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے ایوارڈ پیش کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اکتوبر 2014

## ترنم ریاض کو سارک ادبی ایوارڈ

جے پور: جے پور کی ڈگی پیلس میں سارک لٹریری ایوارڈ پہلی بار اردو کی مشہور افسانہ و ناول نگار شاعرہ ڈاکٹر

ترنم ریاض کو ایک تقریب میں پروفیسر سامدھونگ رین روچے سابق وزیر اعظم جلاوطن حکومت تبت، ٹھاکر رام پرتاپ سنگھ ڈگی اور اجیت کور کے ہاتھوں دیا گیا۔ ڈاکٹر ترنم ریاض ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی ہیں ان کے دو ناول برف آشنا پرندے اور مورتی شائع ہو چکے ہیں اور کئی افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جن میں میرا درخت سفر، یمبرزل، ابابیلیں لوٹ آئیں گی وغیرہ ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ پرانی کتابوں کی خوشبو بھی شائع ہوا ہے۔

'جشن شوق اثری' پروگرام کا منظر

چشم نقش قدم اور بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب کے نام سے دو تنقیدی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ محترمہ خاص طور سے بچوں کی نفسیات اور کشمیری تہذیب و تمدن کی عکاسی کے لیے جانی جاتی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 اکتوبر 2014

## جشن شوق اثری

لکھنؤ: اردو غزل نئی جہتوں اور نئی سمتوں سے آشنا ہو چکی ہے اور اس پر نہ جانے کتنی زبانوں کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ فیض اور فراق نے بھی غزل کو نئے امکانات عطا کیے ہیں اور جن بنیادوں پر آج کی غزل کا تاج محل کھڑا ہے وہ وہی بنیاد ہے جو جناب شوق اثری کی غزل کی بنیاد ہے۔ ان خیالات کا اظہار عالمی شہرت یافتہ ادیب و شاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے ڈاکٹر شوق اثری کی شاعری کے تعلق سے کیا۔ وہ سلام لکھنؤ (آئینہ ثقافت) کے زیر اہتمام جے شنکر پرساد سبھاگار قیصر باغ میں ڈاکٹر شوق اثری کے اعزاز میں منعقدہ 'جشن شوق اثری' میں بحیثیت صدر خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ امر واقعی خوش کن ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کا اعزاز و اکرام ان کی زندگی ہی میں کریں اور ان سے اپنے تعلق کا اظہار کریں۔ محمد عثمان علی خاں شوق اثری کا شمار رامپور اسکول کے استاد شعرا میں کیا جاتا ہے۔ اب تک شوق اثری کے آٹھ مجموعہ کلام منظر عام پر آ چکے ہیں۔

شہر نگاراں کی معروف ادبی و ثقافتی تنظیم سلام لکھنؤ (آئینہ ثقافت) نے شوق اثری کی مجموعی خدمات کا اعتراف کرنے کی غرض سے شایان شان 'جشن شوق اثری' کا اہتمام کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے معروف نقاد اور دانشور پروفیسر شارب ردولوی نے شرکت کی۔ انھوں نے اپنے مختصر خطاب میں پروگرام کے انعقاد گذاروں کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ شوق اثری کی حیثیت خود اردو شاعری میں ایک روایت کی حیثیت ہے۔ اس موقعے پر شاعری، افسانہ، تنقید، ڈراما، صحافت اور سوشل ورک کے شعبوں میں اہم خدمات انجام دینے والے ممتاز حضرات کو اعزازات سے نوازا گیا جن میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر شارب ردولوی اور شوق اثری کو ان کی ادبی تنقیدی اور شعری خدمات کے اعتراف میں ستون ادب ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر محمد ہارون رشید، لکھنؤ، 11 اکتوبر 2014

## س شین عالم اور نعیم نجمی کو عکس شوق ایوارڈ

رام پور: شہر کے علمی و ادبی حلقوں میں اودھ کی نامور ادبی تنظیم سلام لکھنؤ آئینہ صداقت کی جانب سے معروف شاعر و محقق اور صولت پبلک لائبریری کے صدر سین شین عالم اور معروف شاعر نعیم نجمی کو 'عکس شوق' ایوارڈ دیے جانے پر مسرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ محلہ راجدوارہ واقع غفران فریدی کی رہائش گاہ پر ادبی تنظیم تحریک ادب کی ایک خصوصی میٹنگ ہوئی جس میں تنظیم کے سرپرستوں سین شین عالم اور نعیم نجمی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں عکس شوق کے خطاب سے نوازے جانے پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مبارک باد پیش کی گئی۔ اس موقعے پر تنظیم کے جنرل سکریٹری غفران فریدی نے دونوں افراد کی گلپوشی کر استقبال کیا۔ انھوں نے بتایا کہ گزشتہ دنوں لکھنؤ میں منعقدہ ایک پر وقار تقریب میں ادیب، شاعر اور محقق سین شین عالم اور جواں فکر شاعر نعیم نجمی کو عکس شوق ایوارڈ پیش کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 17 اکتوبر 2014

## ڈاکٹر عالیہ امام کو استقبالیہ

علی گڑھ: ادیب کا کام محض حقیقت کی عکاسی نہیں بلکہ اس کی درستی و نادرستی کا تجزیہ کرنا بھی ہے۔ زندہ ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنے میں ہتھیار بننے کی ترغیب دیتا ہے اور انسان کو بام عروج پر پہنچاتا ہے۔ اردو ادب کے عظیم ادبا و شعرا میں غالب، اقبال، جوش، فیض وغیرہ کے سامنے حقیقت کا تصور واضح تھا۔ تبھی وہ سماج میں توازن کی جستجو کر سکے۔ ان خیالات کا اظہار پاکستان کی معروف ادیبہ اور 18 کتابوں کی مصنفہ ڈاکٹر عالیہ امام نے اردو اکادمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سیمینار ہال میں منعقدہ اعزازیہ تقریب سے خطاب میں کیا۔ انھوں نے

'تہذیب الاخلاق کے سرسید نمبر' کے اجرا کا منظر

کہا کہ دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے فاصلے سمٹ گئے ہیں، یہاں تک کہ تجارتی اور صنعتی دوڑ نے سماجی اقدار کو جانچنے کے پیمانے بدل دیے ہیں۔ ایسے میں ہمیں اپنے ساتھ چلنے والے رہزنوں کا محاسبہ کرنا ہوگا اور غلط کے خلاف صف آرا ہونا ہوگا۔ اس سے قبل پروگرام کنوینر تہذیب الاخلاق کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے مہمان ذی وقار ڈاکٹر عالیہ امام کو تہذیب الاخلاق کا 'سرسید نمبر' پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب 'اکیسویں صدی میں سائنس اور ادب تضاد کہاں؟' لکھ کر خسرو تا اقبال خصوصاً میر انیس کو عالم اسلام کی تاریخ سے اس طرح جوڑا ہے کہ سائنسی نقطہ نظر کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے۔ صدارتی خطبہ میں پروفیسر سید محمد امین نے کہا کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے بزرگی کے باوجود سائنس اور ادب پر بڑا اہم کام کیا ہے۔

پریس ریلیز، فرقان سنبھلی، علی گڑھ، 28 اکتوبر 2014

## جاوید اقبال کو استقبالیہ

**لکھنؤ:** وہ لوگ جو علاقائی نشستوں کے ذریعے ادب کی خدمت کررہے ہیں، اس کے بالمقابل وہ لوگ زیادہ اہمیت کے حامل جو دوسرے ممالک میں اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ضرورت تو آج اس بات کی ہے کہ سبھی مل کر اردو کو فروغ دینے کا کام کریں، تبھی صحیح معنوں میں اردو کی ترقی ہوسکے گی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر خان محمد آصف نے شعر و ادب کی فعال و متحرک تنظیم آل انڈیا مائنارٹی فیڈریشن کے زیراہتمام میزبان انٹرنیشنل ہوٹل میں منعقد ایک تقریب میں کیا۔ یہ پروقار ادبی تقریب مشاعرہ زمینی حقائق سے واقف شاعر جاوید اقبال بدایونی کے اعزاز و استقبال میں ہوئی۔ تقریب میں ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، ڈاکٹر انیس انصاری، حیدر علوی وغیرہ نے مسقط میں 32 برسوں سے مقیم شاعر جاوید بدایونی کے صفات و کمالات اور خدمات کا ذکر کیا۔ جاوید اقبال دو شعری مجموعوں کے مصنف ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 19 اکتوبر 2014

**رسم اجرا:**

## الرحیق المختوم

**نئی دھلی:** انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ساتویں بین الاقوامی اسلامی کتاب میلے میں سراج الدین قریشی نے سیرت پاک پر مشہور تصنیف 'الرحیق المختوم' کے رومن ایڈیشن کا اجرا کیا۔ مکتبہ الحسنات کے ڈائریکٹر فیصل فہیم نے بتایا کہ سیرت پاک پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ واضح رہے کہ الرحیق المختوم (اردو) کا ترجمہ و تصنیف اپنے وقتوں کے جید عالم دین مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ الرحیق المختوم کا یہ رومن ایڈیشن ان لوگوں کو ذہن میں رکھ کر تیار کیا گیا ہے جو اردو سمجھتے ہیں لیکن پڑھ نہیں سکتے۔ انھوں نے کہا کہ اس ایڈیشن سے ایسے لوگوں کو بے حد فائدہ ہوگا۔ اجرا کے بعد سراج الدین قریشی نے اس ایڈیشن کے کئی صفحات کا مطالعہ کیا اور کہا کہ اگر اس طرح کی کچھ اور کتابوں کا رومن ایڈیشن تیار ہوجائے تو اس سے نئی نسل کو اسلام کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 اکتوبر 2014

## تہذیب الاخلاق کا سرسید نمبر

**علی گڑھ:** علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ (ریٹائرڈ) نے اپنے دفتر میں اردو ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' کے خصوصی شمارہ 'سرسید نمبر' کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ انھیں خوشی ہے کہ تہذیب الاخلاق اب انٹرنیٹ پر بھی مہیا ہورہا ہے جس سے دنیا بھر میں پھیلے اردوداں طبقہ کو گھر بیٹھے تہذیب الاخلاق کے مطالعہ کا موقع مل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید نمبر میں جو بھی مضامین شائع کیے گئے ہیں وہ بہت معیاری اور معلوماتی ہیں اور اس سے سرسید شناسی کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔ اس موقع پر تہذیب الاخلاق کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم، شعبۂ ماس کمیونی کیشن کے سربراہ پروفیسر شافع قدوائی، افسر رابطۂ عامہ ڈاکٹر راحت ابرار کے علاوہ تہذیب الاخلاق کی ادارت سے وابستہ افراد بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 اکتوبر 2014

## انگارے کا انگریزی ترجمہ

**نئی دھلی:** 'انگارے' ترقی پسند تحریک کی بنیاد ہے جو انگریزی کے نصاب میں شامل تو تھی لیکن انگریزی ادب کے لوگوں کو اس سے مکمل واقفیت نہ تھی۔ خالد علوی اور وبھا چوہان نے اردو اور انگریزی والوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور بیشتر ناقدین کی رائے یہ رہی ہے کہ 'انگارے' کو ڈاکٹر خالد علوی نے حیات جاوید بخشی جو انھیں ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے کیا۔ اس موقعے پر کناٹ پلیس واقع آکسفورڈ پریس میں ڈاکٹر خالد علوی کے انگریزی ترجمہ 'انگارے' کا اجرا عمل میں آیا۔ واضح رہے کہ مذکورہ کتاب انگارے کے لاتعداد ایڈیشن اردو اور ہندی میں شائع ہوچکے ہیں اور اب اس کو انگریزی بھی آکسفورڈ پریس نے شائع کیا ہے جس کو پہلے ڈاکٹر خالد علوی نے اردو میں مرتب کیا تھا اور بعد میں خالد علوی اور وبھا چوہان نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اس موقعے پر رخشندہ جلیل نے کہا کہ یہ ایک بہت اہم کوشش ہے۔ نریش ندیم نے بھی کتاب کی ستائش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم نومبر 2014

## یونس غازی اور نذیر میرٹھی کی کتابوں کا اجرا

**میرٹھ:** شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے زیراہتمام معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر یونس غازی کے مجموعۂ کلام 'خواب سمندر' اور تحقیقی کاوش 'اردو ادب کے فروغ میں ہندوستانی اکادمی (الہ آباد) کا حصہ' اور نذیر میرٹھی کے شعری مجموعے 'کشت گل' کا رسم اجرا حضرت امیر خسرو اردو بھون کے پریم چند ہال میں معروف نقاد و شاعر پروفیسر شہپر رسول، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور ڈاکٹر احمد محفوظ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ سبھارتی یونیورسٹی، میرٹھ کے وی سی پروفیسر منظور احمد، نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور نظامت فرقان سردھنوی نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر آصف علی نے ڈاکٹر یونس غازی کے شعری مجموعے 'خواب سمندر'، ڈاکٹر شاداب علیم نے نذیر میرٹھی کے مجموعۂ کلام 'کشتِ گل'، ڈاکٹر فرحت خاتون نے ڈاکٹر یونس غازی کی شخصیت پر پرمغز اور بسیط مقالے پیش کیے، جبکہ طالب زیدی، آفاق احمد خاں اور ذیشان احمد خاں

نے نذیر میرٹھی اور ڈاکٹر یونس غازی کی شخصیت اور فن پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر منظور احمد نے کہا کہ ڈاکٹر یونس غازی اور نذیر میرٹھی لائق مبارک باد ہیں کہ وہ اردو کے اس دورِ انحطاط میں بھی اس کی خدمت تن من دھن سے انجام دے رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2014

## واجدہ تبسم از کار وافکار

**نئی دھلی:** اردو کی بے باک افسانہ نگار اور منفرد لب ولہجہ کی شاعرہ واجدہ تبسم کو نظرانداز کیا گیا، ان کی ادبی خدمات اور ان کے کارناموں کا جس انداز سے اردو ادب کی تاریخ میں ذکر ہونا چاہیے تھا نہیں کیا گیا جس کا اعتراف کرتے ہوئے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر مسرور صغریٰ نے ایک ایسی کتاب مرتب کی ہے جس سے واجدہ تبسم کی زندگی، ان کے افسانوں اور ان کی شاعری پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، زبیر رضوی، پروفیسر علی احمد فاطمی جیسے کئی اہم ناقدین کے مقالات اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ واجدہ تبسم پر مبنی اس اہم ترین کتاب کا 18 اکتوبر کو غالب اکادمی میں بدست پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبہ فارسی کے استاد اور معروف شاعر پروفیسر عین الحسن، استاد شاعر احسن شکار پوری، اجرا عمل میں آیا۔ واجدہ تبسم پر شائع اس کتاب کے ساتھ ساتھ خود واجدہ تبسم کے افسانوں پر اچھی خاصی گفتگو بھی کی گئی اور مسرور صغریٰ کو اس بات کے لیے مبارکباد پیش کی گئی کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا جسے اردو دنیا نے تقریباً فراموش کر دیا تھا۔ یہ کتاب عرشیہ پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوکر منظر عام پر آئی ہے۔ اس موقعے پر معروف افسانہ نگار انجم عثمانی، معروف شاعر متین امروہوی، غالب اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی، احسن شکارپوری وغیرہ نے بھی کتاب پر اظہارِ خیال کیا۔ تقریب رسم اجرا کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ اکرام نے کہا کہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ نئی نسل کے قلم کار بڑے اچھے مضامین ومقالات لکھ رہے ہیں اور ان کی کتابیں بھی منظر عام پر آرہی ہیں۔ پروفیسر عین الحسن نے کہا کہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ نئی نسل سے ایک اور خاتون صاحبہ کتاب ہوگئی۔ واجدہ تبسم کا ذکر ہوگا اور ان پر کچھ لکھا جائے گا تو ان کے ساتھ ساتھ مسرور صغریٰ کا بھی ذکر ہوگا۔ انجم عثمانی نے کہا کہ واجدہ تبسم کی تحریر میں ایسا جادو ہوتا تھا کہ ہر کوئی اسے پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی جبکہ متین امروہوی نے کتاب اور مسرور صغریٰ پر منظوم تبصرہ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2014

## ریشم

**لکھنؤ:** واصف فاروقی کا اردو زبان وادب کی خدمات میں کافی اہم رول رہا ہے۔ انھوں نے صرف شاعری ہی نہیں کی ہے بلکہ اردو زبان کی تہذیبی روایتوں کو زندہ رکھنے میں بہت اہم کردار کیا ہے اور مشاعروں کی نظامت کے حوالے سے انھوں نے نئی نسل کے لیے نئی راہ نکالی ہے۔ ان خیالات کا اظہار لکھنؤ میں معاصر اردو شاعری میں ایک معتبر ومستند حوالے کی حیثیت رکھنے والے شاعر واصف فاروقی کے تازہ ترین شعری مجموعہ 'ریشم' کی رسم اجرا کی پروقار تقریب سے خطاب میں اپنے صدارتی کلمات میں عالمی شہرت یافتہ ادیب وشاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کیا۔ تقریب کی صدارت غلام علی شاہ (بہرائچ) نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر ظفریاب جیلانی نے واصف فاروقی سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی صاف گوئی، بیباکی، شرافت وسادگی، علمی وخاندانی سربلندی کی ستائش کی۔ ڈاکٹر محمد عالم سرحدی نے واصف فاروقی کو ایک انجینئر کے طور پر سرکاری خدمات انجام دینے کے باوجود خود کو ایماندار رکھ کر زندگی گزارنے پر مبارکباد دی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 اکتوبر 2014

## ساگر کنارے

**نئی دھلی:** کتابیں زندگی کی بہترین دوست ہوتی ہیں آج کی مصروف زندگی میں پڑھنا اور لکھنا دونوں انتہائی مشکل کام ہے۔ جب ہم اپنا بیشتر وقت انٹرنیٹ اور موبائل پر صرف کرتے ہیں، اس کے بعد بھی کتاب لکھنا انتہائی اہم بات ہے۔ یہ باتیں ہندی بھون میں سلیم پور کے ممبر اسمبلی اور دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد نے سلمیٰ سلطانہ کی کتاب 'ساگر کنارے' کے اجرا کے موقعے پر کہیں۔ اس موقعے پر سابق وزیر سابق ممبر پارلیمنٹ ڈی پی یادو نے بھی شرکت کی۔ چودھری متین احمد نے 'ساگر کنارے' کے حوالے سے مصنفہ سلمیٰ سلطانہ کو مبارکباد پیش کی۔ ڈی پی یادو نے کہا کہ رائٹر کے لیے ضروری ہے کہ کتابوں میں عام فہم اور آسان الفاظ کا استعمال کیا جائے تاکہ عوام کو سمجھنے میں مدد ملے اور اسے محترمہ سلمیٰ مزید بہتر طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ اس موقعے پر کتاب کی مصنفہ سلمیٰ سلطانہ نے بتایا کہ 'ساگر کنارے' پانچ کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے 'مہکتی کلیاں' اور 'کبھی مسکرا کر' بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 3 نومبر 2014

**وفیات**

## پروفیسر عبدالمعز کا مکہ میں انتقال

**حیدر آباد:** 7 اکتوبر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالمعز کا دوران ادائیگی حج مکہ معظمہ میں پیر 6 اکتوبر 2014 کی اولین ساعتوں میں انتقال ہوگیا۔ وہ 44 سال کے تھے۔ مرحوم کے چھوٹے بھائی جناب عبدالرحیم نے کہا کہ پروفیسر عبدالمعز، دین اور دنیا دونوں میں مساوی طور پر اپنی ذمہ داری تادم آخر نبھاتے رہے۔

ان کے قول اور فعل میں یکسانیت تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی والدہ کی دعاؤں میں شامل رہے۔ (مرحوم کی والدہ سفر حج میں ان کے ہمراہ تھیں۔) انھیں نیکیوں اور دعاؤں کے نتیجے میں پروفیسر عبدالمعز کو ایسی موت نصیب ہوئی جس کی تمنا ہر انسان کرتا ہے۔ تعزیتی جلسے میں پروفیسر محمد میاں، وائس چانسلر نے اپنے تاثرات میں کہا کہ ان کے وہم وگمان میں یہ بات نہیں تھی کہ پروفیسر معز اس قدر جلد ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ ان کا سانحۂ ارتحال یقیناً یونیورسٹی کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار نے اپنے تاثرات میں کہا کہ وہ بہت ہی محنتی انسان تھے اور ان کے کام کرنے کی صلاحیت قابل رشک تھی۔ اس موقع پر پروفیسر رحمت اللہ نے یونیورسٹی کی جانب سے قراردادِ تعزیت پیش کی۔ ڈاکٹر عبدالقدوس، انچارج صدر شعبۂ عربی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ان کی پروفیسر عبدالمعز سے ملاقاتیں گذشتہ 10 سال قدیم ہیں۔ پروفیسر معز میں اپنی بات منوانے کی بہترین صلاحیت موجود تھی۔ ڈاکٹر جاوید ندیم ندوی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی نے پروفیسر عبدالمعز کو پیش آئے سانحہ کی تفصیلات سے واقف کروایا اور کہا کہ حج کے دوسرے

دن رمی جمرات کے دوران وہ غش کھا کر گر گئے تھے۔ پروفیسر راشد نسیم ندوی، صدر شعبۂ عربی، ایفلو نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر معز نے کبھی تلخ لہجہ کا استعمال نہیں کیا۔ مرحوم خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ناظم اجلاس عابد عبدالواسع، اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر نے پروفیسر معز کے انتقال پر ڈاکٹر خالد مبشر الظفر، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ ترجمہ کے تحریر کردہ اشعار پڑھ کر سنائے۔ ڈاکٹر فہیم اختر ندوی، صدر شعبۂ اسلامیات نے دعائے مغفرت کی۔ تعزیتی اجلاس میں اساتذہ، طلبہ اور غیر تدریسی عملہ کے علاوہ پروفیسر مرحوم کے ایک اور بھائی جناب عبدالقوی بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، عابد عبدالواسع، اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر، مانو، 7 اکتوبر 2014

## کیپٹن عباس علی

**علی گڑھ:** معروف مجاہد آزادی کیپٹن عباس علی کا مختصر علالت کے بعد جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 95 سال کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور 2 بیٹیاں ہیں۔ ان کی تدفین پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ یونیورسٹی قلعہ کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر ریاستی وزیر رام جی لال سمن، گروپ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا اینڈ عالمی سہے اردو چینل سید فیصل علی کے علاوہ بڑی تعدادا میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبا، شہر کے معززین، سیاسی، سماجی و ملی رہنماؤں سمیت سیکڑوں سوگواروں نے شرکت کی۔ واضح رہے کہ عباس علی اترپردیش میں بلند شہر ضلع کے خورجہ میں 3 جنوری 1920 کو ایک مسلم راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم خورجہ میں ہوئی۔ 1939 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی فوج میں شامل ہوگئے۔ 1943 میں جاپانیوں نے جنگی قیدی بنایا۔ وہ جنرل موہن کے ذریعے بنائی گئی آزاد ہند فوج میں شامل ہوگئے اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کی قیادت میں ملک کی آزادی کے لیے چلائی جارہی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ 1945 میں جاپان کی شکست کے بعد برٹش فوج نے انھیں دوبارہ جنگی قیدی بنالیا۔

1946 میں ملتان کے قلعہ میں رکھا گیا اور کورٹ مارشل کے ساتھ ہی سزائے موت سنائی گئی لیکن ملک آزاد ہونے کے سبب رہا کردیے گئے۔ آزادی کے بعد 1948 میں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی قیادت میں سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوئے۔ کیپٹن عباس علی کے انتقال کی خبر جیسے ہی شہر کے عوام کو ملی ان میں غم کی لہر دوڑ گئی اور لوگ ان کی رہائش گاہ پر تعزیت کے لیے پہنچنے لگے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر سید احمد علی نے کیپٹن عباس علی کے انتقال پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے مستقبل قریب میں پر نہیں کیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 اکتوبر 2014

## سبط احمد قمر جائسی

**علی گڑھ:** ممتاز ادیب سبط احمد قمر جائسی کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنے بیٹے (جاوید رضوی) کے ساتھ علی گڑھ میں قیام پذیر تھے اور یہیں 19 اکتوبر کو انھوں نے آخری سانس لی۔ تدفین اتوار کو صبح جائس کے آبائی قبرستان میں ہوئی۔ سبط احمد قمر 1926 میں جائس کے علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی اور پھر وہ الہ آباد آگئے۔ یہاں جمنا مشن اور ایونگ کرسچین کالج میں تحصیل علم کے بعد 1949 میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ قمر جائسی طالب علمی کے زمانے میں ہی میدان ادب میں آگئے تھے۔ ابن صفی ان کے ہم جماعت اور ہم خیال دوست تھے۔ دونوں کی ادبی زندگی کا آغاز ماہنامہ 'نکہت' (الہ آباد) سے ہوا۔ ابن صفی کے ساتھ ساتھ قمر جائسی نے 'بھی نکہت' کے لیے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین اور افسانے لکھے۔ بعد میں انھوں نے جاسوسی ناول بھی لکھے، جو 'نرالا جاسوس' (الہ آباد) سے شائع ہوئے۔ نصف صدی سے زیادہ طویل تخلیقی سفر میں انھوں نے سیکڑوں افسانے، مزاحیہ، طنزیہ مضامین اور کئی ناول یادگار چھوڑے ہیں۔ طنز و مزاح کے امتزاج سے ان کی تحریروں میں دلکشی پیدا کردی۔ 'اجڑے نگر کا چراغ' ان کا اہم ناول ہے جو 2008 میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اکتوبر 2014

## مولانا اسماعیل کا انتقال

**دیوبند:** ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل و سابق مبلغ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد اسماعیل مدنی طویل علالت کے بعد تقریباً 83 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انتقال کی خبر ملتے ہی علمی و دینی حلقوں میں رنج والم کی لہر دوڑ گئی اور مرحوم کے دولت خانہ میں آخری دیدار کرنے والوں کا ہجوم لگ گیا۔ گوناگوں صفات کے حامل مرحوم دارالعلوم دیوبند کے سابق مبلغ تھے۔ انھوں نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد مدرسہ شاہی مرادآباد میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ نماز جنازہ احاطہ مولسری دارالعلوم دیوبند میں جمعیۃ علما ہند کے قومی صدر قاری عثمان منصور پوری نے ادا کرائی اور تدفین قاسمی قبرستان میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اکتوبر 2014

## خراج عقیدت

### اشفاق اللہ خاں

**سنبھل:** ہولی چائلڈ پبلک جونیئر اسکول شیام نگر چندوسی مین اشفاق اللہ خاں کا یوم پیدائش دھوم دھام سے منایا گیا جس میں مہمان خصوصی راجندر سنگھ راگھو اور کنوینر پنڈت سریش چندر شرما تھے۔ پروگرام کا آغاز عظیم مجاہد آزادی اشفاق اللہ خاں کے تصویر پر شمع روشن کرکے کیا گیا۔ پروگرام میں مہمانان خصوصی نے کہا کہ مجاہد آزادی اشفاق اللہ خاں کا آزادی تحریک میں اہم کردار رہا جنھوں نے انگریزوں سے لڑتے ہوئے پھانسی کے پھندے پر اپنی جان نچھاور کردی۔ وہیں پنڈت ستیہ دیو شرما نے کہا کہ انھوں نے غریبوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ اور ہندوستانیوں کو حب الوطنی کا پیغام دیا۔ پروگرام کے کنوینر سریش چندر شرما نے کہا کہ اشفاق اللہ خاں صرف مجاہد آزادی ہی نہیں بلکہ اردو زبان کے ایک عظیم شاعر بھی تھے۔ اس موقعے پر دیش کے دیگر شہیدوں کو بھی خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر جے شنکر دوبے نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 اکتوبر 2014

### ڈاکٹر حمیرہ

**پٹنہ:** شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی سابق استاد ڈاکٹر حمیرہ خاتون کے انتقال پر شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی میں ایک تعزیتی نشست منعقد کی گئی جس میں پروفیسر اسلم آزاد، ڈاکٹر اسرائیل رضا، ڈاکٹر جاوید حیات، ڈاکٹر اشرف جہاں، ڈاکٹر ایم عظیم اللہ، ڈاکٹر مسعود احمد کاظمی اور ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اپنے رنج وغم اور قلبی جذبات کا اظہار کیا۔ سابق صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پروفیسر اسلم آزاد نے بتایا کہ مورخہ 25 اکتوبر کو اچانک ڈاکٹر حمیرہ خاتون کا انتقال ہوگیا، وہ گزشتہ چند دنوں سے بستر علالت پر تھیں۔ ان کی تدفین پھلواری شریف قبرستان میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اسرائیل رضا، ڈاکٹر ثروت جہاں، ڈاکٹر ایم عظیم اللہ، ڈاکٹر جاوید حیات نے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 نومبر 2014

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

### ٹی وی نیوز پروڈکشن فن اور طریقۂ کار

مصنف: سمیع الرحمٰن
صفحات: 217
قیمت: 93 روپے

### کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن

مصنف: خورشید عالم
صفحات: 180
قیمت: 144 روپے

### دیوانِ بیدار

مرتب: پروفیسر نسیم احمد
صفحات: 256
قیمت: 122 روپے

### اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے

مصنف: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 500
قیمت: -/174 روپے

### اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 549
قیمت: -/235 روپے

### اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 349
قیمت: -/163 روپے

### عصری لغت

مصنف: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 749
قیمت: 240 روپے

### اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 170 روپے

### اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 162 روپے

### حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد

مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

### عربی ادب کی تاریخ (جلد سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 695
قیمت: -/178 روپے

### عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 372
قیمت: -/112 روپے

### انگریزی اصطلاحوں اور محاوروں کی جدید صحافتی فرہنگ

مصنف: سید راشد اشرف
صفحات: 493
قیمت: -/238 روپے

### جسم و جاں

مصنف: عبدالمعز شمس
صفحات: 354
قیمت: -/138 روپے

### جسم بے جان

مصنف: عبدالمعز شمس
صفحات: 198
قیمت: -/90 روپے

### فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو)
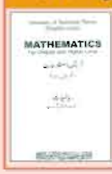
ادارہ
صفحات: 411
قیمت: -/120 روپے

### میر تقی میر

مصنف: نثار احمد فاروقی
صفحات: 191
قیمت: -/43 روپے

### زبان اور قواعد

مصنف: رشید حسن خاں
صفحات: 496
قیمت: -/166 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

**URDU DUNIYA Monthly, December-2014, Vol.16, Issue:12**
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/11/2014
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

# عالمی اردو کانفرنس کے مختلف مناظر

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000